PDF LIBRARY 0333-7412793
طلوعِ سحر ہے شامِ محبت
نایاب جیلانی

پیش لفظ

کرن ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا میرا ناول ''طلوع سحر ہے شام محبت'' ایک سچے واقعے پر مبنی ہے۔اس ناول کی تھیم ،اس کا پلاٹ عورت کی محبت ،وفا اور ایثار ہے۔عورت ان تین چیزوں سے تشکیل پاتی ہے۔وفا اور محبت اس کی فطرت میں شامل ہے۔مگر وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات اور احساسات میں تبدیلی آنا غیر فطری نہیں۔کبھی وقت کی بے رحم چال کا شکار عورت فاخرہ جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔کبھی دولت کی ہوس اور بہت کچھ پالینے کا شوق اور مادیت پرستی عورت کو دُرِمکنون بنا دیتی ہے۔کبھی محبت کی جستجو،محبت کی اندھی طلب میں یہی عورت امبرین کا روپ دھار لیتی ہے۔کبھی یہی عورت خلوص، پیار،ایثار،اخلاق اور محبتوں کا خزینہ سمیٹے عنوہ ہاشم فریدی کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔اور ایسی ہی عورت کو وقت ہمیشہ یادگار بنا دیتا ہے۔

میرا یہ ناول جذبوں اور احساسات کی ایک سچی داستان ہے۔اور میری یہ خواہش ہے کہ اس ناول کو محض چند کردار سمجھ کر نہ پڑھا جائے بلکہ محبت کی وہ شام جو زیان عبیث کے دل پر اتری تھی کہ ہر لفظ کو دل سے سمجھا جائے کیونکہ ''طلوع سحر ہے شامِ محبت'' کا لفظ لفظ دل سے نکلا ہے اور دل سے ہی لکھا ہے۔

قارئین کرام! آپ کی رائے کی منتظر رہوں گی۔اور آخر میں القریش پبلی کیشنز کی مشکور ہوں کہ میری اس کوشش کو آپ تک پہنچانے میں انہی کا تعاون شامل ہے۔

دعاؤں کی طالب

نایاب جیلانی

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت، تیری شہرت ہی سہی
قطع کیجئے نہ، تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی

پارک سے گھر کی طرف جاتے ہی دائیں طرف مڑتے یہ منحوس آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ اپنی سیاہ ہنڈا اسوک کے پاس کھڑا بڑے جاندار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے پل دو پل کے لئے نگاہ اٹھائی اور پھر جھکا لی۔ اب وہ اس کے بالکل برابر قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا تھا۔

''آج اس تیکھے، روشن اور نورانی چہرے پر اداسی کے بادل کیوں چھائے ہیں؟''

وہ بڑے ہمدردانہ انداز میں دریافت کر رہا تھا۔

عنوہ نے اپنے قدموں کی رفتار مزید تیز کر لی مگر اس سے آگے چلنا بے حد دشوار تھا۔ اس کا ایک ایک قدم بھاری تھا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے جناب کی؟ کہیں تو گاڑی میں ڈراپ کر آؤں؟'' عنوہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی مگر اس کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مسلسل مسکرا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بے حد ناگواری در آئی تھی مگر لبوں کا قفل نہیں ٹوٹا تھا۔

''خیر سے اس وقت کہاں سے آ رہی ہیں؟'' وہ برابر چلتے ہوئے ترچھی نگاہ سے اسے دیکھ بھی رہا تھا۔

''چلیں نہ بتائیں، ہم خود ہی اپنے ذرائع سے معلوم کر لیں گے۔ ویسے بھی نیک اور متقی لوگ، ہم جیسوں سے بولنا کہاں گوارا کرتے ہیں؟'' اس نے خود کو ایک نفیس گالی سے نوازا تھا۔ اس کے ہونٹ اب بھی مسکرا رہے تھے۔

''ہم تو بہت خلوص کے ساتھ دوست اور آئندہ زندگی کے ساتھی کی حفاظت و نگہبانی

کر رہے ہیں...... آپ جب گھر سے باہر نکلتی ہیں تو یقین مانیے، دل ہزار خدشوں کا شکار رہتا ہے۔ آپ کی تمام تر زیبائش، آراستگی، زینت اسی سادگی میں ہے جو ہم بے چاروں کو گھائل کر کے دیوانگی کی سرحدوں پر لا چکی ہے۔ یہ جو حسین سونے جیسا سنہرا جھیل سی گہری آنکھوں کا رنگ ہے اور ان جگر جگر کرتی نگاہوں سے پھوٹتی ڈائمنڈ کی چنگاریاں...... ہم ان چمک دار، پُر نور، روشن روشن آنکھوں کے سمندر میں گوڈے گوڈے ڈوب چکے ہیں۔''

''بکواس بند کرو۔'' عنوہ کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ ان آنکھوں کے حزن میں غصے کی شدت سے مزید اضافہ ہو گیا۔

''تھینکس گاڈ! ان شنگرفی لبوں کا قفل تو ٹوٹا ہے۔'' اس نے بے ساختہ آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب تو ہو چکا تھا۔

''تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟'' وہ بھینچی آواز میں چلائی۔

''بہت ہی عقل مند، دانا، سمجھ دار، دانش مند، مصمم ارادہ رکھنے والا۔'' اس نے مسکرا کر عنوہ کے چہرے کی طرف دیکھا جس کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔

''انتہائی کمینے، ذلیل، لفنگے اور بدمعاش ہو۔ تمہیں کیا پتہ، انسانیت کے معیار کیا ہیں، اخلاق کس کہانی کا نام ہے، کردار کسے کہتے ہیں۔ سرکش اور باغی انسان! تم جیسے نفس کے مطیع لوگوں سے بات کرنا بھی میں اپنی توہین سمجھتی ہوں۔''

وہ پختہ اور مضبوط لہجے میں بولی تھی مگر مقابل بھی تو ڈھیٹ ابنِ ڈھیٹ تھا۔ قدرے مسکرایا اور پھر بولنے لگا۔

''آپ بہت دل پسند ہیں۔ دل کو بھانے والی انمول ہستی ہیں۔ آپ کے لبوں سے نکلنے والے تیزاب میں ڈوبے الفاظ بھی جامِ شیریں کی طرح لگتے ہیں، فرحت بخش، طبیعت کو سرشار کرنے والے، ٹھنڈے میٹھے الفاظ۔ ہم تو آپ کی جھیل سی آنکھوں کی توصیف بیان کر رہے تھے مگر آپ تو غصہ کر گئی ہیں۔ چلیں اپنے الفاظ واپس لے لیتے ہیں، اب تو غصہ تھوک دیں۔ حالانکہ غصے میں آپ اور بھی حسین لگتی ہیں، بالکل آب ور کی طرح۔ کیا ہیرے کی چمک ہے۔ کیا آب و تاب ہے یا پھر آبگینے جیسی گویا نازک شیشہ، کانچ، آئینہ، الماس یا پھر...... اوں ہوں، یاد آیا، بالکل انگوری شراب جیسی۔ کیا ذائقہ ہے، مدہوش کر دینے والا۔'' اس کی سیاہ آنکھوں سے پھوٹتی روشنیاں عنوہ کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔

''انسان کے روپ میں پورے شیطان ہو، فرعون کا انجام تو کہیں پڑھا ہو گا؟'' عنوہ نے زہرخند لہجے میں کہا۔

''جی۔ نہ صرف فرعون بلکہ شداد اور قارون کے انجام سے بھی باخبر ہیں۔'' وہ سعادت مندی سے بولا تھا۔

''مگر اپنے انجام سے بے خبر ہو۔ گھٹیا، بدکردار اور جواری انسان۔'' عنوہ نے حد درجہ نفرت سے کہا۔

''میرا دل بہت وسیع ہے۔ آپ کچھ بھی کہہ لیں، ہم برا ہرگز نہیں منائیں گے بلکہ کسی ایوارڈ کی طرح آپ کی گالیاں اور کوسنے وصول کریں گے۔'' وہ دلکشی سے مسکرایا۔

''تمہارا نام زیان عبیث کی جگہ خبیث ہونا چاہئے تھا۔'' عنوہ نے تنفر سے کہا۔ وہ اپنے گھر کے گیٹ تک پہنچ چکی تھی۔

''میری نرمی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ، بہت کر لی من مانی۔ اب فیصلہ ہو جانا چاہئے آج تمہاری ممی سے یہی ڈسکس کرنے آیا تھا۔ اپنا مائنڈ میک اپ کر لو زوجہ محترمہ!'' اس کا انداز حد درجہ دل جلانے والا تھا۔ عنوہ کے تن بدن میں چنگاریاں پھوٹ پڑی تھیں۔

''اتنی خوش فہمی بھی اچھی نہیں۔ منہ کے بل گرو گے کسی دن۔''

''تمیز سے بات کیا کرو۔ مجھے اس طرح کے لہجوں کی عادت نہیں۔ نہ جانے کیوں برداشت کرتا ہوں۔'' اس نے اپنے گھنے، سیاہ، سلجھے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کہا اور مزید بولا۔

''تمہیں لاکھوں کی بھیڑ میں چنا ہے، پسند کیا ہے۔ محبت و پیار، چاہت سے سرفراز کیا ہے۔ رفاقتوں کا یقین دلایا ہے۔ توجہ کی حد کر دی ہے۔ تمام ضروری کام بھاڑ میں جھونک کر بڑی فرصت سے عشق فرمایا ہے۔ تم پر دل و جان سے فریفتہ ہوں۔ عاشق اور شیدائی ہوں۔ تمہارے تفاخر کے لئے تو اتنا ہی کافی ہونا چاہئے۔''

''لعنت بھیجتی ہوں میں ایسے عشق پر اور تمہارے جیسے عاشق پر۔'' وہ غصے سے پھنکارتی زوردار آواز میں گیٹ بند کر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی جبکہ زیان مسکراتا، گنگناتا پلٹ گیا تھا۔

* * *

جوں ہی اس نے آراستہ پیراستہ، سجے سجائے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا، نگاہیں سامنے مخملیں صوفے میں دھنسی ممی پر اٹھ گئیں۔ وہ خود سے بے گانہ، سیاہ ساڑھی میں

ملبوس آنکھیں موندے نہ جانے کیا کیا بول رہی تھیں۔ عنوہ کو اک پل کے لئے یوں محسوس ہوا تھا، گویا صدیوں کی مسافتوں کی تھکن آنکھوں میں اُتر آئی ہے۔ وہ نم پلکوں کو پونچھتی ممی کے پاؤں سینڈلوں سے آزاد کرنے لگی تھی۔ پھر نگاہ کرسٹل کی چمکیلی سطح والے ٹیبل پر رکھے مشروب کے خالی گلاسوں پر پڑی۔

ممی کے قریب رکھا گلاس خالی تھا جبکہ دوسرے گلاس میں تھوڑا سا مینگو جوس یقیناً وہ اس کی تسلی کے لئے بچا کر گیا تھا۔

ممی کو دیکھتے ہوئے اسے خود سے بھی شرم آنے لگی تھی۔ کیا تھا اگر ممی اس کے سامنے حواس برقرار رکھتیں۔ کیا ضرورت تھی، زیان کے سامنے اُم الخبائث کو منہ لگانے کی۔ مگر ممی کا بریک فاسٹ، لنچ یا ڈنر "ڈرنک" کے بغیر تو ادھورا ہوتا تھا۔ انہوں نے آج تک مہمانوں کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا۔

کارپٹ پر بکھرے ساڑھی کے پلو کو سمیٹتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے تھے۔

"کیا سوچتا ہوگا وہ ممی کے بارے میں۔" عنوہ نے ناک دبا کر گلاس اٹھائے اور ٹیبل کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے سوچا۔

"اونہہ...... جو مرضی سوچتا پھرے۔ خود بھی تو یہی کچھ کرتا ہے۔" وہ رنجیدگی سے زیر لب بڑبڑائی پھر الماری سے نفیس کمبل نکال کر ممی کے اوپر ڈالا اور تھکے تھکے قدم اٹھاتی اپنے روم کی طرف بڑھ گئی۔

صبح ڈائننگ روم میں ممی بڑے فریش موڈ میں بیٹھی اورنج جوس پی رہی تھیں۔ انہیں اپنی ڈائٹ کا بہت خیال رہتا تھا۔ اپنے حُسن اور صحت پر بھرپور توجہ دیتی تھیں، اسی لئے تو ان کا حسین سراپا سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا تھا۔ دلکش خدوخال، گورا رنگ، لانبے بال...... بلاشبہ وہ بہت حسین خاتون تھیں۔ انہیں حُسن کو سنوارنے کے طریقے بھی آتے تھے۔ عنوہ نے ایک حُسن کی دولت ہی ممی سے چرائی تھی۔

"گڈ مارننگ ممی!" دل تو نہیں چاہ رہا تھا انہیں مخاطب کرنے کو، مگر وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔ کیا کرتی۔ ساری رات جاگنے اور مسلسل سوچنے کی وجہ سے آنکھیں الگ دُکھ رہی تھیں۔

"آں...... ہاں۔" وہ چونکیں اور حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھیں بہت سرخ تھیں اور سرد بھی۔ اس نے آج تک ممی کو مطمئن نہیں دیکھا تھا۔

"لیٹ اٹھی ہو؟"

"ہوں...... رات کو نیند نہیں آئی۔" وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"تو نیند کا ٹانک لے لینا تھا۔ سارے غم، فکریں بھول جاتی ہیں۔" وہ کس چیز کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ عنوہ نے اِک دکھ کی لہر من میں اُترتی محسوس کی۔

"ممی! میں آپ کی فرینڈ یا کولیگ تو نہیں، بیٹی ہوں۔" اس نے آزردگی سے کہا تھا۔ کیسی قابل نفرت چیز کی آفر کر رہی تھیں وہ اسے۔

"ہاں تو پھر۔" امبرین نے بھنویں اچکائیں۔

"میری زندگی کی سب سے بڑی بھول، ایسی غلطی جس کی تلافی ممکن نہیں۔" انہوں نے تنفر سے کہا۔ پنک اسٹائلش ساڑھی میں بغیر میک اپ اور کھلے بالوں کے ساتھ وہ بے حد شاندار لگ رہی تھیں۔ اگر اس حسین چہرے پر محبت کا کوئی رنگ ہوتا تو یقیناً یہ دنیا کا حسین ترین چہرہ ہوتا۔

"کل زیان آیا تھا۔" عنوہ جس موضوع سے بچنا چاہتی تھی، ممی اس پر ہی بحث و مباحثے کے لئے تیار تھیں۔ اس نے وجہ نہیں پوچھی تھی، نہ ہی پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر اب تک کوئی بھی کام اس کی مرضی کے مطابق کہاں ہوا تھا۔ حتیٰ کہ نکاح بھی۔

"شادی کی ڈیٹ طے کرنے کے بارے میں بات کر رہا تھا۔"

"پھر آپ نے کیا کہا ہے؟" اس نے ڈوبتے دل اور کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

"جنوری کے اینڈ تک ارادہ ہے میرا۔ ویسے بھی نکاح کو ایک سال ہو گیا ہے۔ تم ایجوکیشن کمپلیٹ کر چکی ہو۔ فارن سے شارٹ کورسز کی ڈگریز بھی ہیں۔ اتنی تعلیم ہی کافی ہے۔ تمہیں ویسے بھی میں نے بزنس سے الگ رکھا ہے۔ دراز میں چیک بک رکھی ہے، جتنے مرضی پیسے لو اور دل کھول کر شاپنگ کرو۔ یہ میری طرف سے تمہارے لئے آخری گفٹ ہے۔ ویسے بھی تم ایک نہایت امیر، خوشحال اور دولت مند شخص کی مسز بنو گی۔ اس کے بینک ڈالر، پونڈز سے بھرے پڑے ہیں۔ یورپ اور ایشین ممالک میں موجودہ بینکوں میں اس کے اتنے اکاؤنٹس ہیں کہ تم انگلیوں پر نہیں گن سکتیں۔ میں نے تمہارے لئے بہت اچھا انتخاب کیا ہے۔" وہ بڑے تفاخر کے عالم میں اسے نہ جانے کیا کیا جتا رہی تھیں۔

"ایک شرابی، جواری شخص کو میرا عمر بھر کا ساتھی بنا کر آپ نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے ممی!"

"پارسائی، اچھائی اور نیکی کی باتیں ہماری سوسائٹی کی لڑکیوں کو سوٹ نہیں کرتیں۔"
انہوں نے استہزائیہ کہا اور بالوں میں اُنگلیاں چلانے لگیں۔

"میرا باپ دنیا کا بدقسمت انسان تھا، جس کی آپ بیوی بنیں۔" اس نے آج تک کبھی ممی کے سامنے اپنے باپ کا ذکر نہیں کیا تھا، نہ جانے کیسے زبان سے یہ چند الفاظ پھسل گئے تھے۔ امبرین نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا اور غصے سے پھنکاریں۔

"اپنے باپ کی حقیقت سے واقف نہیں ہو، بہت عیاش اور فلرٹی انسان تھا۔ میری شادی کے بعد اس نے تین شادیاں کی تھیں۔ اگر زندہ رہتا تو اور نہ جانے کتنوں کے نصیب پھوٹتے۔ بہرحال، یہ بحث طویل ہے۔ تم اپنی تیاری پکڑو۔ میں انہی دنوں میں تم سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔" وہ نہایت سرد انداز میں بولی تھیں۔ عنوہ کی آنکھیں یک دم ہی نمکین پانیوں سے لبریز ہوگئیں۔

'کیا ساری دنیا کی مائیں ایسی ہوتی ہیں؟' اس نے تلخی سے سوچا۔

"ممی.......!" امبرین کو اٹھتا دیکھ کر وہ سرعت سے بولی تھی۔

"کیا بات ہے؟" انہوں نے سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جمادیں۔

"میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"وجہ؟" امبرین نے ناگواری سے پوچھا۔

"مجھے زیان اچھا نہیں لگتا۔" اس نے نگاہیں جھکا کر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔

"کیوں اچھا نہیں لگتا؟"

'اس لئے کہ اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ ممی! وہ بہت آوارہ مزاج ہے۔ سب کے سامنے بیٹھ کر شراب پیتا ہے، جوا کھیلتا ہے، آوارہ عورتوں سے ریلیشن ہیں اس کے، مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" عنوہ نے چپکے سے نگاہ اٹھا کر امبرین کے پُرسوچ چہرے کی طرف دیکھا۔

"او کے۔ تو پھر ایسا کرو، کسی کلرک سے شادی کرلو۔ یا پھر جمعدار ٹھیک رہے گا۔ نہ تو وہ اعلیٰ برانڈ کی شراب پیئے گا، نہ جواء کھیلے گا، نہ عورتوں سے دوستیاں رکھے گا۔ پیٹ کے چکر میں اُلجھا انسان کہاں ایسی عیاشیاں افورڈ کرسکتا ہے؟ تم آرام سے اس کے ڈربے نما مکان میں رہنا، بچے پیدا کرنا اور مہنگائی کے رونے رونا....... جب کھانے کو ملا نہ پہننے کو ملا تو پھر دیکھوں گی، کیا کرتی ہو تم۔ یہ پرہیزگاری، بھلائی، نیکی کے قصے سب بھول جائیں گے۔ بیٹھ کر اس کی شرافت کو چاٹتی رہنا۔" امبرین نے تنک کر کہا تو

عنوہ اُلجھ سی گئی۔

"ممی! مجھے نہیں پتہ نیکی اور بھلائی کیا ہے، پرہیزگاری اور پارسائی کسے کہتے ہیں۔ مجھے بس اتنی سمجھ بوجھ ہے کہ جو باتیں، جو حرکتیں زیان کرتا ہے، وہ سب اخلاقی حدود کے دائرے میں شمار نہیں ہوتیں۔"

"تم نے کہیں کسی تبلیغی کلاس کو تو نہیں جوائن کرلیا؟" امبرین نے مشکوک انداز میں اسے گھورا۔

"یہ کون سی کلاس ہے اور کس قسم کی ہے؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔ امبرین نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اِک تلخ مسکان اس کی طرف اچھال کر وہ باہر نکل گئی تھیں۔ عنوہ ابھی تک گوگو کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔ معاً زینو بابا کی آواز سن کر پلٹی۔ وہ اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کررہے تھے۔ عنوہ بے دھیانی میں بیٹھ گئی۔ زینو بابا کہہ رہے تھے۔

"بڑے بزرگ لوگوں کی جماعت ہوتی ہے۔ بڑے عقل مند، دانا لوگ ہوتے ہیں۔ بانصیب، خوش نصیب لوگ جنہیں اللہ منتخب کرلیتا ہے۔ چن لیتا ہے۔"

"وہ کون لوگ ہوتے ہیں اور کہاں ہوتے ہیں؟ کیا آپ نے دیکھے ہیں ایسے لوگ؟" عنوہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ اصفیاء ہوتے ہیں۔ یعنی کہ بہت ہی برگزیدہ، پاک باطن۔ ان میں اصل پن ہوتا ہے۔ بہت خالص ہوتے ہیں۔ ان میں ملاوٹ نہیں ہوتی۔" زینو بابا بہت سوچ سوچ کر کھوئے کھوئے لہجے میں بول رہے تھے۔

"اتنے خالص لوگ آج کے دور میں کہاں؟" اس کی نگاہوں کے سامنے زیان کا چہرہ تھا۔ کھڑے نقوش والا پتھریلا چہرہ۔ وہ بہت وجیہہ وشکیل تھا۔ مگر عنوہ کو اس میں بالکل خوب صورتی نظر نہیں آتی تھی۔

"انہی لوگوں سے تو یہ دنیا قائم ودائم ہے۔ لوگوں کے ہجوم میں رہتے ہیں، مگر اپنی ذات میں تنہا۔"

"زینو بابا! آپ ملے ہیں کبھی کسی ایسی ہستی سے؟" اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرایا تھا۔

"ہاں جی۔" وہ اسی کھوئے کھوئے لہجے میں بولے تھے۔

"کیا نورانی چہرہ ہے۔ اتنا شفیق، اس قدر زرنہت، فقر کو دوست رکھنے والے، بہت

ہی عالم فاضل۔ بڑی اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ جنت کی باتیں، دوزخ کی باتیں، قبر کی باتیں...... جزا اور سزا کی باتیں۔ نیکی اور بدی کی، گناہ اور ثواب کی، ذلت اور عزت کی، نفرت اور محبت کی۔"

"کون سے شہر میں رہتے ہیں؟" عنوہ کو دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بھلا کہاں ایسی باتیں سنی تھیں۔

"شہر کہاں...... وہ تو بہت دُور ایک چھوٹی سی بستی ہے، جہاں ان کا بسیرا ہے۔ کچا مکان اور تنہائی ان کی ساتھی ہے۔" زینو بابا بڑے احترام سے ان کا نام لے رہے تھے۔

"میں بھی ملوں گی ان سے۔" عنوہ نے سنجیدگی سے کہا تھا اور زینو بابا پُرجوش سے ہو کر سر ہلانے لگے تھے۔

"لے چلوں گا آپ کو، عنوہ بی بی! اسی بہانے میری بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ان کا گھر اگرچہ خالی ہے عنوہ بی بی! مگر سکون کی دولت سے بھرا ہوا۔ جی چاہتا ہے، ان کی چوکھٹ پر ہی پڑا رہوں۔ مگر پیارے پوتے کی خاطر کام کرنے پر مجبور ہوں۔" زینو بابا بھرائی آواز میں کہہ رہے تھے۔

❁

مسٹر ربانی کے ہاں پارٹی تھی۔ امبرین کے اصرار پر عنوہ بھی تیار ہو گئی تھی۔ ممی نے کبھی انکار سنا تھا نہ اس نے کبھی نہ کی تھی۔

پارٹی کی ارینج منٹ کافی وسیع پیمانے پر تھی۔ اسی حساب سے مہمانوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ ممی ہمیشہ کی طرح اسے ساتھ لا کر بھول چکی تھیں۔ یہ تو بچپن کا دکھ تھا۔ ممی اسے کہیں بھی ساتھ لے کر جاتیں اور پھر اس کے وجود سے یکسر بے نیاز ہو جاتی تھیں۔ یوں گویا وہ کہیں بھی نہ ہو۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا تھا کہ ممی اپنے فرینڈز سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے ناگواری محسوس کرتی ہیں۔

اسی طرح کی ایک پارٹی میں ممی نے اس کا تعارف زیان سے کروایا تھا۔ شاید وہ زیان سے عنوہ کو ملوانا نہیں چاہتی تھیں مگر زیان خود ہی اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ مجبوراً ممی کو تعارف کروانا پڑا۔ عنوہ کو جب ممی نے بتایا کہ یہ ان کا نیا فرینڈ اور بزنس پارٹنر بھی ہے تو وہ بے حد حیران ہوئی تھی۔ ان دنوں بزنس میں مسلسل خسارے کا سامنا تھا۔ فیکٹری کی تمام مشینیں بدلنے والی تھیں جس کے لئے کروڑوں روپیہ درکار تھا۔ ملازمین کی تنخواہیں نہیں دی تھیں جس کی وجہ سے تمام ورکرز ہڑتال کے بارے میں آپس

میں مشورے کر رہے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں کوئی احمق ہی تھا، جو پارٹنر شپ کے ایگری منٹ پر سائن کر چکا تھا۔

ممی کی تمام دوستیاں اخلاقی حدود سے تجاوز کر چکی تھیں۔ نہ جانے یہ کس قسم کا دوست تھا۔ ممی چاہے کتنی ہی اسمارٹ اور ینگ لگیں مگر تھیں تو کافی ایجڈ۔ جبکہ وہ ابھی تینتیس، چونتیس کے لگ بھگ ہوگا۔ یہ ممی کی زندگی کا انتہائی شرم ناک پہلو تھا۔ کبھی کبھی اسے اپنے ماحول سے سخت کراہت محسوس ہوتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں جنگلوں میں بسیرا کر لے۔

ممی کہتی تھیں کہ وہ محض "منفرد" نظر آنے کے چکر میں ان کے ماحول سے الگ تھلگ رہتی ہے۔ اسے نیک پروین بننے کا شوق ہے تاکہ لوگ اسے تعریفوں کے ایوارڈ دیں۔ جبکہ عنوہ حیران ہو کر سوچتی تھی کہ ممی ایسا کیوں کہتی ہیں۔ اسے تو انفرادیت کے مفہوم کا بھی پتہ نہیں تھا۔ نیکی کیا ہوتی ہے؟ کم از کم اس نے اپنے اردگرد نیکی کو کسی شکل میں نہیں دیکھا تھا۔ ہاں اسے اچھائی اور برائی میں فرق کرنا ضرور آتا تھا۔ اتنی تو وہ باشعور تھی کہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکتی۔

اسے ڈرنک کرنے والے، اسموکنگ کرنے والے مرد زہر لگتے تھے، کجا کہ عورتیں۔ وہ جانتی تھی کہ سگریٹ پینے والی عورت کو معاشرہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ ڈال ڈال پر بیٹھنے والی عورت کو مرد کی نگاہ میں عزت نہیں ملتی۔ ابھی جو یہ سوٹڈ بوٹڈ حضرات ان چمکتی دمکتی عورتوں پر ریجھ رہے تھے، پیٹھ پیچھے کیسے کیسے گندے الفاظ میں ان کا ذکر کرتے تھے۔ گالیاں بکتے تھے۔ ان حسین خوشبوؤں میں بسی عورتوں سے نفرت کرتے تھے۔ ایسی عورتیں صرف ٹشو پیپر جتنی حیثیت رکھتی تھیں۔

ان کی ایک ایک مسکراہٹ پر فدا ہونے والے محفلوں سے دور انہیں "گندی گالی" سمجھتے تھے۔ کیا زندگی سے اسی طرح ہی خوشی کشید کی جاتی ہے؟ ہلا گلا، تھرل، ہنگامہ...... یہ فضول سی پارٹیاں، یہ رنگ برنگی، مردوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی، دل لبھاتی عورتیں۔ چند لمحوں کی عارضی خوشی، وقتی طور پر لمحاتی لذت، ان آسائشات کے عادی لوگوں پر کبھی برا وقت آ گیا تو کیا حال ہوگا ان لوگوں کا؟

"یہ مراقبے کی کون سی شکل ہے؟ محفل میں بیٹھ کر اس قدر سوچ و بچار، غور و فکر۔" اسے اپنے قریب ہی زیان کی آواز سنائی دی تھی۔

"اتنا کیا سوچتی ہو اور کیسے سوچتی ہو؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

''کم از کم تمہیں نہیں سوچتی۔'' عنوہ نے تنک کر کہا تو زیان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ہم اتنے خوش نصیب کہاں کہ آپ کی سوچوں پر قابض ہو جائیں۔'' وہ مصنوعی رنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

''میرا بھیجہ کھانے کی ضرورت نہیں۔ ایک ہزار ایک لڑکیاں موجود ہیں، کسی سے بھی شوق کے ساتھ کلام کر سکتے ہیں۔ میں قطعاً مائنڈ نہیں کروں گی۔'' عنوہ ناگواری سے بولی۔

''میرا ٹیسٹ اتنا بھی برا نہیں کہ لوگوں کے بھیجے کھاتا پھروں۔ اور کسی سے گفتگو کرنے کے لئے مجھے آپ کی اجازت درکار نہیں ہے۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں، کبھی کسی کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ میں اپنے فیصلے خود کرتا ہوں۔'' زیان نے لاپروائی سے کہا۔

''آپ کا یہ غرور توڑ نہ دیا تو نام بدل دینا۔ بڑی دیکھی ہیں چنگیز خان کی مؤنث خواتین۔ یہ اکڑ، یہ نخرہ اور خود پسندی۔ بھلا غرور ہے کس بات پر، غرور کرنے کے لئے کسی چیز، کسی خوبی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اونہہ تیزی سے گرتا ہوا کاروبار، ایک تباہ شدہ ساکھ یا پھر یہ عیاش ماں...... مائی فٹ، لعنت بھیجتا ہوں میں ایسی بڑھاپے کی طرف مائل عورتوں پر، جنہیں بڑھاپا کسی گالی کی طرح محسوس ہوتا ہے۔'' وہ تنفر سے سوچ رہا تھا۔

ڈنر کے بعد اس نے ممی کو چلنے کے لئے کہا مگر امبرین کا ابھی موڈ نہیں تھا۔ وہ اسے ڈرائیور کے ساتھ جانے کے لئے کہہ رہی تھیں۔

''ممی! میں ڈرائیور کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ویسے بھی موسم کے تیور اچھے نہیں۔'' اس نے سیاہ گلاس ونڈو پر ٹپکتے بارش کے قطروں کو دیکھ کر کہا۔ باہر تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ ''تم کوئی ننھی بچی تو نہیں ایڈیٹ۔'' امبرین نے دانت پیسے۔

''آپ مجھے لے کر کیوں آئی تھیں؟'' عنوہ نے ناراضی سے کہا تھا۔

''تو نہ آتیں۔ اتنے اچھے موڈ کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔'' امبرین غصے سے بھنائیں۔

''جانا ہے تو اللہ بخش کے ساتھ چلی جاؤ۔ ورنہ اچھے لوگوں کے ساتھ انجوائے کرو۔'' امبرین نے مردوں اور عورتوں کے جھرمٹ میں کھڑے زیان کی طرف دیکھ کر کہا۔ جس محفل میں زیان ہوگا، پھر نگاہ کسی اور طرف اُٹھتی ہی کہاں تھی۔ بہت سے لوگ، بہت سی باتیں، کچھ خوشامدی لہجے، کچھ چاپلوسانہ انداز میں اپنی طرف متوجہ کرتی

خواتین۔ بعض حسد و رشک کے جذبات لئے بس دور کھڑے دیکھ رہے تھے۔

اس کے بخت کا ستارہ بہت بلند تھا۔ بزنس کی دنیا کا بے تاج بادشاہ۔ اس وقت تمام سرمایہ دار حضرات اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ یہاں دولت کی عزت تھی، پیسے کی قدر تھی۔ ڈالرز کے پجاری...... پونڈز گننے والے، روپے کے لحاظ سے بہت بلندیوں پر کھڑے لوگ، اخلاق کے معاملے میں پستیوں میں اُترے لوگ۔

''میں جا رہا ہوں۔ تمہیں بھی ڈراپ کر دوں گا۔'' نہ جانے کب وہ اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا۔ عنوہ چونک کر غائب دماغی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''آؤ بھی......'' زیان جھنجلایا۔

''کہاں؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''جہنم میں۔'' اس نے گم صم کھڑی عنوہ کا بازو پکڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ عنوہ اس کے ساتھ تقریباً گھسٹتی جا رہی تھی۔ پارکنگ میں آ کر زیان نے اس کا بازو چھوڑ دیا تھا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' عنوہ نے ناگواری سے کہا۔

''بیٹھو۔'' زیان نے فرنٹ ڈور کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں خود چلی جاؤں گی۔ ہمارا ڈرائیور ادھر ہی ہوگا۔'' عنوہ نے قطار میں کھڑی گاڑیوں میں سے اپنی کرولا کو تلاش کرنا چاہا۔

''آپ کا ڈرائیور نہیں ہے۔'' زیان اب اطمینان سے گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔

''کیوں نہیں، ادھر ہی ہوگا۔ ممی کی پرمیشن کے بغیر وہ کہاں جا سکتا ہے؟'' عنوہ مسلسل اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑا رہی تھی۔

''وہ جا چکا ہے۔'' زیان نے گاڑی کو احتیاط سے بیک کیا، پھر اس کے قریب آ کر بولا۔ ''میں نے اسے اجازت دی ہے۔ تاکہ وہ جا کر آرام کرے اور مجھے دعائیں دے۔''

''کیا مطلب ہے؟'' عنوہ پہلے حیران ہوئی، پھر اسے ایک دم ہی غصہ آ گیا۔

''تمہیں کس نے اتھارٹی دی کہ ہمارے ملازموں پر حکم چلاؤ؟ ممی، جان نکال دیں گی، اللہ بخش کی۔''

''اتھارٹی کی کیا بات کر رہی ہیں محترمہ! میں تو کھڑے کھڑے آپ کے تمام نوکروں کو گھر سے نکال سکتا ہوں، مگر میں ایسا کروں گا نہیں۔ کیا ضرورت ہے مظلوم

لوگوں کی بد دعائیں لینے کی۔" اس کا انداز شاہانہ تھا۔

"میں اللہ بخش کو بھیجنے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" عنوہ نے چبھتے لہجے میں کہا تھا۔

زیان مسکرایا اور بولا۔

"کھڑے کھڑے تھک جاؤ گی عنوہ ڈیئر! بیٹھ جاؤ۔ تفصیلاً بات کرتے ہیں۔ اللہ بخش کی پرسنالٹی پر، اس کے بیوی بچوں پر، اس کے گھریلو مسائل پر۔ اوکے!"

"مجھے تمہارے ساتھ کہیں نہیں جانا۔" عنوہ نے تنک کر کہا۔

"عنوہ ڈیئر! آرام سے بیٹھ جائیں۔ ضد نہ کریں۔ ابھی پلاسٹر آف پیرس کی چھت کے نیچے کھڑی ہیں، باہر دیکھیں کیسی طوفانی بارش برس رہی ہے۔ تیز ہواؤں میں گھس رہی ہے۔ یہ نخرے بس یہیں تک ہیں۔ ذرا باہر تشریف لے کر تو آئیں۔ اگر نہیں جانا چاہتیں تو واپس چلی جائیں۔ آپ کی ممی تو آج گھر نہیں جائیں گی۔ ان کے ارادے تو یہیں رات بتانے کے ہیں۔ سیٹھ جہانگیر انہیں جانے بھی نہیں دیں گے...... تو پھر جلدی سے فیصلہ کر لیں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ بے حد استہزائیہ انداز میں اسے کیا کچھ نہیں جتا گیا تھا۔ عنوہ کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ ندامت کے قطرے صبیح پیشانی پر چمک اُٹھے تھے۔ اس کی ماں اس کے لئے قابل فخر نہیں بلکہ باعث شرمندگی تھی۔ اسے اپنی بدقسمتی پر رونا آ گیا۔ وہ بغیر حجت کے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی کہ واپس اس محفل میں جانا انتہائی تکلیف دہ امر تھا۔

"مجھے فرمانبردار عورتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔" زیان مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ پھر اچانک کچھ یاد آیا تو بغور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ زیان کے اس طرح دیکھنے پر قدرے نروس سی ہو گئی تھی۔

"تم نے شاپنگ کرنی ہو گی شادی کی؟"

"نہیں، کر لی ہے۔" عنوہ نے جھوٹ کا سہارا لیا مبادا وہ اسے کہیں شاپنگ وغیرہ کرانے نہ لے جائے۔

"آں...... ہاں، میرا ارادہ تمہیں ساتھ لے کر مارکیٹوں اور بوتیکس میں لور لور پھرنے کا نہیں۔" وہ گویا اس کے چہرے کے تمام تاثرات پڑھ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکان تھی۔ اسے تو یہ مسکان طنزیہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ اس نے تھوڑا سا اس کی طرف جھک کر کوٹ کی جیب میں سے چیک بک نکالی۔

"یہ لو، اپنی مرضی اور پسند کی شاپنگ کر لینا۔ میرا اس معاملے میں تجربہ صفر ہے۔

اور ویسے بھی مجھے عورتوں کو بازاروں میں لے کر گھومنا پسند نہیں۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" عنوہ نے چیک پکڑنے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

"تمہیں نہ سہی، تمہاری ممی کو تو ہے۔ وہ تو ایک سو بیس مرتبہ مجھے جتا چکی ہیں کہ میں تمہیں شاپنگ کے لئے بھاری بھرکم چیک نہیں دے رہا۔" وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ جبکہ عنوہ مارے شرمندگی کے سر نہیں اٹھا پا رہی تھی۔

'ممی! آپ مجھے ذلتوں کے گڑھے میں اُتار کر رہیں گی۔'

اپنی کوٹھی کے گیٹ کو دیکھ کر اس نے سکون سے بھرا سانس لیا۔ وہ جلد از جلد زیان کی آنکھوں سے اوجھل ہونا چاہتی تھی۔

"زینو بابا! آج لنچ میں کیا بنے گا........؟" وہ فریج سے ایپل جوس نکالتے ہوئے بولی تھی۔

"جو آپ پسند کریں بٹیا! ویسے چکن نکال رکھا ہے، کڑاہی بنانے کا ارادہ تھا۔ بڑی بیگم تو کھانا نہیں کھائیں گی۔ بس آپ ہیں اور نوکر وغیرہ۔" زینو بابا نے تفصیلاً جواب دیا تھا۔ اسی پل اس کی عزیز از جان فرینڈ حنا چیختی چلاتی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ عنوہ تو مارے خوشی کے ساکت رہ گئی تھی۔ حنا خود ہی بے ساختہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

"کیسا رہا لندن کا ٹور؟" عنوہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کچھ پل کے لئے تمام یاسیت اُڑن چھو ہو گئی تھی۔

"فرسٹ کلاس۔ اس سفر میں کچھ اچھے اچھے لوگ ملے ہیں۔ کیا کھڑے کھڑے سب پوچھ لو گی؟" حنا اپنے مخصوص چنچل انداز میں کہہ رہی تھی۔

"ہاں، چلو میرے بیڈ روم میں۔" عنوہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ حنا اس کے کمرے میں آ کر اردگرد کا جائزہ لینے لگی، پھر دیوار پر بڑی سی تصویر دیکھ کر چلا اٹھی۔

"ارے کیا شاندار بندہ ڈھونڈا ہے........کیا غضب کی پرسنالٹی ہے۔ بالکل شہزادہ لگتا ہے۔"

"ممی کی چوائس ہے۔" عنوہ سر جھکا کر بولی تھی۔

"ممی کی چوائس بہت اعلیٰ ہے۔ کاش ہماری بھی تمہاری طرح کی ایک عدد ممی ہوتیں۔" حنا کھلکھلائی تو عنوہ نے بے ساختہ اللہ نہ کرے کہا تھا۔

"انکل کی طبیعت ٹھیک ہے؟" عنوہ نے موضوع بدلا۔

"ہاں۔ اللہ کا شکر ہے۔ اب تو بالکل ٹھیک ہے، ماشاءاللہ سے۔" وہ اپنے ابو کے ساتھ لندن گئی تھی، چیک اپ کے سلسلے میں۔

"تم بتاؤ، شادی کا کیا ارادہ ہے؟ کب تک ہو گی؟ میں اپنی تیاری شیاری کر رکھوں۔" حنا اپنے ملبوسات کے بارے میں سوچتے ہوئے بولی۔

"اونہہ........شادی۔" عنوہ نے تلخی سے سر جھٹکا۔

"کیا مسئلہ ہے عنوہ! کیا تم خوش نہیں ہو؟" حنا بغور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ہماری خوشی سے کسی کو کیا مطلب........؟" اس کا انداز ہنوز وہی تھا۔ بے زار بے زار سا۔

"آنٹی نے تمہاری رائے جانے بغیر نکاح کر دیا تھا؟" حنا اُلجھ سی گئی تھی۔ "اگر تم زیان بھائی کو ناپسند کرتی ہو تو پھر تمہیں اسٹینڈ لینا چاہئے تھا۔"

"میری پسند ناپسند کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"کیوں اہمیت نہیں؟ تم انکار کر دیتیں۔" حنا نے ناراضگی سے کہا۔ "یہ پوری زندگی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر دل رضامند نہ ہو تو پھر ایسی شادی کا فائدہ؟"

"یہ بات تم ممی کو نہیں سمجھا سکتیں۔ وہ اپنے فیصلوں میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتیں۔" عنوہ نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"تم کسی نہیں، ان کی بیٹی ہو۔"

"اونہہ، بیٹی۔ انہوں نے کبھی ایسے رشتوں کو اہمیت نہیں دی۔ تم ممی کی نیچر کو جانتی ہو۔" اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی تھی۔

"مگر زیان بھائی کو ناپسند کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ بظاہر تو شاندار لگتے ہیں۔" حنا کی اُلجھن دُور نہیں ہوئی تھی۔

"اس میں کوئی خوبی نہیں، صرف خامیاں ہی خامیاں ہیں۔ جیسی میری ممی ہیں، ویسے ہی ان کے جاننے والے۔ جو برائیاں میری ماں میں بدرجہ اُتم موجود ہیں، ویسی ہی اخلاقی برائیاں زیان میں پائی جاتی ہیں۔ وہ مرد ہے، اس لئے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ ممی عورت ہیں، اسی لئے معتوب ٹھہرائی جاتی ہیں۔ پتہ ہے حنا! ایک بات تو زندگی کے تلخ ترین تجربے سے معلوم ہو گئی کہ عورت اپنا عورت پن کھو کر دو کوڑی کی رہ جاتی ہے۔" اسے زیان کا تحقیرانہ لہجہ یاد آیا تو نہ جانے کیوں آنکھیں نم سی ہو گئی تھیں۔ وہ ممی کے بارے میں کس قدر تنفر سے گفتگو کر رہا تھا۔ اسے زیان کے الفاظ سوچ کر ہی شرم آنے لگی تھی۔

"تمہاری نیچر بہت مختلف ہے عنوہ! کبھی کبھی تو مجھے تم اس ماحول کا حصہ نہیں لگتیں۔ اس منظر میں قطعاً ان فٹ۔" حنا گویا تمام بات سمجھ چکی تھی۔ ان کی دوستی یونیورسٹی کے دنوں سے تھی۔ حنا کو یہ خاموش خاموش، بے حد سنجیدہ سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ جس کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں اس قدر اُداسی کے رنگ تھے۔ بہت ہی منفرد اور سلجھی سوچوں نے اس کی شخصیت کو مزید نکھار دیا تھا۔

"تمہیں نہیں لگتا حنا! کہ میں کبھی بھی کامیاب زندگی نہیں گزار سکتی؟"

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟" حنا نے نرمی سے کہا۔ "تم ایک شاداں و فرحاں، خوش و خرم اور پُرمسرت زندگی گزارو گی۔"

"تمہیں پتہ ہے کہ ایک مضبوط بیک گراؤنڈ عورت کے لئے کتنا بڑا تحفظ ہے؟" وہ پُرسوچ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"تمہارا خاندانی پس منظر کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔"

"یہی تو اصل دکھ ہے۔" عنوہ آزردگی سے مسکرائی۔ "جن لوگوں سے ساری زندگی کا تعلق قائم ہونا ہو، وہ آپکی زندگی کے کمزور ترین پہلوؤں کو جانتے ہوں تو زندگی ناسور بن جاتی ہے۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے کہ میری پوری زندگی کھلی کتاب کے مانند ہے۔ میرا کردار سب کے سامنے ہے۔ میں نے کبھی کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کیا۔ کسی سے افیئر نہیں چلایا، کسی کا دل نہیں دکھایا۔ میں مطمئن ہوں، میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میرے لئے یہ فخر کا باعث ہے کہ میں ہر معاملے میں فیئر ہوں۔ مگر وہ میری ماں کے بارے میں بھی سب کچھ جانتا ہے۔ بعض ایسی شرم ناک حقیقتیں جو میں خود سے بھی شیئر نہیں کرنا چاہتی، اس کے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ وہ میری ماں کے حوالے سے کبھی زندگی میں بات کرے گا، مجھے جتائے گا تو میں کبھی بھی اس کے سامنے سر نہیں اٹھا پاؤں گی۔"

"اس نے تمہارے بارے میں سب کچھ جان کر ہی رشتہ استوار کیا ہے نا۔ تو پھر اگر وہ کبھی تمہیں جتائے گا، طعنے دے گا تو تم بھی حساب برابر کر دینا۔ تم کون سا اسے دھوکا دے رہی ہو۔" حنا نے اس کے ذہن سے گرہیں کھولنا چاہی تھیں۔ وہ کافی دیر اسے سمجھاتی رہی جبکہ عنوہ بے دلی سے سن رہی تھی۔

❀

وہ ممی کے بے حد اصرار پر شاپنگ کرنے آئی تھی۔ مگر دل اتنا گھبرایا کہ شاپنگ

ادھوری چھوڑ کر حنا کی طرف آ گئی۔ حنا گھر میں ہی تھی۔ عنوہ کو دیکھ کر کھل اُٹھی۔

"بڑے بڑے لوگ کیسے راستہ بھول آئے ہیں؟" اس کا انداز مصنوعی حیرت لئے ہوئے تھا۔

"فضول مت بولا کرو۔ میں تو انکل سے ملنے آئی ہوں۔"

"افسوس، انکل تو گھر میں نہیں۔ البتہ ان کی خوب صورت بیٹی موجود ہے اور آپ کو کمپنی دینے کے لئے تیار بھی۔" حنا مسکرائی۔

"مجبوری ہے۔" عنوہ کا انداز چڑانے والا تھا۔ "اب میں واپس تو جانے سے رہی۔"

عنوہ مسکراتے ہوئے حنا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد حنا ٹرے میں فل سائز مگ رکھے اور کرسٹل کے باؤل میں گاجر کا گرم گرم حلوہ لے کر اندر آئی۔ اسے نہ جانے کن سوچوں میں گم پا کر اس کا منہ بن گیا تھا۔

"اتنی سوچ و بچار تو قائداعظم نے ملک بنانے کے لئے بھی نہیں کی ہو گی۔"

"وہ تو عظیم لوگ تھے۔ بے حد جینئس۔ انہیں سوچ و بچار کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی ہو گی۔" اس نے غائب دماغی سے جواب دیا تھا۔

"جینئس تو آپ کے وہ بھی بہت ہیں۔ سنا ہے بہت زیادہ مال اکٹھا کر رکھا ہے۔" حنا نے بیڈ پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میرے نزدیک مال و دولت کی کوئی حیثیت نہیں۔ میرے تجربے کے مطابق اصل بون آف کنٹینشن (فساد کی جڑ) یہی مال و دولت ہے۔ انسان دولت اور اقتدار کے نشے میں اپنا اصل بھول جاتا ہے۔ بعض ایسی اخلاقی برائیوں میں ملوث ہو جاتا ہے، جس کا مداوا کوئی اچھائی کر ہی نہیں سکتی۔" عنوہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"تمہارے تجربات بہت تلخ ہیں۔ اور تمہاری باتیں بہت خوب صورت۔ پتہ ہے، عنوہ! ہم لندن سے واپسی پر سعودیہ چلے گئے تھے۔ ابو کی خواہش تھی کہ عمرہ کر لیا جائے۔ جدہ میں میری ملاقات ایک خاتون سے ہوئی۔ تیس اکتیس سال عمر ہو گی ان کی۔ اتنی شاندار، گریس فل خاتون تھیں وہ۔ مکمل پردہ کر رکھا تھا۔ ان کی باتیں روح میں اُترنے والی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا وہ بولتی رہیں اور میں سنتی رہوں۔ وہ بھی اپنے والد کے ساتھ عمرہ کرنے آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دیا تھا۔ مجھے یوں لگتا ہے، تمہاری کچھ بے چینیوں کا ان کے پاس ضرور حل ہو گا۔ ہم ان سے ملنے جائیں گے۔ دیکھنا، تم اپنے اندر ایک نئی توانائی پاؤ گی۔" حنا نے اس کے ہاتھ تھپتھپائے۔

"میرے اندر بہت خالی پن ہے حنا! میرے محسوسات گویا برف کی طرح منجمد ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک جما ہوا دریا کا گھاٹ ہوں، جس کے بدبودار پانی پر سالوں کی کائی جمی ہوئی ہے۔ اِن فیکٹ، مجھے کسی شعلے کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسی چنگاری جو آہستہ آہستہ میرے اندر کے آئسی واٹر (منجمد پانی) کو پگھلا دے۔" وہ بہت کرب سے کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سنہرے پن میں سرخیاں سی تیرنے لگی تھیں۔

"شاپنگ کہاں تک ہوگئی ہے؟" حنا نے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا تھا۔

"کون سی شاپنگ؟" عنوہ نے چونک کر حنا کی طرف دیکھا۔

"آپ کی شادی کی شاپنگ۔"

"ممی جانیں، یہ ان کا ہیڈک ہے۔ نرا سر درد۔" وہ بے زاری سے بولی تھی۔

"زیان بھائی نے تمہیں شاپنگ کروادی ہے؟"

"کیا یہ ضروری ہوتا ہے؟" عنوہ نے حیرانی سے سوچا اور بولی۔ "وہ مجھے چیک دے رہا تھا۔ میں نے خود ہی نہیں لیا۔"

"کیا مطلب؟" حنا چلائی۔ "تم نے چیک واپس کر دیا؟"

"ہاں۔" اس نے فخریہ کہا۔

"مگر کیوں؟" اب کے حنا کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"مجھے اچھا نہیں لگا........ میں نے چیک لینے سے انکار کر دیا۔ وہ مجھے بھی ممی کی طرح سمجھ رہا ہوگا، لالچی اور خود غرض۔ روپے پر جان دینے والی۔ ممی کی ایسی چیپ حرکتیں مجھے اپنی ہی نظروں میں گرا دیتی ہیں۔" اس نے رنجیدگی سے کہا اور مزید بولی۔ "چیک دیتے ہوئے اس نے مجھے جتا دیا تھا کہ ممی اسے شاپنگ کے لئے مسلسل کہہ رہی ہیں۔"

"اب تو تمہارے زیان صاحب سے ملنا ہی پڑے گا۔" حنا نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو عنوہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی۔

"ملتے ہوئے خیال کرنا کہ محترم تمہیں دیکھ کر ریجھ نہ جائیں۔"

"ارے........ یہ خوبی بھی پائی جاتی ہے؟" حنا چلائی۔

"ہر قسم کی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ بقول شہزادہ عالم کے، ہر اچھی شے کی تعریف کرنا، اسے سراہنا ضروری سمجھتے ہیں۔" عنوہ کی نگاہوں کے سامنے زیان کا چہرہ

گھوم رہا تھا۔ اسٹائلش، ماڈرن اور لبرل خواتین کے جمگھٹے میں تفاخر سے کھڑا۔ انہی بے عقل، عاقبت نااندیش عورتوں نے ہی تو اس کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔

"کب تک آئیں گے جناب تمہارے گھر؟"

"ہفتے میں ایک دو چکر تو لگا ہی لیتے ہیں۔ ممی سے کچھ ڈسکشن کرنا ہوتی ہے۔ یار! مجھے تو یہ سب بھی ڈھکوسلا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا کوئی دیوالیہ ہوتی کمپنی کو سہارا دینے بڑھا ہے، بغیر کسی خاص مقصد کے اس نے کروڑوں روپے لگا دیئے۔ فیکٹری کی تمام تر مشینری فارن سے منگوائی ہے۔ ملازمین کی تنخواہیں اپنے اکاؤنٹ سے دی ہیں۔ ایسے ہی تو ممی اس کا دم نہیں بھرتیں۔ بغیر فائدے کے تو انہوں نے کسی کو مخاطب نہیں کیا۔ مجھے تو اس کی کوئی چال معلوم ہوتی ہے۔" عنوہ پُرسوچ انداز میں بولی تھی۔

"ارے کوئی چال شال نہیں ہے........ لگتا ہے، محترم تمہاری ان سنہری زلفوں میں دل اُلجھا بیٹھے ہیں۔ یہ تمام تر مہربانیاں اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔" حنا بہت دور کی کوڑی لائی تھی۔

"پتہ نہیں۔" اس نے انجانے پن کی انتہا کر دی۔ زیان کی شوخ نگاہیں، دلکش بھاری آواز اور بولنے کا اسٹائل۔ وہ ایک دم ہی ڈسٹرب سی ہوگئی تھی۔

"ہم تو آپ کے عاشق ہیں، شیدائی ہیں، فریفتہ ہیں۔" وہ اس کے کان کے قریب ہی تو بولا تھا۔ عنوہ نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

"زیان بھائی یہاں موجود نہیں ہیں۔ آپ آرام سے انہیں سوچ سکتی ہیں۔" حنا گویا اس کے تاثرات سے محظوظ ہو رہی تھی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" عنوہ نے جھینپ کر کہا۔

"بنومت۔ سب جانتے ہیں ہم۔" وہ مسکرائی۔ "دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں، بس اوپری دل سے ناراضگی دکھاتی ہو۔ بہرحال وہ مشہور زمانہ جملہ کہ حُسن ہو تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔"

"بکومت، ایسی کوئی بات نہیں۔" عنوہ نے خفگی سے کہا۔

"کیسی بات؟" حنا نے آنکھیں نچائیں اور مزے سے بولی۔

"اچھا، اچھا۔ محبت وحبت کی۔ مگر مجھے تو معاملہ گڑبڑ ہی لگتا ہے۔"

"اگر تنگ کرو گی تو میں چلی جاؤں گی۔" عنوہ نے دھمکایا۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ سب بیٹیوں کو جلد یا بدیر اپنے گھروں میں جانا ہی ہوتا

ہے۔تم کون سا انوکھا کام کرو گی؟ یہ تو زیان بھائی پر تمہارا بڑا احسان ہو گا۔'' وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔عنوہ نے پاس پڑا کشن اسے دے مارا۔

''میں انکل سے بات کرتی ہوں کہ تمہارا بھی کوئی بندوبست کریں۔ بٹی اتاولی ہو رہی ہے اپنے گھر کو جانے کے لئے۔''

''بڑی مہربانی ہوگی۔جلدی کرو نا بات۔'' حنا نے منت بھرے انداز میں کہا۔

''تمہیں تو سچ مچ لندن کی ہوا لگ گئی ہے۔'' عنوہ مصنوعی حیرت سے کہہ رہی تھی۔

❁

''زیان ڈنر کے بعد آئے گا۔تم ریڈی ہو جاؤ۔ ہر وقت اول جلول حلیے میں گھومتی رہتی ہو۔ نہ جانے اتنے ہینڈسم،جینئس اور ویل ڈریسڈ بندے کو تم میں کیا نظر آ گیا ہے۔'' ممی اپنے مخصوص نخوت بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

'کاش، کچھ نہ ہی نظر آتا۔' عنوہ نے جل کر سوچا۔ممی کو دوبدو جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ بہت چھوٹی عمر میں ہی ممی نے اس پر اپنے رعب و دبدبے کی ایسی دھاک بٹھائی تھی کہ آج تک وہ ان سے بااعتماد انداز میں گفتگو نہیں کر سکتی تھی۔

جب وہ چھوٹی تھی، تب ممی اسے بہت مارا کرتی تھیں۔خصوصاً جب وہ نشے میں ہوتیں تو اسے رُوئی کی طرح دُھنک کر رکھ دیتیں۔ اسے ممی سے بہت خوف آتا تھا۔

جب بھی وہ گھر میں موجود ہوتیں،عنوہ اِدھر اُدھر کونوں کھدروں میں چھپ جاتی۔

آخری مرتبہ ممی نے اسے اس وقت مارا تھا جب وہ او لیول کر رہی تھی۔ اتنی بڑی بیٹی کو نوکروں کے سامنے یوں بے دردی سے مارتے ہوئے انہیں قطعاً شرمندگی نہیں ہوئی تھی۔

ممی کے تحقیر بھرے رویوں نے اس کا ازلی اعتماد چھین لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آج تک کسی سے بھی بے خوف ہو کر بات نہیں کر سکتی تھی۔

اس وقت بھی محض ممی کے ڈر اور خوف کی وجہ سے وہ کپڑے چینج کرنے اپنے روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔مبادا انہیں پھر سے غصہ نہ آ جائے اور وہ نوکروں کے سامنے اسے بے عزت نہ کر دیں۔ کپڑے چینج کرنے سے پہلے اس نے شاور لے لیا تھا، اسی لئے موڈ قدرے فریش ہو گیا تھا۔ بال ڈرائی کر کے اور انہیں بینڈ میں جکڑ کر جب وہ نیچے آئی تو زیان آ چکا تھا۔ممی اسے کافی پینے پر اصرار کر رہی تھیں مگر وہ مسلسل انکار کر رہا تھا۔

''مجھے چائے، کافی پسند نہیں۔'' اس کا دوٹوک انداز ممی کو خاموش کروا گیا۔ پھر کچھ

سوچ کر وہ شریر انداز میں بولی تھیں۔

''تمہارا فیورٹ ڈرنک منگوا دوں؟''

'استغفر اللہ۔' عنوہ حلق تک زہر زہر ہو گئی۔

آج تک کسی ساس نے اپنے داماد کو اس قسم کی آفر نہیں کی ہو گی۔ نہ جانے یہ کیسی ماں تھیں۔عنوہ کا رواں رواں سلگ اٹھا تھا۔ وہ بغیر کچھ بولے خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''مجھے لگتا ہے، آپ کی بیٹی کو کچھ ناگوار گزرا ہے۔ آپ ایسا کریں، ڈرنک کی جگہ کولڈ ڈرنک پلا دیں۔ ہم کولڈ ہی رہیں تو اچھا ہے۔ ورنہ ڈرنک کے بعد دل کے بے ایمان ہونے کا خدشہ ہے۔'' وہ بڑے جاندار انداز میں مسکرایا تھا۔عنوہ کا جی چاہ رہا تھا، اس کا منہ ہی نوچ ڈالے۔ممی یوں قہقہہ لگا کر ہنس رہی تھیں گویا اس نے لطیفہ سنایا ہو۔ وہ مخاطب ممی سے تھا، دیکھ اس کی طرف رہا تھا۔عنوہ جز بز سی ہو گئی۔

''کیسے مزاج ہیں؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی جبکہ چہرے پر سنجیدگی۔''نہ بولنے کی قسم تو نہیں کھائی۔''

''آپ کے مزاج سے اچھے مزاج ہیں اور بول بھی آپ سے زیادہ اچھا لیتی ہوں۔''

''تو پھر کبھی اپنی خوب صورت آواز میں گیت سنائیے نا۔'' بڑے دلبرانہ اسٹائل میں فرمائش کی گئی تھی۔

'گالیاں نہ دوں تمہیں۔' اس نے دانت پیس کر دل ہی دل میں کہا۔

''پلیز، بلند آواز میں کوسنے، بد دعائیں، گالیاں جو کچھ دینا ہے ضرور دیجئے۔ آپ کی ممی جا چکی ہیں۔ اب قطعاً گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ میرے سامنے کم از کم آپ کو کچھ نہیں کہیں گی۔خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ مسکرا رہا تھا مگر طنزیہ۔

'بہت ہی کمینہ ہے یہ۔' عنوہ دل ہی دل میں بولی۔ اسے یاد تھا،ایک مرتبہ ممی نے اس کے سامنے بھی عنوہ کی بے عزتی کر ڈالی تھی۔ وہ کون سا لحاظ کرتی تھیں کسی مہمان کا۔ جب دل چاہتا، اپنی شائستگی کا چولا اتار پھینکتیں۔

''کیوں آئے ہو؟'' کافی دیر سے نوکِ زبان پر مچلتا سوال اسے بے چین کر رہا تھا۔ وہ ممی کے اُٹھنے کا ہی تو انتظار کر رہی تھی۔

''فرصت سے آیا ہوں، جواب بھی دوں گا۔مگر پہلے تمہیں جی بھر کر دیکھ تو لوں۔'' اس نے اسی لب و لہجے میں کہا تھا۔گویا وہ کوئی قیمتی ڈیکوریشن پیس تھی۔ جسے ہر لحاظ

سے جانچا، پرکھا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ممی سے شاکی ہونے لگی۔

"کیا اس پوری دنیا میں یہی ملا تھا، آپ کو میرے لئے۔"

"ہر ایک کو اپنے مقدر کا ملتا ہے۔" وہ گویا اس کے تمام تاثرات پڑھ رہا تھا۔

"کھانا تو آپ کھا کر آئے ہیں۔ چائے کافی پسند نہیں تو پھر کیا خدمت کی جائے آپ کی؟" وہ یہاں سے اُٹھنے کا بہانہ چاہتی تھی۔

"کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ آپ ناحق زحمت کریں گی۔ بس ہماری نگاہوں کے سامنے رہیں۔"

"بہت چالاک انسان ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ "جان گیا ہے کہ میں یہاں سے اُٹھنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہوں۔"

"تم اتنا بلند آواز میں نہ سوچا کرو۔" زیان نے سنجیدگی سے کہا۔ عنوہ گڑبڑا سی گئی تھی۔ اسی پل امبرین ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ وہ کہیں جانے کے لئے بالکل ریڈی تھیں۔

"زیان ڈارلنگ! تم لوگ باتیں کرو، میں ذرا یزدانی کی طرف جا رہی ہوں۔ اوکے عنوہ! ٹیک کیئر۔ بائے بائے۔" وہ دروازے کی طرف پلٹیں۔

"اُف...... مجھے کم از کم ڈارلنگ مت کہا کریں۔" زیان نے پیچھے سے برجستہ کہا۔

امبرین نے مڑ کر دیکھا اور مسکرائیں۔

"کیوں بھلا......؟"

"جان نکال کر رکھ دیتی ہیں۔ مائی گاڈ، ڈارلنگ!...... جانو، سویٹی...... ویری چیپ ورڈز۔" اس کے چہرے پر ناگواری اور آنکھوں میں شرارت تھی۔ وہ سمجھ کر مسکرائیں اور دروازے کی طرف پلٹتے ہوئے بولیں۔

"اسے تنگ مت کرنا۔" ان کا اشارہ عنوہ کی طرف تھا۔

"کسے؟" وہ جان کر انجان بنا۔ "اوہ...... اچھا۔ یہ جو چینا ہے۔ یعنی چینی کی بنی ہوئی۔" وہ سمجھ کر سر ہلانے لگا تھا۔

"ویسے تم ان خاتون کی بیٹی تو نہیں لگتیں۔ کہیں انہوں نے تمہیں ایڈاپٹ تو نہیں کیا؟" امبرین کے جانے کے بعد زیان حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

"جی نہیں، یہ میری اصلی والی ممی ہیں۔" عنوہ نے ناگواری سے کہا۔

"کاش کہ نہ ہی ہوتیں۔ ایسی ماں سے تو میں بن ماں کے ہی بھلی تھی۔ حنا کی

طرح۔ اس کے ابو کتنے اچھے ہیں۔ جان دیتے ہیں اس پر۔ میرے پاپا بھی ہوتے تو مجھے کس قدر پیار کرتے۔" وہ آزردگی سے سوچ رہی تھی۔ زیان نے پینٹ کی جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو ممی اتنی ناپسند تھیں تو ان کی بیٹی سے رشتہ کیوں جوڑا؟" عنوہ بہت مرتبہ اس پہلو پر غور کر چکی تھی۔ آج سوچا پوچھ ہی لے۔

"ممی ناپسند ہیں، ان کی بیٹی نہیں۔ تم تو دل و جان سے عزیز ہو۔ خوب صورت، حسین، شفیق، رحم دل...... تم تو پھل دار شاخ ہو۔ ہری بھری، لچکیلی۔" عنوہ تو پوچھ کر پچھتائی تھی۔

"ایسے تو تم پر دل نہیں ہار بیٹھے۔" اس نے سگریٹ کو شعلہ دکھایا اور بڑی فرصت سے اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"پچھلے دو سالوں سے قسمت مہربان رہی ہے۔ اچھے اور سچے، قیمتی اور نادر و نایاب ڈائمنڈ ملے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "ایک وقت تھا، جب دنیا سے نفرت ہو گئی تھی۔ عورت سے نفرت ہو گئی تھی۔"

"یہ نفرت، پسندیدگی میں کیسے بدلی؟"

زیان ایک دم چونکا، ٹھٹکا اور پھر سر جھٹک کر صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

"یہ بھی ایک الگ قصہ ہے۔ جان جاؤ گی۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

"آپ جائیں گے کب......؟" عنوہ اسے ریلیکس انداز میں سوچوں میں گم دیکھ کر بولی۔

"کہاں؟"

"گھر...... اور کہاں؟" عنوہ نے جتا کر کہا۔

"یہ بھی تو گھر ہی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا تھا۔

"میں آپ کے ہوم سویٹ ہوم کی بات کر رہی ہوں۔"

"جانم! یہ بھی سویٹ ہوم ہے۔" وہ سرخ آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے دباتا کہہ رہا تھا۔

"مگر یہ ہمارا گھر ہے۔" عنوہ جھنجلا سی گئی تھی۔ وہ اسے جلد از جلد فارغ کرنا چاہتی تھی، مگر محترم جان بوجھ کر انجان بن رہے تھے۔

"اب نہیں ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے اور فرصت سے اس کے

تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔

''کیا مطلب؟'' کسی انجانے خدشے کے تحت اس کا دل دھڑک اٹھا تھا۔

''مطلب........مطلبی لوگوں سے پوچھا کریں، یعنی اپنی ممی سے۔ ہم تو بڑے دیالو ہیں۔ شاہ خرچ، بادشاہ۔'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا تھا۔

''میری سنہری چڑیا! کیوں اپنے ننھے منے چھوٹے سے دماغ پر اتنا زور ڈال رہی ہو۔ بتا دیتا ہوں۔ سب کچھ بتا دیتا ہوں۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں زیان صاحب؟'' عنوہ نے غصے سے کہا۔

''زیان صاحب!'' اس نے اچنبھے سے عنوہ کی طرف دیکھا اور گویا خوب خوب محظوظ ہوا۔

''نہ، نہ........اتنے پیار سے مت بلاؤ۔ کہیں ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔ میرا ابھی اس دنیا سے جانے کا ارادہ نہیں۔ ابھی تو میں نے جینا ہے تمہارے سنگ، اپنے بچوں کے سنگ اور ان محترمہ کے ہمراہ۔'' وہ موبائل کی بجتی ٹون کو سن کر اسکرین پر جگمگاتا نام دیکھ کر مسکرایا اور پھر سنجیدگی سے فون سننے لگا۔

''کہا تو ہے، میرے آنے جانے کا حساب نہ رکھا کرو۔ آئندہ فون مت کرنا۔'' اس نے دو لفظوں میں بات سمیٹی اور قدرے گم سم سی عنوہ کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''زندہ ہیں یا گزر چکی ہیں؟''

وہ گڑبڑا کر سیدھی ہوگئی تھی اور پھر کچھ الجھ کر پوچھنے لگی۔

''میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے۔''

''تمہاری ممی یہ گھر فروخت کر چکی ہیں۔''

''کب؟........کیوں؟'' عنوہ کی آنکھوں کے سامنے چند پل کے لئے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ وہ لرزتی آواز میں بولی۔

''ایک سال سے کچھ زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے اور کیوں بیچا ہے تو یہ وجہ تم اپنی ممی کے منہ سے سننا۔ شاید میں بتاؤں تو تمہیں تکلیف ہوگی۔'' وہ کہتے ہوئے چابیاں، موبائل اٹھا کر کھڑا ہوگیا تھا۔ عنوہ بھی غائب دماغی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ زیان نے اس کی متغیر رنگت دیکھی تو دو قدم کا فاصلہ سمیٹ کر قریب آ گیا۔

''تم پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ تمہارے پاس آل ریڈی دو دو گھر موجود ہیں۔ اسے بھی اپنا ہی سمجھنا۔ حق مہر میں لکھ دیا تھا میں نے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں؟''

''یہی تو اصل خوشی کا مقام ہے کہ تم بہت انوسینٹ ہو۔ لگتا ہی نہیں کہ یورپ میں اسٹڈیز کمپلیٹ کی ہے۔ شکر ہے اپنی ممی کی طرح چالاکی اور ہوشیاری سے بہت دور ہو۔ ورنہ میرے لئے پرابلم ہو جاتی۔ میں خود کو بہت ہی عقل مند، دانش مند، فہم و فراست والا سمجھتا ہوں۔ تم بہت منور اور تابناک ہو، اسی لئے تو تمہیں میری نگاہ نے پرکھ لیا تھا۔'' وہ آہستگی سے اس کے گال کو تھپتھپا کر بولا۔ عنوہ شاک کے عالم میں کھڑی تھی ورنہ ضرور اس کی حرکت کا نوٹس لیتی۔

''ممی نے یہ گھر کسے فروخت کیا ہے؟''

''تمہارے ہزبینڈ کو۔'' وہ مسکرایا اور پھر اس کے بالوں کی لٹ کو زور سے کھینچا اور پھر چھوڑ کر پلٹتے ہوئے بولا۔ عنوہ پہلے تو کچھ سمجھی نہیں تھی مگر جب بات سمجھ میں آئی تو وہ جا چکا تھا۔

''ممی! آپ یہ گھر بیچ چکی ہیں؟''

''تمہیں کس نے بتایا؟'' امبرین نے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔

''زیان نے۔'' اس نے بھی جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ امبرین کچھ پل کے لئے سوچتی رہیں۔

''ممی! زیان جھوٹ بول رہا تھا؟'' وہ کتنے یقین بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''نہیں۔'' ان کا جواب کم از کم عنوہ کی توقع کے خلاف تھا۔ چند پل کے لئے وہ بالکل خاموش رہ گئی تھی۔

''ہم کہاں جائیں گے امی؟'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

''تمہاری شادی اسی لئے تو کر رہی ہوں ڈفر! تم زیان کے ساتھ چلی جاؤ گی تو میری تمام پرابلمز solve ہو جائیں گی۔'' امبرین نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''تو پھر آپ کہاں جائیں گی؟'' وہ الجھی۔

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔'' امبرین نے لاپروائی سے کہا۔ ''تمہیں زیان کے ساتھ رخصت کر کے میں نے فرانس سیٹل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''اور فیکٹری........؟'' وہ ہکلا کر خاموش ہوگئی تھی۔ ممی کا انداز اتنا ہی دوٹوک تھا۔

''وہ بھی زیان خرید چکا ہے۔ تم بہت لکی ہو عنوہ! اتنا شاندار لائف پارٹنر، ایک سپر

گلوری لائف، مالدار، رئیس اور چاہنے والا۔'' امبرین نے بھرپور انداز میں کہا تھا۔

'' آپ نے مجھے بتانا گوارا نہیں کیا۔''

''تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھا میں نے۔'' امبرین نے لاپروائی سے کہا اور مزید بولیں۔

''اس فضول بحث کو سمیٹو۔ اور ہاں، تمہاری شاپنگ ہوگئی ہے یا پھر کچھ رہتا ہے خریدنے والا؟ دن کتنے رہ گئے ہیں۔ تمہیں کچھ تو خیال کرنا چاہئے۔ کم از کم اپنا برائیڈل ڈریس ہی دیکھ آتیں۔ اتنا زبردست ڈیزائن دیا ہے میں نے۔ اور ہاں، پارلر سے بھی ٹائم لے چکی ہوں، کل سے جانا شروع کر دو۔ نہیں بلکہ ابھی سے جاؤ۔ ویسے تمہیں ان مصنوعی سہاروں کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری فرینڈ، کیا نام ہے اس کا........ ہاں یاد آیا، حنا۔ اسے بھی ساتھ لے جانا، اوکے۔ مزید مجھے کچھ سمجھانا نہ پڑے۔ اب جاؤ بھی، منہ کیا دیکھ رہی ہو میرا؟''

وہ بے دلی سے چیئر گھسیٹ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ پہلے سوچا، حنا کو ساتھ لیتی جائے، مگر دل اس قدر برا ہو رہا تھا۔ وہ اکیلی ہی چلی گئی۔ پارلر میں چار پانچ گھنٹے برباد کرنے کے بعد وہ ممی کی ہدایت کے مطابق بوتیک میں آ گئی تھی۔ سرسری سا برائیڈل ڈریس دیکھ کر جوں ہی وہ روڈ کراس کر کے گاڑی تک آئی کہ ایک دم ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ زیان کی گاڑی اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی شخصیت کو دیکھ کر چونکی تھی۔ زیان کے ساتھ ایک خوب صورت لڑکی۔

'نہ جانے کون ہے؟' وہ سوچتے ہوئے گاڑی کو اسٹارٹ کرنے لگی تھی۔

'ہوگی کوئی کولیگ یا فرینڈ۔' اس نے لاپروائی سے سوچا اور پھر گھر آنے کے بجائے حنا کی طرف آ گئی۔

''ارے چندا! کیا خوب لشکارے مار رہی ہو۔'' حنا اسے دیکھتے ہی چلائی تھی۔

''بیوٹیشن کا کمال ہے۔''

''جی نہیں، تم ہو ہی خوب صورت۔ بلکہ حسین تر۔'' حنا نے اس کی سنہری آنکھوں میں جھانکا۔

''اتنی تعریفوں کی ضرورت نہیں۔''

''ہاں بھئی، ہماری تعریف کا بھلا کیا مزا۔ اصل لطف تو تب آئے گا، جب سرتاج جی حسن و آتش کے قصیدے پڑھیں گے۔'' حنا مسکرائی۔

''بکواس نہیں کرو۔'' عنوہ نے جھینپ کر کہا۔ گالوں پر گلاب کھل اٹھے تھے۔

''ویسے زیان بھائی تو تمہارے حُسن کے جلوے سے ہی دم بخود ہو جائیں گے۔''

''بکو مت۔ یہ بتاؤ، انکل کی طبیعت کیسی ہے؟'' عنوہ نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا کر موضوع بدلا۔

''ہاں، ابو اب ٹھیک ہیں۔ ویسے تمہارے لئے بھی ایک نئی خبر موجود ہے۔'' حنا نے جان کر تجسس پھیلانا چاہا۔

''کون سی خبر؟''

''یہ دیکھو۔'' وہ اپنے دائیں ہاتھ کو اس کے سامنے لہرا کر بولی تھی۔

''رِنگ ہے۔ کہاں سے لی؟........ یا کسی نے دی؟ ویسے ہے خوب صورت۔''

''بالکل ہی احمق ہو۔ بلکہ بدھو۔ کہاں سے لی، یا کسی نے دی؟'' حنا نے اس کی نقل اتاری۔ ''ویسے دی تو کسی نے ہے مگر بہت خاص رِنگ ہے۔''

''کیا خصوصیت پائی جاتی ہے اس میں؟'' عنوہ حیرانی سے بولی۔

''یہ انگیج منٹ رِنگ ہے۔'' حنا کھلکھلائی۔

''تم نے چوری چوری منگنی کروالی ہے؟'' اس نے چیخ کر کہا۔

''ہاں، جس طرح تم نے چپکے چپکے نکاح کروالیا تھا۔''

''کون ہے؟''

''پھپھو کا بیٹا ہے۔ نام عمر ہے اور جناب وکیل ہوتے ہیں۔'' حنا نے ایک ہی سانس میں تمام جواب دے دیئے تھے، بار بار اس کی زحمت سے بچنے کے لئے۔''

''تمہیں پسند ہیں؟''

''ہوں۔'' اس نے قدرے شرما، لجا کر کہا تو وہ اس کی ایکٹنگ دیکھ کر مسکرا دی۔

''اللہ تمہیں خوش رکھے۔''

''اور تمہیں بھی۔'' حنا نے صدقِ دل سے کہا۔

''ہاں حنا! مجھے دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔ کیونکہ میرے لئے دعا کرنے والے ہاتھ نہیں ہیں۔'' اس کی پلکیں نم ہوگئی تھیں۔ حنا نے اس کے گال کو چوما اور بولی۔

''میں شادی سے دو دن پہلے آ جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ ڈرائیور تمہیں لینے کے لئے آ جائے گا۔ اب میں چلتی ہوں۔''

''ارے چائے تو پی لو۔'' حنا چلائی۔ عنوہ نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ البتہ قدرے

بلند آواز میں بولی تھی۔

"چائے نہیں، اب پُر تکلف ڈنر کریں گے۔"

"وائے ناٹ۔ جیجا جی کے ہمراہ ضرور آنا۔" جواباً حنا نے بھی چیخ کر کہا تھا۔

❁

اس کی ماں روایتی عورت نہیں تھی، مگر شادی بالکل روایتی انداز میں کر رہی تھی۔ مایوں، مہندی کے بھرپور فنکشن .... بارات کی ارینج منٹ ہوٹل میں تھی۔ وہ اپنا فرض بہت اچھے طریقے سے نباہ رہی تھیں۔ اس کی شادی کے بعد ممی نے ہمیشہ کے لئے فرانس چلے جانا تھا۔ انہوں نے بہت دور تک کی پلاننگ کر رکھی تھی۔

حنا اسے پارلر سے گھر لے آئی تھی۔ پھر انہوں نے یہیں سے ہوٹل روانہ ہونا تھا۔

وہ ریڈ کلر کے لہنگے میں نفاست سے کئے گئے میک اپ اور خوب صورت جیولری میں نظر لگ جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔

"یار! قیامت لگ رہی ہو۔" حنا نے کوئی بیسویں مرتبہ جھک کر اس کے کان میں کہا تھا۔

"حنا! ایک گلاس پانی تو لا دو۔" عنوہ نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"ارے، تم تو کانپ رہی ہو۔" حنا فکرمند سی ہوئی۔ "کیا گھبراہٹ ہو رہی ہے؟"

"ہاں .... دل گھبرا رہا ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں تمہارے لئے جوس لاتی ہوں۔" حنا کچھ دیر بعد دوبارہ آ گئی تھی، جوس کے گلاس سمیت۔

"جلدی جلدی پیو۔ آنٹی کا فون آ گیا ہے۔" حنا نے گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔ جانے کا سن کر عنوہ کی پیاس ہی ختم ہو گئی تھی۔ لہٰذا اس نے بمشکل دو تین سپ لے کر گلاس رکھ دیا۔

اتنے لوگوں کے سامنے مرکز نگاہ بن کر بیٹھنے کا سوچ کر ہی اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔

"ممی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ مجھ میں کانفیڈنس کی کمی ہے۔" اس نے گویا اس پل اپنی خامی کو تسلیم کر لیا تھا۔

ممی پورے فنکشن کے دوران مہمان داری ہی نبھاتی رہی تھیں۔ عنوہ کا اس پل دل چاہ رہا تھا، کم از کم دس منٹ کے لئے ہی سہی، ممی اس کے پاس آ کر بیٹھتیں۔ مگر اس کی

ماں کے پاس اس کے لئے دس منٹ بھی نہیں تھے۔

حنا کی شوخیاں عروج پر تھیں۔

"جہاں لوٹ لیا ہے تُو نے عنوہ! اتنا حسین دولہا۔"

ڈنر کے کچھ ہی دیر بعد رخصتی کا شور اٹھ گیا۔ ممی کی فرینڈز، ان کی بیٹیاں اس کے اردگرد تھیں۔

وہ بھی تو عام سی لڑکی تھی۔ کچھ خواب اس کی آنکھوں میں بھی آ بسے تھے۔ آنکھیں تو شروع سے ہی خواب دیکھنے کی عادی ہوتی ہیں۔ اپنے والدین کے لئے، بہن بھائیوں کے لئے سوچنا کس قدر اچھا لگتا ہے .... پھر فیوچر کے متعلق پلاننگ، زندگی کے ساتھی کے بارے میں سوچنا۔

یہ ایک نازک مرحلہ تھا۔ ایک بیٹی کا اپنے والدین سے بچھڑنا، دوستوں سے، سہیلیوں سے۔ اس کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ خواہشات بدل جاتی ہیں۔ اس کا نرم دل اس وقت بہت سے غموں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس کی حسرتیں سسک رہی تھیں۔ اس کے پاس کوئی رشتہ مکمل شکل میں نہیں تھا۔ نہ باپ، نہ بھائی، نہ کوئی کزن۔ فقط ایک ماں تھی، وہ بھی ادھوری۔

اس کے کانوں میں ممی کی شوخ آواز، کھنکتی ہنسی کسی بارود کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ جو کیفیات اس وقت وہ محسوس کر رہی تھی، ممی ان سے کوسوں دور تھیں۔ انہیں اس کی جدائی کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ کیونکہ انہوں نے دکھ کو کسی بھی روپ میں دیکھا نہیں تھا۔

وہ بہت بے حس عورت تھی۔ عنوہ نے آخری مرتبہ ممی کے متعلق سوچا اور پھر سر جھٹک کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

گاڑی ایک وسیع و عریض محل نما کوٹھی کے آگے رک چکی تھی۔ نہ جانے کون لڑکیاں تھیں جنہوں نے اسے تھام کر گاڑی سے باہر نکالا تھا۔ شاید کزن تھیں یا پھر فرینڈز۔ وہ اسے تھام کر کمرے تک پہنچا گئی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ملازمہ ٹائپ عورت آئی۔ شکل سے وہ ملازمہ نہیں لگتی تھی اور لہجے سے تو بالکل بھی نہیں۔

"میڈم! جوس لیں گی یا پھر دودھ لاؤں؟ .... چائے بھی مل سکتی ہے۔ جو آپ چاہیں۔"

"فی الحال کچھ بھی نہیں۔" چائے کی طلب ضرور ہو رہی تھی، مگر عنوہ نے انکار کر دیا۔

بیڈ روم بہت نفاست سے سجا تھا۔ یعنی فرنیچر بہت شاندار تھا۔ البتہ ایک چیز اس نے نوٹ کی تھی کہ کسی بھی قسم کی آرائش نہیں کی گئی تھی۔ نہ پھول نہ کلیاں۔ وہ ہی ملازمہ ایک مرتبہ پھر آ گئی تھی۔

"میڈم! سر ناراض ہو رہے ہیں...... آپ پلیز بتائیں کہ کیا لاؤں آپ کے لئے، چائے وِد اسنیکس؟" وہ گھبرائی گھبرائی سی بول رہی تھی۔

"کھانا، موڈ نہیں ہے۔" عنوہ نے جھنجلا کر کہا۔

"مگر میڈم! سر غصہ کریں گے۔"

"آپ کہہ دیجئے، میں نے منع کیا ہے۔" عنوہ نے نرمی سے کہا تھا۔

"یس میڈم! آپ کی بات ٹھیک ہے۔ مگر صاحب کا حکم اپنی جگہ...... میں آپ کے لئے چائے لے آتی ہوں۔" اس نے خود ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ اب اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ یہاں کام کرتی ہیں؟" عنوہ نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"جیسے کمپنی کا ایم ڈی ہوتا ہے یا پھر ایڈمنسٹریٹر۔ اسی طرح مجھے بھی تمام ملازمین کی ایم ڈی سمجھ لیں یا پھر ہاؤس کیپر۔" وہ شائستگی سے کہہ رہی تھی۔

"آپ کا نام؟"

"مس نینی کہتے ہیں سب۔" وہ فرماں برداری سے بولی۔

"اجازت ہے؟" عنوہ کو کچھ سوچتے پا کر اس نے آہستگی سے پوچھا تھا۔

"یس، آپ جا سکتی ہیں۔"

"تھینک یو میڈم!"

مس نینی کے جانے کے بعد عنوہ نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی تھی اور ایک مرتبہ پھر اپنی پچھلی زندگی کو سوچنے لگی۔

"کیا فائدہ زیان کے ساتھ اتنی تلخ کلامیوں کا۔ ہوا تو وہی ہے جو ممی نے چاہا یا پھر زیان نے۔"

نہ جانے کب تک وہ سوچوں میں گم رہتی۔ چونکی تو تب جب وہ بالکل اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے آرام دہ نائٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔

"تم نے ابھی چینج نہیں کیا؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

"نن...... نہیں تو۔" عنوہ ہکلا سی گئی تھی۔ وہ تو اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ایسے ہی تو

ہوتا ہے۔ اسی طرح تو ہوتا ہے۔

"او کے، پھر چینج کر لو...... میں ابھی آتا ہوں، پھر آرام سے بات کریں گے۔" وہ نرمی سے کہتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے صوفے پر رکھا موبائل اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ عنوہ ابھی تک حیران پریشان سی بیٹھی تھی۔

"اسے کیا ہوا ہے؟ اس نے ایسا بی ہیو کیوں کیا؟" وہ مسلسل خود سے الجھ رہی تھی۔

"کمال ہے، مجھے بھی اتنا وزن لاد کر بیٹھنے کا کوئی شوق نہیں۔" عنوہ زیر لب بڑبڑائی اور پھر کھڑی ہو گئی۔ ڈریسنگ روم سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ فارغ ہو کر نکلی تو مس نینی چائے رکھ کر جا چکی تھیں۔

اس نے آرام سے بیڈ پر بیٹھ کر چائے پی، پھر اپنے لمبے گھنے سنہری بالوں کو سلجھانے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ خوب اچھی طرح کمبل پھیلا کر لیٹ گئی تھی۔ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ نیند میں ہی اسے محسوس ہوا تھا کہ کوئی اس کے گال کو تھپتھپا کر جگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے مندی مندی آنکھیں کھولیں اور پھر دوسرے ہی پل ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ زیان اس کے اوپر جھکا تھا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر سیدھا ہو گیا۔

"تھینکس گاڈ!" وہ مسکرایا۔

"میں نے تمہیں چینج کرنے کے لئے کہا تھا، سونے کے لئے نہیں۔" اس کی آنکھیں نہ جانے کس جذبے کے تحت جگمگا رہی تھیں۔ عنوہ کو کچی نیند میں جگانے پر بے حد غصہ آیا۔

"کیوں جگایا ہے مجھے؟"

"کیا تم نہیں جانتیں؟" وہ سوالیہ انداز میں بڑی معنی خیزی سے دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔" عنوہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

"تم سے ایک بات کرنی تھی۔" زیان بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولا تھا۔

"صبح نہیں کر سکتے تھے؟" عنوہ کو بے حد غصہ آیا۔

"نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیا بات ہے؟" عنوہ ٹھٹک سی گئی۔

"وہ ایکچولی تمہیں بتانا تھا کہ آج تم بہت حسین لگ رہی تھیں۔" اس کی آنکھوں میں ناچتی شرارت اور بدلے بدلے انداز ملاحظہ کر کے وہ قدرے گڑبڑا سی گئی تھی۔

"مجھے پتہ ہے کہ میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں۔"

عنوہ کا انداز ہنوز وہی تھا، روٹھا روٹھا سا۔

"کیوں نہیں جانم! آپ کے حُسن کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔" اس نے دونوں بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر کے زور کا جھٹکا دیا تھا۔ عنوہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ وہ مزاحمت کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

ولیمہ بھی بہت شاندار ہوا تھا۔ ممی آج بے حد خوش تھیں۔ بار بار اس کے رخسار چومتیں۔ رسم کے مطابق اسے ممی کے ساتھ جانا تھا، مگر ممی کے نزدیک ایسی فضول رسموں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

حنا بھی خوب چہک رہی تھی۔ ہوٹل سے فارغ ہو کر اس کے ساتھ گھر آئی۔ میک اپ صاف کروانے میں ہیلپ کرتی رہی۔ پھر اس نے چینج کیا۔ اسی اثنا میں مس نینی چائے لے آئی تھیں۔ حنا نے چائے پی، مس نینی کو تھینکس بولا اور پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

عنوہ بھی دن بھر کی تھکی ہوئی تھی، لہٰذا جلد ہی سو گئی۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو خود کو کمرے میں تنہا پایا۔

فریش ہونے کے بعد ابھی وہ بال سلجھا رہی تھی، جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے بے حد خوب صورت، کامنی سی لڑکی کھڑی تھی۔ عنوہ سامنے سے ہٹ گئی۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ بڑی شائستگی سے پوچھ رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ کی تعریف؟" اس نے کچھ اُلجھ کر پوچھا تھا۔ کیونکہ لڑکی کے انداز مالکانہ تھے۔ وہ آرام سے بیڈ پر بیٹھ رہی تھی۔

"بتا دیتی ہوں۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" اس کا لہجہ نرم تھا اور الفاظ بھی سادہ۔

"بہت خوب صورت ہیں آپ۔ بلکہ خوب صورت تو لفظ بہت چھوٹا ہے۔" اس کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

"آپ کون ہیں؟" عنوہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس بیڈ کو آپ کے ساتھ شیئر کرنے والی۔"

"میں سمجھی نہیں؟" عنوہ نے حیرت سے کہا۔ اس کا دل کسی انہونی کی طرف اشارہ

کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بیک وقت خوف، پریشانی، حیرانی اور اُلجھن کے رنگ جھلک رہے تھے۔

''میں زیان کی بیوی ہوں۔''

''کیا......؟'' عنوہ کے اردگرد گویا بم بلاسٹ ہوا تھا۔ ہر شے گویا تہس نہس ہوگئی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے بیڈ پر بیٹھی اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔

❀

تنگ گلی کا موڑ مڑتے ہی اس کا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اشرف دکاندار کی دکان کے سامنے رکھی بڑی سی لکڑی کی بدرنگ میز پر بیٹھا رؤف چاچا سرعت سے اس کی طرف آیا تھا۔ زروہ کا دل زور زور سے پہلو میں دھڑکنے لگا۔

''دیا تھا میرا پیغام اپنی ماں کو؟'' چاچا اپنی مونچھوں کو بل دیتے انتہائی غلیظ نگاہوں سے دیکھتا اس پل زروہ کو زہر سے بھی برا لگا تھا۔

''چاچا! دو تین دن تک تنخواہ مل جائے گی تو دے دوں گی کرایہ۔'' زروہ نے زہر کا گھونٹ بھر کر دھیمی آواز میں کہا تھا۔

لفظ چاچا سن کر روفی چاچا یوں اچھلا گویا کرنٹ لگا ہو۔ سیاہ رنگت مزید سیاہ پڑ گئی اور چوڑے ماتھے پر سلوٹیں بھی نمودار ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

''پچھلے چار روز سے یہی تکرار سن رہا ہوں۔ مزید ایک دن بھی اوپر نہ ہو۔ آج شام تک کرایہ مل جانا چاہئے۔ سنا تم نے؟''

''ٹھیک ہے چاچا! کوشش کروں گی کہ ایڈوانس تنخواہ مل جائے۔'' اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

''میں کل تک انتظار نہیں کر سکتا۔ شام تک کرایہ مل جانا چاہئے، ورنہ......'' روفی چاچا نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔

'جہنم میں جاؤ بے غیرت۔' وہ جان گئی تھی کہ چاچا آنکھیں سینکنے کی غرض سے بات کو طول دے رہا ہے۔

❀

دکھ کی انتہائی کیفیات پر انسان کے اعصاب مفلوج ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی عظیم نقصان سے دوچار حیرت سے بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ حیرت، دکھ اور صدمے نے اسے بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا زمانوں کی تھکن نے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس نے زیان کی ہر زیادتی کو معاف کر دیا تھا۔ اس کی ذات میں جتنی دراڑیں تھیں، سب قبول کر لیں۔ وہ اس عزم کے ساتھ اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی کہ وہ اس کی شخصیت کی کمزوریاں ختم کر دے گی۔ اس کی دیوانگی اور عشق نے عنوہ کے تمام اندرونی زہریلے احساسات کو مٹا دیا تھا۔ وہ زیان کی محبت اور جنوں کو جان کر خود کو مکمل طور پر سرنگوں کر چکی تھی۔

صرف محبت کے دھوکے میں اس نے اتنا بڑا پہاڑ جتنا غم اٹھا لیا تھا۔ ایک ایسا شخص، جس میں تمام اخلاقی برائیاں موجود تھیں، اسے صرف عشق کے دھوکے میں وہ قبول کر چکی تھی۔ اس عظیم دھوکا دہی نے اسے سر سے پاؤں تک جھلسا دیا تھا۔ ماسٹر بیڈ روم کے در و دیوار اس پر ہنس رہے تھے، مذاق اُڑا رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ اسے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دھول جھونک دی گئی تھی۔

'سیکنڈ چوائس......سیکنڈ وائف۔'

ان آوازوں نے اسے توڑ ڈالا تھا۔ وہ بھربھری مٹی کا ڈھیر بن گئی تھی۔ عزتِ نفس کس مقام پر آ کے مجروح ہوئی تھی۔ جی چاہ رہا تھا، اس کمرے کی ہر شے کو تہس نہس کر دے۔ اس لڑکی کے خوب صورت چہرے کو بگاڑ دے یا پھر خود کو ہی شوٹ کر لے۔

''مجھے اندازہ ہے کہ آپ کو بہت دکھ پہنچا ہے۔'' اس کی شرمندہ سی، دبی دبی آواز عنوہ کو اپنے حواسوں میں لے آئی تھی۔

''دکھ۔'' عنوہ نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔

''مجھے صرف دکھ نہیں پہنچا، میری پوری ہستی کو فنا کر دیا گیا ہے۔ میری ذات کا مان، خودی اور انا کو بڑی بھاری ضرب لگی ہے۔''

''آپ کو زیان نے نہیں بتایا تھا؟'' وہ بڑی رنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

''اونہہ......اگر بتا دیتا تو میں یہاں ہوتی؟'' وہ زہرخند ہوئی۔ لڑکی ایک دم گھبرا گئی تھی۔ اس کی رنگت بھی متغیر ہوگئی۔ آنکھوں میں پریشانی کے سائے نمی بن کر جھلکنے لگے تھے۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی تھی۔ عنوہ اسے دیکھ کر کچھ حیران سی ہوگئی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟......طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''مم......میری بات سنیں۔'' وہ اس کے قدرے قریب آ کر سرگوشیانہ بولی۔ عنوہ کچھ نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں آہستہ سے چلتی ہوئی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی نگاہیں سوالیہ انداز میں اس کے گھبرائے چہرے پر اُٹھی تھیں۔

"آپ انہیں کچھ نہ بتایئے گا۔"

"کیا مطلب؟" عنوہ اُلجھی۔

"یہی کہ میں نے آپ کو اپنے بارے میں بتا دیا ہے۔" اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"زیان نے منع کیا تھا؟" عنوہ نے حیرت سے پوچھا۔ "بھلا ایسی باتیں چھپی رہ سکتی ہیں؟"

"نن........نہیں تو۔" رانیہ نے آہستگی سے کہا۔

"پھر تم کیوں خوف زدہ ہو؟" وہ اُلجھ کر بولی تھی۔ عجیب ڈرپوک لڑکی ہے۔ کیسے کانپ رہی ہے۔ احمق، زیان کیا اسے مار ڈالے گا؟

"وہ اپنے معاملے میں کسی کو بھی بولنے کی اجازت نہیں دیتے۔"

"یہ صرف اس کا معاملہ نہیں ہے۔" عنوہ کو نئے سرے سے اپنا نقصان یاد آ گیا۔ دل میں غصے کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔

"میں اب چلتی ہوں۔ وہ آنے والے ہوں گے۔ مجھے دیکھ کر انہیں غصہ آئے گا۔"

رانیہ اٹھنے لگی تو اس نے غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا لیا۔

"بیٹھو یہاں۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

"نہیں، پلیز مجھے جانے دیں۔ بس وہ آنے والے ہیں۔ میری جان نکال دیں گے۔" رانیہ التجائیہ انداز میں بولی تھی مگر عنوہ نے زبردستی اسے بٹھا لیا۔

"تم اتنی خوف زدہ کیوں ہو؟ زیان اتنا خطرناک تو نہیں ہے۔"

"آپ نے ابھی ان کا غصہ نہیں دیکھا نا۔" رانیہ نے سر جھکا کر رنجیدگی سے کہا۔ اس کی آنکھیں نم نم سی تھیں۔

"اچھا، یہ بتاؤ جب میں اس گھر میں آئی تو تم کہاں تھیں؟ میں نے تمہیں کہیں نہیں دیکھا۔"

"میں اوپر والے پورشن میں ہوتی ہوں۔ مجھے نیچے آنے کی پرمیشن نہیں۔" رانیہ نے آہستگی سے کہا۔

عنوہ حیرت زدہ سی رہ گئی........ یہ بھلا کیا بات ہوئی۔ اپنے ہی گھر میں پرمیشن سے آنا جانا۔

"میرے لئے انہوں نے ایک حد مقرر کر رکھی ہے۔ میں اس حد کو کراس کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ اگر میں ایسا کروں تو میرا ٹھکانہ پھر اس گھر میں قیامت تک نہ ہو گا۔"

"مائی گاڈ!" عنوہ تو ششدر رہ گئی تھی۔ "کیا زیان تمہیں کڈنیپ کر کے لایا ہے یا گن پوائنٹ پر نکاح میں آئی ہو؟"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" رانیہ گھبرائی۔ "وہ ایسے نہیں ہیں۔"

"تو پھر کیسے ہیں؟" عنوہ بلند آواز میں بولی۔

"شی........آہستہ بولیں۔ یہ مس ننی شکایت لگا دے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ آہستہ آہستہ سب سمجھ جائیں گی۔ مگر بے فکر ہو جائیں، ادھر دل کا معاملہ ہے۔ آپ ان کی محبت ہیں، پسند ہیں۔ انہوں نے آپ سے عشق کیا ہے۔ آپ کے لئے ان کے دل میں بہت گنجائش ہے۔ یہ ساری سختیاں میرے لئے ہیں۔ آپ ہر کام میں خود مختار اور آزاد ہوں گی۔ اس گھر کے ملازم آپ کی حیثیت کو پہچانتے ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ان کی اصل مالکن آپ ہیں۔ سو آپ کو کم از کم کوئی بھی خوف نہیں ہونا چاہئے، مطلب زیان کے چھوڑ دینے کا۔ وہ آپ کو کبھی بھی خود سے الگ نہیں کریں گے چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔ کیونکہ آپ ان کے دل پر حکومت کرتی ہیں۔ آپ اس لحاظ سے بہت لکی ہیں کہ اس اسٹون مین کے دل کی جاگیر پر صرف آپ کا قبضہ ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔ کل سے پہلے ملاقات نہ ہو گی۔"

رانیہ سرعت سے اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی جبکہ عنوہ اُلجھن بھری نگاہوں سے بند دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آواز آئی۔ شاید زیان آ گیا تھا۔ عنوہ کو نئے سرے سے اپنے نقصان یاد آنے لگے۔

(......❀......)

"رانیہ، زیان کی بیوی ہے۔" اس انکشاف نے اس کی روح تک کو ہلا ڈالا تھا۔ اس کے اندر آگ بھڑک رہی تھی۔ اسے سب بھول چکا تھا۔ زیان کی دیوانگی، محبت، وارفتگیاں۔ یاد تھا تو صرف اتنا کہ زیان نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ اچانک اسے خیال آیا۔ رات کو ولیمہ تھا۔ ہوٹل میں زیان اس کے ساتھ تھا۔ مگر جب وہ گھر آئی تو اکیلی تھی۔ زیان نہ جانے کہاں تھا۔ یہی بات حنا نے بھی نوٹ کی تھی۔ چونکہ اتنے گھنٹے پہلے پارلر اور پھر اسٹیج پر بیٹھنے کی وجہ سے حد درجہ تھکاوٹ ہو گئی تھی لہٰذا اس نے زیان کی غیر موجودگی کو اتنا محسوس نہیں کیا تھا۔ اگرچہ اسے زیان کا انتظار تھا مگر تھکن کی وجہ سے وہ جلد ہی سو گئی تھی۔

صبح بھی وہ زیان کی غیر موجودگی کے متعلق سوچ رہی تھی جب رانیہ چلی آئی۔ وہ رانیہ کی باتیں سوچتے ہوئے مسلسل سلگ رہی تھی۔ دل گویا جلتی بھٹی میں جا گرا تھا۔

''تو کیا رات کو زیان اوپر تھا، رانیہ کے پاس؟'' اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا دل کو کسی نے مٹھی میں بھینچ کر مسل ڈالا ہے۔

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی زیان!........تم نے میرا بہت نقصان کیا ہے۔ میرے ساتھ فراڈ کیا ہے۔''

وہ زیر لب تنفر سے بڑبڑائی تھی۔ اسی پل دھاڑ سے دروازہ کھلا تھا۔ زیان کوٹ کندھے پر رکھے ٹائی گلے میں لٹکائے اندر داخل ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں نے سب سے پہلے اسی کے گرد حصار کھینچا تھا۔ مگر اس کے سنجیدہ سنجیدہ انداز دیکھ کر قدرے ٹھٹکا، چونکا اور پھر دھپ سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''خیریت؟........ایسی خونی نگاہوں سے کیوں گھور رہی ہو؟ مانا کہ بہت ہینڈسم ہیں ہم۔ مگر یوں بھی مت دیکھئے۔ ہارٹ اٹیک ہونے کا خدشہ ہے۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت مچل رہی تھی۔

''ناشتہ کیا تھا؟'' وہ جوتے اتارتا پوچھ رہا تھا۔ عنوہ نے کوئی جواب نہیں دیا، بس سلگتی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''سنگدل، فراڈیا۔ کیسے ہشاش بشاش ہے۔ ہاں جی، ہرا جو دیا ہے مجھے۔ خوش کیوں نہ ہو۔ جیت کا تو مزا ہی الگ ہے۔'' اسے زیان کے ساتھ گزاری رات یاد آئی تو دل پر گویا آرے چل گئے۔ وہ جانتا تھا، جب اس کا پرپوزل عنوہ کے لئے آیا تھا تو اس نے بے حد احتجاج کیا تھا۔ کھانا، ناشتہ چھوڑ دیا۔ خوب رونا دھونا مچایا مگر ممی جیسی سخت دل ماں سے کسی نرمی کی امید کہاں رکھی جاسکتی تھی۔ تھک ہار کر وہ خاموش ہوگئی۔ ممی کی پسند کے سامنے سر جھکا دیا۔

''بس ایک ہی تو زندگی کی خواہش تھی کہ اچھا سا، بے حد مخلص، چاہنے والا ساتھی ملے۔ جس کی زندگی میں پہلے کوئی عورت نہ ہو۔ وہ صرف اسی کا ہو، کوئی پرچھائیں اسے چھو کر نہ گزری ہو۔ مگر یہ خواب چکنا چور ہوگیا تھا۔ وہ جتنا بھی ماتم کرتی، کم تھا۔

''یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی ہے۔'' وہ اس کی نگاہوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولا تو عنوہ چونک اٹھی۔

''طوفان تو میری زندگی میں آ ہی چکا ہے۔'' اس کا لہجہ زہر زہر تھا۔

''کون سا طوفان؟'' زیان اس کے لہجے کی گہرائی تک نہیں پہنچا تھا، اسی لئے لاپروائی سے بولتا ہوا اٹھا۔ شرٹ کے بٹن کھولے، پھر پینٹ کی بیلٹ کھینچ کر نکالی اور واش روم میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر آیا تو ٹراؤزر شرٹ پہن رکھا تھا۔ بالوں میں انگلیاں پھیر کر اس نے باڈی اسپرے سے خود کو مہکایا اور پھر دوسری طرف گھوم کر اس کے برابر نیم دراز ہوگیا۔

''مزاج تو ٹھیک ہیں؟ مطلع ابر آلود لگتا ہے۔''

''کہاں تھے آپ رات کو؟'' وہ زہر خند ہوئی۔

''تو اسی لئے غصے سے ہری لال ہو رہی ہیں۔'' زیان مسکرایا۔ ''ویسے غصے میں بہت اچھی لگتی ہو۔ آنکھوں میں چنگاریاں سی پھوٹ رہی ہیں۔ کیا دلکش منظر ہے۔''

''میرا تو پورا وجود بھڑ بھڑ جل رہا ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا گئی۔

''تو فائر بریگیڈ کو بلوا لوں؟'' آنکھوں میں شرارت لئے وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ ''ویسے تمہیں ٹھنڈا کرنے کے لئے میں ہی کافی ہوں۔''

''میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے زیان صاحب! بات کو گھمانے پھرانے کی ضرورت نہیں۔'' عنوہ نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ زیان نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ اچھل کر دور ہٹ گئی۔

''مجھے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں۔ اگر مجھے چھونے کی کوشش کی تو زور زور سے چلانا شروع کر دوں گی۔''

''زیان صاحب؟'' پہلے تو وہ اس طرزِ تخاطب پر حیران ہوا پھر اس کے سرخ چہرے اور آنکھوں میں چھائی ناگواری کا بغور جائزہ لینے لگا۔

'کچھ غلط تھا۔' اس کی چھٹی حس نے فوراً ہی انفارم کر دیا تھا۔ عنوہ کا روّیہ کم از کم اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ بپھری شیرنی بن کر بیٹھی تھی۔

''کیا پوچھا تھا؟'' اس کے ذہن سے قطعاً عنوہ کا سوال غائب ہو گیا تھا۔ وہ اس کے رویے کے متعلق سوچ رہا تھا۔

'اسے کیا ہوا ہے؟'

''تم رات کو کہاں تھے؟'' عنوہ نے سلگتے لہجے میں پوچھا۔ زیان کو اس کا روّیہ سمجھ میں آنے لگا۔ اس نے گہری سانس کھینچ کر ایک مرتبہ پھر اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تھا۔

''مجھے بہانے بہانے سے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ کاٹ کھانے کو

دوڑی تھی۔

''تمہیں ہاتھ لگانے کے لئے مجھے کسی بہانے کی ضرورت نہیں۔'' زیان نے سنجیدگی سے کہا اور مزید بولا۔ ''تمہیں کس بات پر غصہ ہے؟ میرے رات کو نہ آنے پر یا تمہیں ہاتھ لگانے پر؟''

وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ بس غصے سے ہونٹ کاٹتی رہی۔

''کمال ہے، یہ مزاحمت تو تمہیں دو دن پہلے کرنا چاہئے تھی۔ اب یوں بھاگنے اور کاٹ کھانے کا کیا مقصد ہے؟ بیڑیاں تو پہن چکی ہو ہماری محبت کی۔ اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ میری محبت میں کوئی کھوٹ نہیں۔ آخر عملی مظاہرہ کر کے دکھایا تھا۔ باقی کی قلم ہنی مون پر سہی، ابھی تو تمہارا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ کہیں سر در نہ تڑوا لوں تمہیں چھو کر۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ عنوہ کا سوال پھر درمیان میں کہیں رہ گیا۔ وہ غصے سے اسے گھورتی رہی۔

'جان بوجھ کر بات ٹال رہا ہے۔ بتانا نہیں چاہتا۔ مگر میں بھی اس سے اُگلوا کر رہوں گی۔ کیا سمجھ کر اس نے مجھے دھوکا دیا۔ میں کوئی گری پڑی لڑکی نہیں ہوں۔ ممی فرانس چلی جائیں گی۔ اپنے خیالوں میں انہوں نے میری شادی کر کے مجھے پابند کر دیا ہے اور خود آزادی سے اپنی زندگی گزاریں گی، مجھے اس منافق جلاد کے حوالے کر کے۔ ممی! میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ آپ بہت بری ہیں۔ سب سے بری۔ ہم جیسے بچوں کی مائیں نہ ہوں تو بہتر ہے۔ بروکن فیملی کے خودپسند، اذیت پسند بگڑے بچے۔ جس کی ایک مثال اس کے سامنے تھی اور خود عنوہ کیا تھی۔ احساسِ کمتری کی ماری دبو سی لڑکی۔ جسے ماں کا حال ہر وقت شرمندہ کئے رکھتا اور ماں کے مستقبل میں کسی انتہائی قدم کے اندیشے کبھی پورے دل سے خوش نہیں ہونے دیتے تھے۔'

وہ سوچوں کے تانوں بانوں میں اُلجھی تھی، اس بات سے بے نیاز کے زیان کہنیوں کے بل اُلٹا لیٹا ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ لئے اپنی مقناطیسی دمکتی نگاہوں سے اس کے رنجیدہ چہرے کے تاثرات بغور پڑھ رہا تھا۔

'اونہہ........ایسے کیا گھور رہا ہے۔ گویا کچا ہی کھا جائے گا۔' عنوہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

''میں کوئی جانور ہوں جو تمہیں کھانے کی کوشش کروں گا۔ ہم تو انسان ہیں۔ بڑے ہی ہمدرد، نرم دل اور چاہنے والے۔'' اس نے گویا عنوہ کی سوچوں تک رسائی حاصل کر

لی تھی اور اب بڑی چیلنج بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عنوہ ایک دم گڑبڑا سی گئی۔

''ہوشیاری اور چالاکی تو تم پر ختم ہے۔ ایسے ہی تو اتنا مال اکٹھا نہیں کر رکھا۔ اتنے سیدھے نہیں ہو۔ شکل سے ہی عیار اور مکار نظر آتے ہو۔ نہ جانے کس کس کو دھوکا دے رکھا ہے۔'' اپنے تئیں اس نے زیان کو بھرپور غصہ دلانے کی کوشش کی تھی اور نہایت ہی سنجیدگی سے طنز کا تیر چلایا تھا مگر زیان کے جاندار قہقہے نے اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

''پہلی مرتبہ ایک خوب صورت خاتون نے میری اتنے شاندار لفظوں میں تعریف کی ہے یعنی کہ زیان بہت عیار اور مکار۔'' وہ تو گویا ایک ایک لفظ سے لطف کشید کر رہا تھا۔ خوب مزے لے کر بولا۔

''کچھ اور بھی تو کہو۔ یہ بہت تھوڑی تعریف ہے۔ مجھے اتنی کم تعریفیں ہضم نہیں ہوں گی۔''

''مجھے تمہارے منہ لگنے کا کوئی شوق نہیں۔'' عنوہ آگ بگولا ہو گئی تھی۔

''مگر مجھے تو ہے.......منہ نہ سہی، ہاتھ ہی سہی۔ یہ تمہارے نازک گداز ہاتھوں پر مہندی کیا خوب جچ رہی ہے۔ واہ کتنے حسین ہاتھ ہیں۔ جی چاہتا ہے چوم ہی لوں۔ مگر تم اس وقت بپھری شیرنی بنی ہو۔ واللہ یہ نرم گداز کلائی میں میرا پہنایا ہوا بریسلٹ کتنا خوب صورت لگ رہا ہے۔ دل تو بہت مچل رہا ہے۔ جی چاہ رہا ہے کہ تمہاری اس نازک کلائی کو مروڑ دوں۔ مگر بازو فریکچر ہونے کا خدشہ ہے۔ تمہیں بیمار تو نہیں کرنا۔ میں تو تمہیں فٹ اور فریش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اب غصہ تھوک دو جانم! رات نہ سہی، ابھی دن کو رات بنا دیتے ہیں۔ دیکھو کیسا خواب ناک ماحول ہے۔ گلاس ونڈو پر بھاری کرٹن ہیں۔ لائٹس کی ڈم روشنی اور دروازہ بند اور تم ہو اس قدر قریب۔ اپنے تو ہوش اُڑ رہے ہیں۔ بن پیئے ہی لگتا ہے، دماغ پر چڑھ رہی ہے اور تمہارے پاکیزہ سمٹے سمٹے وجود سے اُٹھتی بھینی بھینی خوشبو۔'' وہ اس کے ہاتھوں کا باریک بینی سے جائزہ لیتا ہوا پٹری سے اُتر گیا تھا۔ ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد حمائل کئے اور دوسرا ٹھوڑی کے نیچے رکھے وہ اس کی دودھیا گردن کے پاس چہرہ کر کے گہری سانس کھینچتا بھاری جذبوں سے بوجھل آواز میں بولتے ہوئے ایک عدد گستاخی کرنے کے ساتھ بڑی بے باک نگاہوں سے اس کے پورے وجود کا جائزہ لے رہا تھا۔ عنوہ شرم اور غصے سے جھنجنا اُٹھی۔

''شرم نہیں آتی اتنا فضول بولتے ہوئے۔'' وہ کپکپاتی آواز میں کہہ کر قدرے اور سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"ہائے، ہائے........اتنی بے حیا ممی کی اتنی حیادار بیٹی........آپ کی یہی ادائیں تو پاگل، دیوانہ بنا چکی ہیں۔ اب کیا مزید ادائیں دکھا کر مجھے مینٹل ہاسپٹل بھجوانا ہے؟ بس کرو جانم! اتنی لال انار نہ بنو۔ ہم تو پہلے ہی آؤٹ آف کنٹرول ہیں۔ بالکل ہی آپے سے نکل جائیں گے۔ ہمیں جامے میں ہی رہنے دو۔" وہ اس کے سرخ رخسار پر زوردار چٹکی بھر کر کہہ رہا تھا۔ عنوہ غصے اور جھنجلاہٹ سے بھنا اُٹھی اوپر سے ممی کا طعنہ اس کا سارا طنطنہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا تھا۔

ممی کا شرم ناک حوالہ اسے سر جھکانے پر مجبور کر دیتا۔ 'کیا ساری زندگی یہ مجھے ممی کے حوالے سے طعنے دیتا رہے گا؟........مگر میں ساری زندگی اس کے ساتھ رہوں گی کیوں؟ مجھے ابھی اس کے ساتھ دوٹوک بات کرنا چاہئے۔ یہ دھوکے باز، منافق۔ میں ایک پل یہاں نہیں رہوں گی۔ مگر جاؤں گی کہاں؟........گھر تو ممی نے اس مکار کو دے دیا ہے۔ یقیناً اسی فراڈیے نے ممی کو مجبور کیا ہوگا کہ وہ گھر اور فیکٹری بیچ دیں۔ اُف میں کس زندان میں پھنس گئی ہوں۔'

وہ اضطراری انداز میں لب بھینچے سوچ رہی تھی۔ زیان نے گلا کھنکھار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"یار! کیوں اپنے ننھے سے دماغ کو سوچنے کی زحمت دے رہی ہو؟ ایکچوئلی رات بھر میں ہسپتال رہا ہوں۔ فنکشن سے واپسی پر حسام کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اتنا سیریس نہیں ہوا، مگر پھر بھی چوٹیں کافی آئی ہیں۔ رات میں اس کے پاس رہا ہوں۔ فون اس لئے نہیں کیا کہ تم پریشان ہوگی۔ ویسے تم مس نتی سے پوچھ سکتی تھیں، وہ تمہیں بتا دیتی میرے نہ آنے کے بارے میں یار! ایک ہی تو دوست ہے میرا اتنا نیک، اتنا شریف اور ایماندار........ بہت پیار کرتا ہے مجھ سے۔ اب میں اسے اتنی تکلیف میں چھوڑ کر کیسے آسکتا تھا۔"

اسے مزید تنگ کرنے کا ارادہ ترک کر کے وہ نہایت سنجیدگی سے بتا رہا تھا مگر عنوہ کو بھلا یقین کیسے آتا؟ اس کے کانوں میں ایک ہی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

"اس بیڈ کو آپ کے ساتھ شیئر کرنے والی۔"

عنوہ کا رواں رواں سلگنے لگا۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہوگئی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کسی نے ان میں مرچیں سی پھونک دی ہیں۔

'ممی! میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں مر نہیں جاؤں گی آپ کے بغیر۔

پڑھی لکھی ہوں، کہیں جاب ڈھونڈ لوں گی۔ کسی ہاسٹل میں رہ لوں گی مگر اس گھر میں قیامت تک نہیں رہوں گی۔ اونہہ، پہلے سے موجود بیوی........میرے جذبات کا خون کیا گیا ہے۔ میری انا کو توڑ ڈالا ہے اس شخص نے۔ میں کیا اس قابل تھی کہ کسی دو نمبر شخص کی دوسری بیوی بنتی؟ میں نے خود کو اس ذلیل شخص کی خاطر سینت سینت کر رکھا ہے۔ ممی! آپ بہت ظالم ہیں اور یہ جھوٹا شخص۔'

وہ خون کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ اسے زیان کی جھوٹی اسٹوری پر یقین نہیں آیا تھا۔ مٹھیاں بھینچے، لہو رنگ آنکھیں لئے اس کی سوچیں منتشر تھیں۔ زیان بے حد غور سے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھ رہا تھا، حفظ کر رہا تھا۔

"پلیز، پلیز........عنوہ! کول ڈاؤن، کیا ہوگیا ہے؟" زیان نرمی سے بولا۔ "تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یار! اتنا غصہ، تم تو غصے سے بھری بوتل ہو۔ مجھے آج اندازہ ہوا ہے۔ پھٹ جاؤ گی یار! انڈیل دو سارا زہر۔ میں بالکل مائنڈ نہیں کروں گا۔ بتایا تو ہے کہ حسام کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے میں رات بھر اس کے پاس رہا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کی ہڈیاں بچ گئیں۔ سر پر قدرے گہرا زخم آیا تھا، اس لئے رات بھر بے ہوش رہا ہے۔ ابھی اس کی حالت کچھ سنبھلی ہے۔ یقین نہیں آرہا تو فون کر کے پوچھ لو۔ ابھی ہسپتال میں ہے وہ۔ ادھر سے نکلا تو امریکہ سے ایک اور دوست کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع آگئی۔ تین گھنٹوں سے اسی سے رابطے کی کوشش میں تھا۔ یار! کیوں شک بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہو۔"

"مان لیتی ہوں، رات بھر بیمار ٹوٹے پھوٹے دوست کی تیمارداری ہوتی رہی ہے۔ مگر وہ کون ہے جو اس گھر کے اوپر والے حصے میں رہتی ہے؟ اور جس کا دعویٰ ہے کہ وہ اس بیڈ کو شیئر کرنے والی ہے میرے ساتھ؟" عنوہ نے چیخ کر کہا تھا۔ اتنا زور زور سے بولنے کی وجہ سے اس کے گلے میں خراشیں سی پڑ گئی تھیں۔ حلق میں کانٹے اُگ آئے تھے۔

"تم نے اچھا نہیں کیا زیان! مجھے یوں بے خبر رکھ کر۔ میری یہی اوقات تھی کہ میں تمہاری دوسری بیوی متعارف ہوتی؟ میں عنوہ ہاشم فریدی اس پل خود کو سب کی نگاہوں میں گرا محسوس کر رہی ہوں۔ لوگ پیٹھ پیچھے کیا کیا باتیں کرتے ہوں گے؟ میں اس معصوم لڑکی پر سوتن بن کر آئی ہوں۔ میں نے اس کا حق چھین لیا ہے، اس کے خواب چھین لئے ہیں۔ مجھ سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہوگیا ہے، انجانے میں۔ اللہ بھی مجھے معاف

نہیں کرے گا۔ کسی کے آنسوؤں کی نم زمین پر محبتوں کے تاج محل نہیں کھڑے کرتے عیبث!........ تم میں بہت سی اخلاقی برائیاں ہیں۔ میں نے سب قبول کر لیں۔ تمہیں اپنا لیا۔ تمہاری محبت کو اک جنونی کی خالص محبت سمجھ کر ایمان لے آئی۔ سوچا تھا، زندگی میں آنے والے پہلے اور واحد مرد ہو۔ محبت بھی آہستہ آہستہ ہو جائے گی۔ مگر مجھے علم نہیں تھا کہ تم ہر لحاظ سے گرے ہوئے انسان ہو۔ کراہیت آ رہی ہے مجھے تم سے۔ میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر، تمہاری اس نام نہاد محبت پر۔ اچھا چہرہ دیکھ کر ریجھ جاتے ہو۔ چلی جاؤں گی میں یہاں سے........"

اس سے مزید کچھ بولا نہیں گیا تھا۔ آنسوؤں کے گولے سے آواز رندھ گئی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم اوپر گئی تھیں یا رانیہ نیچے آئی تھی تمہارے پاس؟" کافی دیر اسے تڑپ تڑپ کر روتا دیکھنے کے بعد وہ بڑے سرد انداز میں پوچھ رہا تھا۔ لہجے میں گویا زہریلے سانپ کی پھنکار تھی۔ انتہائی غصے اور نفرت کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے اور بے تحاشا رونے کے باوجود اسے زیان کے لب و لہجے میں آنے والی تبدیلی کے احساس نے چونکا دیا تھا۔ وہ رونا دھونا بھول کر ایک ٹک اس کی لہو رنگ آنکھوں اور سپاٹ چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟" کسی بھی جذبے سے عاری اس کی کٹیلی آواز نے عنوہ کی روح تک کو لرزا دیا تھا۔

"آپ نے زیان کا غصہ نہیں دیکھا۔ جان نکال دیں گے میری۔" رانیہ کی لرزتی کانپتی آواز نے عنوہ کو معاملے کی سنگینی کا احساس دلا دیا تھا۔

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ کیا یہ سب جھوٹ ہے؟" عنوہ نے چلا کر کہا۔ "رانیہ تمہاری بیوی نہیں ہے؟" وہ غرائی۔

"تم سے بعد میں بات کرتا ہوں........ پہلے رانیہ سے نمٹ لوں۔ زندہ نہیں بچے گی آج میرے ساتھ۔"

وہ تنفر سے کہتا ہوا پلٹ گیا تھا۔ اس کے قدموں کی دھمک عنوہ کے دل پر سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پہلو میں دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھ کر گویا خود کو مضبوط کرنے کا ارادہ باندھا اور دوسرے ہی پل وہ بھی لرزتی کانپتی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

"میں آپ کے لئے قطعاً بے ضرر ثابت ہوں گی۔ میں آپ کی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کروں گی۔ آپ اپنے ہر قول و فعل میں خود مختار ہیں۔ بس میں اس گھر میں پناہ گزین کی حیثیت سے رہوں گی...... یہی کہا تھا نا، محترمہ رانیہ ظہیر صاحبہ! آپ نے۔ بھول گئی ہیں۔ اتنی پرانی بات تو ہرگز نہیں۔ محض نو سال پہلے کا قصہ ہے۔ کہو تو مزید یاد کروا دوں اپنے طریقے سے کہ آپ نے کس ٹریٹی (معاہدے) پر سگنیچر کئے تھے۔ میری تمام تر قربانیاں رائیگاں گئیں۔ نفرتوں کے کتنے جام پی کر میں نے تمہارا ہاتھ تھاما تھا۔

آج سے نو سال پہلے مجھ پر ایک سانحہ گزر گیا تھا۔ تم تو جانتی ہو نا ہر بات........ میں نے نو سال پہلے زندگی کا ایک بھیانک روپ دیکھا تھا۔ زیادہ نہ سہی، مگر کچھ نہ کچھ تھوڑا بہت تو تمہارا بھی عمل دخل تھا نا میری روح کو گھائل کرنے میں........ آج سے نو سال پہلے تمہاری اس خاموشی نے زیان عیبث کو جلتے برزخ میں لا پھینکا تھا۔ اس وقت میں بھی صدمے سے گنگ تھا۔ عورتوں کی مکاریوں سے نابلد۔ مگر آج نہ وہ وقت ہے نہ مقام اور نہ ہی حالات۔ آج خاموش مت رہنا، ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔ میری کروئلٹی (بے رحمی) سے تو تم واقف ہو نا۔ کسی بھول میں مت رہنا۔ نہ ہی تم پر رحم کیا جائے گا۔ اب بتاؤ، کیا باتیں کیں تم نے عنوہ کے ساتھ۔ کیا کچھ بتا چکی ہو؟ بولو، جواب دو؟" اس کے دھیمے سلگتے لہجے میں زخمی شیر کی پھنکار تھی۔ رانیہ کا سانس حلق میں ہی کہیں اٹک گیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ناچ رہے تھے۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ آج اس کی زندگی کا آخری دن ہے۔

"فالتو ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔ جلدی سے بکو۔ کچھ کہنا چاہتی ہو اپنی صفائی میں؟" وہ زہر زہر ہو رہا تھا۔ اس کے ریشمی بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر زوردار دھکا دیا۔ رانیہ لڑکھڑا کر بیڈ پر جا گری تھی۔

"جواب دو۔" وہ غرا رہا تھا۔ "آج میں اپنی زندگی کے تاریک ابواب کے تمام صفحات پھاڑ دوں گا۔ قانونی طور پر تمہیں اس نام نہاد بندھن کی قید سے آزاد کر دوں گا۔ تم نظر آؤ تو مجھے اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ یاد آنے لگتا ہے۔ میری نس نس زہر آلود ہے۔ جب جب تمہیں دیکھتا ہوں، انتقام کی آگ کے بھانبھڑ جلنے لگتے ہیں۔ مگر اب میں اس خود ساختہ انتقام کو بھی ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنی پچھلی زندگی کی بوسیدہ کتاب کو دفن کر چکا ہوں۔ میں تمہیں آزاد کر دوں گا، اپنی زندگی جیسے چاہے گزارنا۔ اپنا منحوس وجود لے کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ کل سورج نکلنے سے پہلے پہلے کہیں بھی چلی جانا۔ یہاں تک

کہ تم میری پہنچ سے دور ہو جاؤ۔ میں نے بہت سالوں بعد خوشی کا ذائقہ چکھا ہے۔ اپنے بکھرے وجود کی بڑی مشکل سے کرچیاں سمیٹی ہیں۔ یہ داغ جو میرے دل پر لگے ہیں، آہستہ آہستہ مندمل ہو کر مٹ جائیں گے۔ اب اتنے سالوں بعد میں کسی بھی قسم کا نقصان نہیں اٹھاؤں گا۔ اب میرے حصے میں اگر کوئی خسارہ آیا تو یاد رکھنا تمہارے لئے ذرہ برابر بھی اس زمین کے اوپر جگہ نہ ہو گی۔ میں عنوہ کو کھونا نہیں چاہتا۔ اگر تمہارے بہکاوے میں آ کر وہ چلی گئی تو یاد رکھنا مجھے درندہ بنتے دیر نہیں لگے گی۔ میں تمہیں طلاق........"

"پلیز زیان!......اپنی پیاری چیز کے صدقے، آپ مجھے خود سے الگ مت کرنا۔ میں کچھ نہیں بولوں گی۔ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ مگر مجھے یوں دربدر مت کریں۔ میرا اس دنیا میں آپ کے سوا کوئی نہیں۔ میرا کوئی سہارا نہیں۔ میرے پاس نہ سایہ ہے نہ سائبان۔ میں کہاں جاؤں گی؟ مجھے ٹھوکروں کے حوالے مت کریں۔ میں اس گھر کے اس کونے میں پڑی رہوں گی۔ کبھی ایک لفظ بھی زبان سے نہیں بولوں گی۔ مگر میرے ساتھ یوں مت کریں۔ آپ کو عنوہ سے محبت کا واسطہ، مجھے دربدر نہ کریں۔ پلیز زیان! میں مر جاؤں گی۔ خودکشی کر لوں گی، مگر طلاق کا لفظ نہیں سنوں گی۔"

وہ روتی بلکتی اس کے قدموں میں گری تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

اسی پل دھاڑ سے دروازہ کھلا اور لرزتے قدموں کے ساتھ عنوہ اندر چلی آئی۔ سامنے کے منظر نے اسے دنگ کر دیا تھا۔ وہ فرعون بنا پورے کروفر سے رانیہ کو زوردار ٹھوکر مار کر اس کی طرف پلٹا۔ اس کی آنکھوں سے گویا لہو چھلکنے کو بے تاب تھا۔ مگر عنوہ اس کے انتہائی تاثرات سے بے نیاز چیخ اٹھی۔

"وحشی، درندے! کیا اس کی جان لو گے؟" وہ رانیہ کی پیشانی سے بھل بھل نکلنے والے سرخ گاڑھے خون کو دیکھ کر چلائی۔

"مائی گاڈ!......اتنا خون...... ہائے رانیہ! تمہیں بہت درد ہو رہا ہے۔ کتنا گہرا زخم ہے۔ اگر بلیڈنگ زیادہ ہو گئی تو......اُف زیان! ڈاکٹر کو فون کرو......دیکھو تو اتنا خون۔ کہیں مر نہ جائے۔" وہ خوف زدہ سی بوکھلا کر رانیہ کی طرف بڑھی تو زیان نے ایک جھٹکے سے اس کے بازو کو اپنی آہنی انگلیوں کی گرفت میں لے کر زور سے دبایا۔ تکلیف کی شدت سے عنوہ کے لبوں سے بے ساختہ کراہ نکلی۔

"کیا لینے آئی ہو یہاں؟......چلو نیچے۔" وہ سنجیدہ مگر سخت لہجے میں بولا۔

"وہ......مر جائے گی زیان!"

"تو مر جائے۔" زیان نے پتھریلے لہجے میں کہا۔ عنوہ حق دق سی رہ گئی۔ اتنا ظالم اور وحشی انسان۔ اسے گویا یقین ہی نہ آیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہی اور پھر چیخ کر بولی۔

"تم میں انسانیت ختم ہو چکی ہے۔ مگر ہر ایک کو اپنے جیسا مت سمجھنا۔ چھوڑو مجھے، ورنہ کاٹ کھاؤں گی۔" اس نے بھی جنگلی پن کی انتہا کر کے اس کے بازو میں دانت گاڑ دیئے۔ زیان پہلے تو حیران ہوا پھر قدرے پریشان اور پھر اس کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

'یعنی کہ اتنی ہمدردی' اس نے بے ساختہ سوچا اور اس کا بازو چھوڑ دیا۔

"تمہارا تو کوئی مضبوط بندوبست کرنا پڑے گا۔" وہ آخری تنفر بھری نگاہ رانیہ پر ڈال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازہ ایک جھٹکے سے بند کر کے چلا گیا تھا۔ عنوہ ششدر سی چند پل دیکھتی رہی اور پھر سرعت سے رانیہ کی طرف بڑھی۔ بوکھلاہٹ میں اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ جب کوئی چیز نظر نہ آئی تو اپنا دوپٹہ پھاڑ کر اس کے سر پر لپیٹ دیا۔ پھر انہی قدموں پر واپس پلٹی۔ سیڑھیاں اتر کر ڈائننگ ہال میں جھانکا۔ مس نینی برتن سیٹ کر رہی تھی۔ عنوہ سرعت سے آگے بڑھی۔

"مس نینی! پلیز آپ ایک گا : گرم دودھ لے کر اوپر آئیں۔ ساتھ میں کوئی ٹیبلٹ ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اور ہاں، زیان کے فیملی ڈاکٹر کو بھی فون کر دیجئے گا۔ پلیز ہری اپ۔" وہ تیز تیز بولتے ہوئے پلٹ گئی تھی۔

مس نینی پہلے چونکی اور پھر دوبارہ اسے اوپر جاتا دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھی۔

"میڈم! آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

'اندھی ہو کیا؟ دیکھ نہیں رہیں کہ اوپر جا رہی ہوں۔' عنوہ نے سوچا اور پھر پلٹ کر بولی۔ "رانیہ واش روم میں سلپ ہو گئی تھی۔ اسے چوٹ آئی ہے۔ میں اسے دیکھنے جا رہی ہوں۔"

"پلیز میم! آپ نہ جائیں۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔" مس نینی نے اسے روکنا چاہا۔ عنوہ سنی ان سنی کرتی تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد مس نینی نفیس سی ٹرے میں دودھ کا گلاس لئے اندر چلی آئی۔ عنوہ اطمینان سے رانیہ کے قریب بیٹھی اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ مس نینی کی آنکھوں میں تحیر پھیل گیا۔

"آپ نے فون کر دیا ہے ڈاکٹر کو، مس نینی؟" عنوہ اس کے ہاتھ سے ٹرے پکڑتے ہوئے مصروف انداز میں بولی تھی۔

"یس میم!" مس نینی نے سنبھل کر جواب دیا۔

"لو رانیہ! تھوڑا سا دودھ پی کر یہ ٹیبلٹ لے لو۔ ڈاکٹر کے آنے تک کچھ تو آرام آئے گا۔" عنوہ نے نرمی سے بازو کا سہارا دے کر اسے اٹھایا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر خرم آ گئے تھے۔ انہوں نے انجکشن کے ساتھ ساتھ میڈیسن بھی دیں۔ زخم کا بغور جائزہ لے کر بینڈیج بھی کی اور عنوہ کو ڈھیروں تسلیاں دے کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مس نینی نے عنوہ سے کہا۔

"میم! آپ بھی نیچے چلیں۔ رانیہ بی بی آرام کریں گی۔"

"نہیں۔ میں رانیہ کے پاس رہوں گی۔ آپ پلیز جائیں۔" عنوہ نے سہولت سے انکار کر دیا۔

"پلیز میڈم!" مس نینی نے التجائیہ کہا۔

"کہا نا، آپ جائیں۔" عنوہ غصے سے بولی۔

"کس قدر ڈھیٹ عورت ہے یہ۔ نہ جانے کہاں سے زیان نے اس لسوڑی کو دریافت کیا ہے۔' عنوہ کو سوچتے ہوئے خود ہی ہنسی آ گئی۔

"رانیہ بی بی! سمجھائیں نا انہیں...... صاحب بہت غصہ کریں گے۔ آپ اپنے لفظوں میں انہیں سمجھا دیں۔" مس نینی نے معنی خیزی سے آنکھیں نچائیں تو رانیہ نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔

"تم چلی جاؤ عنوہ!...... مس نینی کی بات مان لو۔"

"مگر تم......؟" عنوہ تذبذب کا شکار تھی۔

"میں اب ٹھیک ہوں۔"

"او کے، ابھی میں چلتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد پھر آؤں گی۔ تم آرام کرو۔ تھوڑی سی نیند لے لو۔ اِن شاء اللہ فریش ہو جاؤ گی۔"

وہ نرمی سے اس کے گال چھو کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ تیکھی نگاہ سے مس نینی کو گھورا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

"امی! پکانے کے لئے آج کچھ بھی نہیں ہے۔ دال کا جار، چاول کا جار اور آٹے کا کنستر سب خالی ہو چکے ہیں۔ گھی اور آئل بھی ندارد...... لالٹین میں ڈالنے کے لئے تیل بھی نہیں۔ اور اوپر سے مبین کی دوائیاں بھی ختم ہو چکی ہیں۔"

زردہ سلائی مشین پر جھکی ماں کے قریب آ کر آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔ فاخرہ نے چونک کر تھکی تھکی سی نگاہ بیٹی کے رنجیدہ چہرے پر ڈالی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ زردہ ابھی رو دے گی۔

لالٹین میں ڈالنے کے لئے تیل، پیٹ میں ناچتی بھوک اور مبین کی دوائیاں تینوں چیزیں ہی ضروری تھیں۔ فاخرہ جانتی تھیں کہ سلائی مشین کے خالی ڈبے میں فقط دو سو روپے موجود ہیں۔

انہوں نے ایک نظر زردہ کے چہرے پر ڈالی اور ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"امی! اس ایک سو روپے کا بھلا کیا کچھ آئے گا؟" زردہ نے اُلجھ کر ماں کی طرف دیکھا جو نہ جانے کن سوچوں میں گم سوئی میں دھاگا ڈالنا بھول چکی تھیں۔

"ایک کلو آٹا اور سبز دھنیا اور مرچیں منگوا لو۔ دس روپے کا دہی بھی لے آنا۔ چٹنی بنا کر پیٹ کے دوزخ کو تو بھرنا ہے۔"

"اور امی! مبین کی دوائیاں؟" زردہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ فاخرہ نے گہری افسردہ سانس خارج کی اور ڈبے میں پڑا دوسرا نوٹ بھی بیٹی کی طرف بڑھا دیا۔

"امی! دوائیاں تو بہت مہنگی ہیں۔ کم از کم پانچ سو روپے تک آئیں گی۔" وہ بہت آہستہ آواز میں بات کر رہی تھی، مبادا برآمدے سے ملحقہ چھوٹے سے بغیر کواڑ کے کمرے میں موجود مبین تک آواز نہ پہنچ جائے۔

"میڈیکل اسٹور جانے سے پہلے نسرین سے کپڑوں اور بیڈشیٹس کی سلائی کے پیسے لیتی جانا۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا اور مزید بولیں۔ "گلی میں سے کسی بچے کو پکڑ کر آٹا منگوالو۔ ابھی باقی تینوں بھی بھوک بھوک چلاتی آ جائیں گی۔"

"جی امی!" وہ تابعداری سے سر ہلاتی، چادر لپیٹ کر باہر نکل آئی تھی۔

میڈیکل اسٹور سے دوائیاں لانے کا مطلب تھا کہ اشرف کی دکان کے سامنے سے گزرنا اور وہاں ہر وقت روفی چاچا اپنی منحوس شکل لے کر آتے جاتے لوگوں کو تاڑتا رہتا تھا۔ اسے دیکھ کر فوراً ادھر متوجہ ہو جاتا تھا۔

زروہ نے افسردگی سے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دیئے۔ مگر اس کی توقع کے عین مطابق چاچا روفی لپک کر اس کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔

"نہ میری نرمی کا ناجائز فیدہ (فائدہ) اٹھا رہی ہو تم ماں بیٹیاں...... کرایہ دو، ورنہ تمہارے خلاف کیس بنوا دوں گا یا مکان خالی کروا لوں گا...... اسے صرف دھمکی مت سمجھنا۔"

"چاچا! صرف دو دن مزید دے دو۔ پرنسپل صاحبہ سے بات کی تھی مگر وہ کیم سے پہلے تنخواہ دینے پر راضی نہیں ہوئیں۔ صرف دو دن تو رہ گئے ہیں۔ پلیز چاچا! جہاں پورا مہینہ انتظار کیا ہے، صرف دو دن اور مزید کر لو۔" زروہ نے التجائیہ آواز میں سر جھکائے کہا تھا۔ نہ جانے چاچا روفی کو ترس آ گیا تھا یا پھر کسی شیطانی چال کو سوچ کر خاموش ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی کچھ نہیں کہتا۔ گھر آ کر بات کروں گا۔ اور ہاں، پھر تمہیں دو مہینے کا اکٹھا کرایہ دینا ہو گا۔"

اتنی آسانی سے جان چھوٹ گئی تھی۔ زروہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتی روڈ پر پہنچ گئی۔ رکشے میں بیٹھ کر وہ پیسوں کا حساب لگا رہی تھی۔ صرف دو ہزار تنخواہ جس میں سے سولہ سو نکال دیئے جائیں تو پیچھے بچے فقط چار سو...... پورا مہینہ نہ جانے کیسے گزرے گا۔

"اللہ مالک ہے جس نے پیدا کیا ہے، کوئی نہ کوئی وسیلہ بھی ضرور بنائے گا۔" وہ مطمئن ہو کر دوائیاں خریدنے لگی۔

ایک گھنٹے بعد جب وہ گھر آئی تو سعیہ، سارہ اور مہک بھی اسکول کالج سے آ گئی تھیں۔ سعیہ نے آٹا گوندھ رکھا تھا۔ سارہ دہی کی ہری مرچوں والی چٹنی بنائے بیٹھی تھی۔ مہک چائے بنا رہی تھی۔ اس نے دوائیاں میز پر رکھیں اور برآمدے کے ایک

کونے میں رکھے چولہے کے قریب آ بیٹھی۔ لکڑی کی چھوٹی سی شیلف بنا کر اس کے اوپر کچن سے متعلقہ چیزیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ نمک، مرچ اور گھی کے ڈبے۔ دالوں کے جار اور آٹے کا کنستر۔ یہ اور بات ہے کہ ان تمام ڈبوں میں سے صرف چند ایک میں مطلوبہ اشیاء تھوڑی تھوڑی مقدار میں موجود تھیں۔

"چینی کہاں سے آئی ہے؟" زروہ نے چادر اتار کر چولہے پر توا رکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

"جناب! صرف چینی نہیں، یہ بھی پوچھئے کہ دودھ اور گرین ٹی کا یہ فل سائز ڈبہ کہاں سے آیا ہے۔" مہک نے شرارت سے کہا تو زروہ مزید حیران ہو گئی۔

"ہاں بتاؤ، کہاں سے آئیں یہ تمام چیزیں؟" وہ روٹی بیلتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ مہک کے ساتھ سارہ اور سعیہ بھی ہنسنے لگیں۔

"آخر بات کیا ہے؟" زروہ اُلجھی۔

"آپی! اس کی فرینڈ پلوشہ ہے نا...... وہ اپنے ننھیال گئی تھی، ہنزہ۔ وہاں سے لائی ہے سب کے لئے گرین ٹی کے پیکٹ، خشک دودھ کے ڈبے اور ڈھیروں ڈرائی فروٹس کے پیکٹ۔"

"تم نے کیوں اس سے یہ سب چیزیں لیں؟" زروہ نے سنجیدگی کے ساتھ مہک کی طرف دیکھا تو وہ بوکھلا گئی۔

"آپی! اس نے سب فرینڈز کو دی ہیں تمام چیزیں...... بقول اس کے، نانی کی طرف سے سوغات ہے۔" مہک نے منمنا کر کہا تھا۔ زروہ خاموش ہو گئی تھی۔

اسے تحفے تحائف لینا دینا ناپسند نہیں تھا، مگر ان کے حالات اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ تحفوں کا لین دین کریں۔ کیونکہ یہاں تو روٹی کے لالے پڑے تھے، ایسی دوستیاں کہاں افورڈ ہو سکتی تھیں؟ تاہم اس نے مہک کو ڈانٹا نہیں تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ مہک کی اس دوست کے لئے بجٹ دیکھ کر کپڑا لا دے گی۔ سوٹ نہ سہی، دوپٹے پر بیلیں کاڑھ کر اسے گفٹ کر دے گی۔

"آپی! مبین بھائی بلا رہے ہیں۔" سعیہ نے اسے سوچوں کے گرداب میں پھنسا دیکھ کر آہستگی سے بازو ہلایا تھا۔

وہ روٹیاں ہاٹ پاٹ میں رکھ کر مبین کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ وہ نہ جانے چھت کی کڑیوں میں کیا تلاش کر رہا تھا۔ اسے اندر آتا دیکھ کر چونک گیا۔

"کیوں لائی ہو میری دوائیاں؟........مر نہیں جاؤں گا میں........اس ذلیل، منحوس کا کرایہ منہ پر مارنا تھا۔ آ جائے گا صبح صبح ذلیل و خوار کرنے۔" مبین نے چیخ کر کہا تھا۔
اس کی بھوری آنکھوں میں نہ جانے کون کون سے غم کی دراڑیں جھلک رہی تھیں۔ سفید رنگت میں زردیاں گھلی ہوئی تھیں۔ بھورے بال فراخ پیشانی پر بے ترتیب پڑے تھے۔ اتنا خوبرو بھائی چارپائی پر پڑا تھا۔ اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر گویا مسل ڈالا۔ ان کا اکلوتا لاڈلا بھائی۔ اپنی بہنوں کا مان۔

وہ اکنامکس میں ماسٹرز کر رہا تھا۔ یونیورسٹی میں تنظیم کے لڑکوں کی آپس میں لڑائی ہو گئی۔ جاگیرداروں کے بیٹے تھے۔ جھگڑے نے طول پکڑا اور دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے پر فائر کھول دیئے۔ نہ جانے کتنے گھروں کے چشم و چراغ بے گناہ موت کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ اور کچھ قسمت کے مارے بستر پر اپنی ذات کے لئے بھی بوجھ بن چکے تھے۔

مبین کی دائیں ٹانگ پر گولی لگ گئی تھی۔ دایاں بازو بھی متاثر ہوا تھا۔ بیس دن ہسپتال میں مبین کو رکھا۔ ڈاکٹرز نے آپریشن کیا جو کہ کامیاب ہو گیا تھا خوش قسمتی سے۔ اس مد میں اتنا قرضہ چڑھا کہ امی کا تمام زیور بیچ ڈالا۔ بینک میں موجود مختصر سی رقم بھی نہ رہی۔ اب تو نوبت فاقوں تک آ پہنچی تھی۔ گھر میں مناسب دیکھ بھال اور اچھا مہنگا علاج نہ ہونے کی وجہ سے مبین کی ٹانگ میں گھٹنے کے پاس زخم پھوڑے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ زخم میں نہ جانے کب سے پس اکٹھی ہوتی رہی تھی۔ مگر مبین نے ان سب کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ سارے درد اپنے دل پر جھیلتا رہا۔ ابھی تک چلنے پھرنے میں شدید دشواری کا سامنا تھا۔ بہ مشکل اٹھ کر باتھ روم تک جا سکتا تھا۔

بیماری، اذیت ناک جسمانی تکلیف اور مناسب خوراک نہ ہونے کی وجہ سے اس کی صحت بحال نہیں ہو رہی تھی۔ دن بہ دن وہ مزید چڑچڑا اور بدمزاج ہوتا جا رہا تھا۔

زروہ قریبی پرائیویٹ اسکول میں جاب کرتی تھی، فاخرہ کپڑے سلائی کرتی تھیں۔ جبکہ سارہ اور مبین گھر آئے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ ان کے اردگرد رہنے والے بھی انہی جیسے لوئر مڈل کلاس کے لوگ تھے۔ ان میں سے اکثر کو بچوں کی پڑھائیوں کا شوق چرایا تھا جس کی وجہ سے وہ سو ڈیڑھ سو کی ٹیوشن بخوشی افورڈ کر رہے تھے۔

کبھی کبھی سارہ چڑ جاتی تھی۔ اکثر ٹیوشن فیس بڑھانے پر اس کا امی کے ساتھ جھگڑا ہو جاتا تھا۔

"بیٹی! غربت کی زنجیروں میں جکڑے مجبور بے بس انسان کو اتنا پریشان نہیں کرنا چاہئے کہ تنگ آ کر وہ بچوں کے ہاتھوں سے کتابیں چھین لے۔ زیادہ کی ہوس تو ابنِ آدم کی سرشت میں شامل ہے۔" وہ اسے نرمی سے سمجھاتی تھیں۔ مگر سارہ کو کم ہی ایسی باتیں سمجھ میں آتی تھیں۔ اکثر زروہ کے سر ہو جاتی۔

"لو آپی! دیکھو نا، یہاں تو پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی اور امی کہتی ہیں، زیادہ کی ہوس نے ہمیں اُلجھا رکھا ہے۔"

"امی ٹھیک کہتی ہیں۔ ایک وقت کھانا مل جاتا ہے، اس پر صبر شکر ادا کیا کرو۔" زروہ بھی پیار سے سمجھاتی اور سارہ کو دراصل بڑی بہن کی باتیں ہی سمجھ میں آتی تھیں۔ وہ فرمانبرداری سے سر ہلانے لگتی۔

"کیا سوچ رہی ہو زروہ؟" مبین نے آہستگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ چونک کر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کچھ نہیں۔" وہ بے دلی سے مسکرائی تھی۔

"اگر میرے ساتھ اس وقت کوئی حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو ہمارے حالات مختلف ہوتے۔ کم از کم میری بہنوں کو مشقت تو نہ اٹھانی پڑتی۔" مبین نے رنجیدگی سے کہا۔

"سارے خواب ٹوٹ گئے ہیں زروہ!........اُمیدیں بھی دم توڑ چکی ہیں۔ کچھ باقی نہیں بچا۔ خالی دل اور خالی ہاتھ۔" مبین کے لہجے میں گئی رُتوں کے دکھ بول رہے تھے۔ دل اندر ہی اندر نوحہ کناں تھا اور لبوں پر خاموشی کے تالے۔

"پہلے بھی تو یہی معمولی سا مکان تھا مگر اتنے سناٹے ہرگز نہیں تھے۔ یاد ہے تمہیں زروہ! ہمارے گھر سے ہر وقت قہقہوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ مگر جب وہ دونوں چلی گئیں تو........"

"پلیز مبین! خاموش ہو جاؤ۔ زندگی کا پچھلا باب ختم ہوا۔ نئی کتاب زندگی ہے، کچھ نیا تحریر کرو اس پر۔ ہم لوگ بھول چکے ہیں خودغرض لوگوں کی تمام تر باتیں۔ ان کے ساتھ گزارے پل، لمحے، وہ وقت۔ جو بیت گیا سو بیت گیا۔ ماضی کی یادوں میں زندہ رہنے والے اپنے حال سے ہمیشہ ناخوش رہتے ہیں۔" زروہ نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

"مگر دل پر لگے زخم کیسے بھرتے ہیں؟" وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔
زروہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ نو سال پہلے کے کچھ دلکش، رنگین منظر اس کے ذہن کی

اسکرین پر لہرائے تھے۔ اس نے سختی سے سر جھٹک کر گویا یادوں کی زنجیروں سے خود کو آزاد کیا تھا۔ مبین کی روشن، چمک دار آنکھوں میں آج بھی اُس بے مروّت، سنگدل کا عکس لہرا رہا تھا۔

زروہ، مبین کے دُکھ کی شدت اپنے دل پر محسوس کر رہی تھی۔ وہ زروہ سے صرف تین برس چھوٹا تھا اور باقی تینوں سے بڑا۔ زروہ کے ساتھ اس کی بہت بے تکلفانہ دوستی تھی۔ اور وہی تو تھی، اپنے بھائی کے تمام تر رازوں کی امین۔

❁

''بہن جی! کسی کی شرافت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتے۔ میں آپ کی وجہ سے خاموش ہو جاتا ہوں۔ بڑی نیک خاتون ہیں آپ، سختی سے بات کرنے کو جی نہیں مانتا۔ مگر آپ خود سوچیے، آٹھ سو ماہانہ کرائے پر کون پاگل آپ کو مکان دے گا؟ مہنگائی کے اس دور میں جتنا پیسہ ہو، اتنا ہی کم لگتا ہے۔ میں اتنے امیدواروں کو ٹال رہا ہوں۔ حالانکہ وہ لوگ مجھے تین گنا زیادہ کرایہ دے رہے ہیں، مگر میں بھی مولوی صاحب مرحوم کی وجہ سے چپ کر جاتا ہوں کہ کیسے ان کے بیوی بچوں کو مکان سے نکلوا کر گنہگار ہو جاؤں۔ آپ خود ہی سوچیے، زروہ سے بات کی تھی مگر مجال ہے جو کرایہ ابھی تک مجھے ملا ہو۔'' روفی چاچا بڑی نرم آواز میں شائستگی کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ رہا تھا۔ سارہ اور زروہ اُس کی بھدی آواز بآسانی سن رہی تھیں۔ غصے کے مارے رواں رواں سلگ رہا تھا، مگر امی کا اشارہ سمجھ کر وہ دونوں خاموش ہو گئی تھیں۔

''بھائی صاحب! یہ تو آپ کی عنایت اور مہربانی ہے۔ اب آپ کو زحمت نہیں دیں گے۔ آج شام تک کرایہ آپ کے گھر پہنچا دوں گی۔ صرف چند گھنٹے مزید انتظار کر لیں۔'' انہوں نے پردے کے پیچھے نرم مگر تھکی تھکی آواز میں جواب دیا تھا۔ روفی چاچا بدمزا سا ہو کر واپس پلٹ گیا۔

''شکر ہے، بلا ٹل گئی۔'' سارہ کی زبان پر کھجلی ہوئی تھی۔

''بری بات بیٹا! بزرگوں کو اس طرح نہیں کہتے'' فاخرہ نے نرمی سے سرزنش کی تو سعیہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''امی! روفی چاچا خود کو بزرگ نہیں بلکہ شان سمجھتے ہیں۔''

''وہ کون ہے؟'' فاخرہ نے حیرانی سے پوچھا تو ان سب کی ہنسی ارد گرد بکھر گئی۔ مبین بھی چونک گیا تھا۔

''وہ فلموں میں کام کرتا ہے امی!'' زروہ نے ہنسی دبا کر بتایا تو انہوں نے خفگی سے ان سب کی طرف دیکھا۔

''یہ تربیت کی ہے میں نے تم لوگوں کی؟ ایک شریف، معزز باپ کی عمر کے بندے کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔''

''سوری امی! مگر دیکھئے نا، روفی چاچا خود کو کب بزرگ کہلوانا پسند کرتے ہیں؟ بلکہ وہ تو کہتے ہیں کہ انہیں چاچا بھی نہ کہا جائے۔'' سارہ نے ماں کی ناراضگی دور کرنے کی غرض سے تفصیلاً جواب دیا تھا۔

''بھائی رؤف کی تو مت ہی ماری گئی ہے۔ دو بیویاں بھگتا کر تیسری کے چکر میں ہے۔''

اسی پل قمری خالہ نے دروازے میں جھانکا تھا۔ شاید انہوں نے روفی چاچا کی تعریف سن لی تھی۔

''کپڑے سل گئے فاخرہ بیٹی؟''

''جی خالہ! آ جائیں اندر........ چائے وغیرہ پی لیں۔'' فاخرہ نے حلاوت سے مروّت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہا تھا۔ حالانکہ جانتی بھی تھیں کہ گھر میں اس وقت دودھ نہیں ہے۔

''نہ بیٹی! ابھی جلدی میں ہوں۔ بچیوں نے شادی کی دعوت میں جانا ہے۔ کبھی فرصت میں آ کر بیٹھوں گی۔ یہ پیسے گن لو، پورے پندرہ سو روپے ہیں۔ تکیوں اور رضائیوں کے لحاف پھر لے جاؤں گی۔'' انہوں نے بھی محبت سے جواب دیا اور دروازہ بند کر کے چلی گئیں۔

''بڑی بھلی خاتون ہیں قمری خالہ۔'' فاخرہ، بچیوں کو بتا رہی تھیں۔

بیوگی کے بعد کا عرصہ، اپنی مشقت بھری زندگی کی کہانی سناتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ انہوں نے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا تھا اور ایک پرائمری اسکول میں پرنسپل رہی تھیں۔ پچھلے تین سالوں سے ریٹائرڈ ہو چکی تھیں۔ مبین کے سانحے کے بعد انہوں نے سلائی مشین سنبھال لی تھی۔ زروہ نے اپنی ماں کو ہر حال میں صبر اور شکر کرتے دیکھا تھا۔ آج تک ان کے لبوں پر کبھی شکوہ کا لفظ نہیں آیا۔

فاخرہ کی پنشن اور زروہ، سارہ کی ٹیوشنز کی وجہ سے اچھی خاصی گھر کی گاڑی چل رہی تھی۔ مگر مبین کے علاج کی وجہ سے ان کے مالی حالات بدترین ہو چکے تھے۔

"قمری خالہ نے بہت ساتھ دیا میرا۔" فاخرہ بتا رہی تھیں۔

"تمہارے ابو کی وفات کے بعد قمری خالہ کے دلاسے اور تسلیاں ہی تھیں، جنہوں نے میرے بکھرے حوصلے بحال کیے۔ میں اسکول چلی جاتی تھی اور قمری خالہ تم لوگوں کے پاس آ جاتی تھیں۔ کبھی کھچڑی پکا دی، کبھی کھیر بنا کر کھلا دی، گھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹا دیئے۔ مہک اور سمیہ کو تو انہوں نے ہی سنبھالا تھا۔

"اسی لئے تو میں ان سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔" مہک نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا۔

"امی! جو میں نے قمری خالہ کے لئے سویٹر بنایا ہے، وہ میں نے ابھی نہیں دینا بلکہ ان کی بہترویں سالگرہ پر دینا ہے۔" سمیہ نے فاخرہ کو بتایا تھا۔

ادھر قمری خالہ، کپڑوں کا شاپر اٹھائے گلی کی نکڑ پر آئیں تو مونچھوں کو بل دیتے رونی پر نظر پڑی۔ حسب توقع قمری خالہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"وے بھائی رونی! تجھے گھر والے گھسنے نہیں دیتے کہ بہو نے گھر سے فارغ کر دیا ہے؟ ناس مارے! ہر وخت (وقت) دھوپ میں سڑتا رہتا ہے۔ کبھی گھر میں بھی ٹِک جایا کر۔ بچیوں کے اسکول کا وخت ہے اور تو آوارہ لونڈوں لپاڑوں کی طرح گلیوں کی نکڑوں میں کھڑا دیدے پھاڑ سگریٹ پھونکتا رہتا ہے۔" قمری خالہ نے بلند آواز میں رونی چاچا کو لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔ رونی نے کڑوا سا منہ بنا لیا، گویا بادام چبا لئے ہوں۔ وہ بھی کڑوے کسیلے۔

"خالہ! تم میری ماں کی بھی خالہ لگتی ہو۔ اور مجھے کہہ رہی ہو بھائی۔ واہ واہ، عورتیں بڑھاپے میں بھی عمر چور رہتی ہیں۔ مجھے برا نہیں لگا خالہ! تمہارا بھی قصور نہیں۔ یہ تو عورتوں کی فطرت ہوتی ہے، فلمساروں کی طرح کم عمر بننا۔" رونی نے ایک بے ڈھنگا قہقہہ لگایا تھا۔

قمری خالہ نے ناگواری سے رونی کی طرف دیکھا۔

"سارا جہان تجھے رونی بھائی اور رونی چاچا کہتا ہے، مگر تجھے بھی عزت راس نہیں آتی۔"

"خالہ! کاہے کو غصہ کرتی ہو؟........ اچھا یہ بہو کا طعنہ بھی خوب مارا ہے۔ اب اس لونڈے کو کون سمجھاتا، جس نے سترہ سال کی عمر میں میری جان کھا ماری تھی کہ بیاہ کر دو ابا! ورنہ زہر کی پڑیا نگل لوں گا۔ اب بتاؤ خالہ! میری بھلا عمر ہی کیا تھی، بہو والا بھی بن

چکا ہوں۔" رونی نے رنجیدگی سے کہا اور مسکرایا۔

"ہاں، تیری عمر تو سہرے باندھنے والی ہے نا۔" انہوں نے جل کر کہا تھا۔

"خالہ! دعا کر، پھر سے گھر بن جائے۔ یجی، وہ ڈی ایس پی کی سوانی (بیوی) روٹی تک پکا کر نہیں دیتی۔ گھر والی کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔" رونی نے رونی صورت بنائی۔

"شکر ہے، تجھے بھی قدر آئی گھر والی کی۔ ورنہ دونوں کم بخت سڑتی بلتی دنیا سے گئی ہیں۔"

"خالہ! کوئی رشتہ ڈھونڈو نا۔" اس کا اشارہ کس طرف تھا، وہ جان چکی تھیں۔ اسی لئے دل میں دو چار گالیوں سے بھی نوازا۔ تاہم ظاہر کچھ نہیں ہونے دیا تھا۔

"تو کر لو کسی بیوہ، مطلقہ سے۔ ثواب بھی کما لو گے۔ ساری زندگی لوگوں کی بددعائیں اکٹھی کی ہیں۔" انہوں نے جل کر کہا۔

'لعنت ہو تم پر بڈھے شیطان! کروں گی بات فاخرہ سے کہ اس مردود سے محتاط رہے۔' وہ بڑبڑاتی ہوئی تاریک گلی میں مڑ گئی تھیں۔

❁

"بابا صاحب! چائے۔" ایک مترنم، شفاف گھنٹیاں بجاتی آواز سنائی دی تھی۔

"ادھر رکھ دو بیٹے!" انہوں نے اپنے دھیان سے چونک کر کہا تھا۔

"بابا صاحب! فارغ ہیں تو آ جاؤں میں؟" اس نے نرمی سے اجازت لینے والے انداز میں کہا تھا۔ ان کا اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر وہ اندر چلی آئی تھی۔ فرشی دری پر ان کے مقابل احترام سے بیٹھتے ہوئے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر شاید مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی تھی۔

"کیا بات ہے میرے بچے؟...... کیا بولنا چاہتی ہو؟" انہوں نے سابقہ انداز میں آنکھیں موندے نرمی سے کہا تھا۔

"کیا بولوں بابا صاحب! آپ نے کون سا میری بات مان لینی ہے؟" اس نے آہستگی سے ناراضگی بھرے انداز میں کہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں بچے!"

"کہاں ٹھیک ہیں۔ دوائیاں سب ختم ہو چکی ہیں اور آپ کے چیک اپ کی ڈیٹ بھی قریب آ چکی ہے۔ مگر آپ کا ارادہ نہیں لگتا شہر جانے کا۔" وہ خفگی سے انہیں یاد دہانی کروا رہی تھی۔

''عبدالباری خود دیکھ لے گا آپ کو۔''

''درمکنون! میرا وجود دنیاوی خوشیوں اور تکلیفوں سے آزاد ہو چکا ہے میرے بچے! تم اپنی تسلی کے لئے مجھے ڈاکٹروں کے پاس لے جاتی ہو اور میں تمہارا دل رکھنے کے لئے چل پڑتا ہوں۔ حالانکہ مجھے کسی دوائی کی ضرورت نہیں۔ مجھے اس کی رحمت بے کراں نے خوب بھر بھر کر جامِ معرفت پلائے ہیں۔ ساغر پر ساغر آتے رہے اور میں عشقِ الٰہی سے سرشار خوب خوب سیراب ہوتا رہا اور میں اپنے پلانے والے سے ہر رات، ہر پل، ہر لمحہ یہی التجا کرتا ہوں، یہی درخواست کرتا ہوں۔ رات کے دوسرے پہر روتا ہوں، گڑگڑاتا ہوں کہ اے میرے پلانے والے! مجھے سیراب کرنے والے! مجھ پر اور اپنا کرم کر اور مجھ پر فضل کر۔ میں نے ہر آفت، مصیبت، رنج، حادثہ، تکلیف اور مشقت میں صبر کیا ہے۔ میں نے صبر سے بڑھ کر اپنا دوست کسی کو نہیں پایا۔ میں نے دنیا کی طلب عرصہ ہوا چھوڑ دی ہے۔ مگر اس دل کا کیا کروں میرے مالک! جو اس سے ملنے کو، ایک مرتبہ ملنے کو تڑپتا ہے۔ ان آنکھوں کا کیا کروں، جو آخری مرتبہ صرف اسی ایک چہرے کو دیکھنا چاہتی ہیں، جس کا تصور مجھے رات رات بھر جگائے رکھتا ہے۔ وہ جو میری دعا کے حصار میں ہے، کیا اس محبت کی آنچ اس تک نہیں پہنچی؟ یہ محبت جو میرے دل میں اس کے لئے ہے، کیا اس تک میری محبت نے رسائی نہیں پائی؟''

وہ ایک مرتبہ پھر اپنے دھیان گیان میں گم ہو چکے تھے۔

درمکنون پچھلے ساڑھے تین سالوں سے انہیں اسی طرح دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹھیک ٹھاک باتیں کرتے کرتے نہ جانے کہاں کھو جاتے تھے۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

درمکنون خاموشی سے اُٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب بابا صاحب کو ڈسٹرب نہیں کرنا۔ یہی ان کا معمول تھا، جو وہ پچھلے ساڑھے تین سالوں سے دیکھ رہی تھی۔ آج کی شام اور پوری رات کے بعد نئی سحر کے طلوع ہوتے ہی وہ بالکل پہلے والے بابا صاحب بن جاتے تھے۔ تہجد کے وقت ان کی خوب صورت آواز میں قرأت درمکنون کے اندر ایک نئی قوت اور سرشاری بھر دیتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا کوئی بہت میٹھی اور خوشبودار چیز اس کے اندر سرایت کرنے لگی ہے۔

بابا صاحب کی آواز بہت خوب صورت تھی اور جب وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور بلند آواز میں ترجمہ پڑھتے تو جی چاہتا تھا، ساکت کھڑے بس انہیں سنتے رہیں۔ معمول کے مطابق صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔ درمکنون نے سیپارہ پڑھنے والی بچیوں کو

فارغ کرنے کے بعد ناشتہ بنا کر بابا صاحب کو بھجوایا۔ کچھ دیر بعد اسکول پڑھنے والی بچیاں بھی آ گئی تھیں۔

''علم کو اپنے سینوں میں دفن مت کرو۔ اسے جہاں تک ہو سکے، لوگوں تک پہنچاؤ۔ میرا جی چاہتا ہے، درمکنون! کہ اس بستی کی ہر بچی علم کے زیور سے آراستہ ہو۔ دینی اور دنیاوی علم اسے شعور اور آگہی دے۔ جہالت ایسا زنگ ہے جو دلوں کو کھردرا اور بے جان کر دیتا ہے۔''

ایک مرتبہ بابا صاحب نے درمکنون سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا اور یونیورسٹی آف پنجاب کی پوزیشن ہولڈر درمکنون نے ان کی خواہش کو پلّو سے باندھ لیا تھا۔

''اے جاہل! علم حاصل کر کہ علم کے بغیر عبادت اچھی نہیں۔'' چند دن پہلے وہ اپنے ایک شاگرد کو نرمی سے ڈانٹ رہے تھے اور درمکنون نے ان کے ہر لفظ کو ذہن میں کسی قیمتی متاع کی طرح محفوظ کر لیا تھا۔

''بی بی صاحب! بابا صاحب سے ملنے کوئی بابا جی شہر سے آئے ہیں۔ مینارِ پاکستان والے شہر سے۔'' مریم نے آ کر اسے صحن میں پیغام دیا تھا۔ اس نے مریم کو باہر بھیجا تاکہ مہمان کو لے آئے اور خود بابا صاحب کے کمرے سے ملحقہ کمرے میں پہنچ گئی۔

یہ کمرہ اس کے زیرِ استعمال بھی تھا اور اس کے ایک کونے میں کچن کا سامان بھی ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔ یعنی کہ یہ کمرہ بیک وقت کچن اور بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دونوں کمروں کے وسط میں لکڑی کا مضبوط دروازہ تھا، جو کہ دن کے وقت اکثر کھلا رہتا تھا۔ دروازے کے سامنے دبیز پردہ لٹک رہا تھا تاکہ اندر کا منظر نظر نہ آئے۔

''سلام بابا صاحب!'' کسی اجنبی بزرگ کی آواز سنائی دی تھی۔ ''میں پہلے بھی حاضر ہوا تھا۔ اپنے پوتے کے لئے دعا کروانی ہے۔ بہت بیمار رہتا ہے جی! میری زندگی کی کل پونجی ہے میرا پوتا۔'' بابا جی کی آواز میں نمی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید وہ رو رہے تھے۔ درمکنون نے چائے بناتے ہوئے سوچا۔

''اللہ سے مانگا کرو لوگو!...... کیوں گناہگار کرتے ہو؟ کیا کبھی اس باری تعالیٰ نے تمہیں مایوس لوٹایا ہے؟'' انہوں نے بے حد رنج کے عالم میں پوچھا تھا۔

''نن...... نہیں بابا صاحب!''

''دعا کیا کرو۔ دعا میں بہت تاثیر ہے۔'' وہ حلاوت سے کہہ رہے تھے۔

''غریب آدمی ہوں۔ مصیبتوں کا مارا ہوا۔ علاج بہت مہنگا ہے۔ شہر میں ایک کوٹھی

میں کام کرتا ہوں۔ اس بڑھاپے میں بھی کوئی آرام نہیں۔"

"علماء اور دانا فرماتے ہیں کہ مصائب کے ہجوم کی وجہ سے اللہ کا در مت چھوڑ۔ ہاں، بس یہی دعا کر اپنے پروردگار سے کہ وہ تجھے آزمائش میں نہ ڈالے جو تیری برداشت سے باہر ہو۔ کیونکہ آزمائش میں کوئی کوئی پورا اترتا ہے۔ یہ ایسی بھٹی ہے، جس میں کندن کوئی کوئی بنتا ہے۔" ان کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔

اندر بیٹھی درمکنون تصور کی آنکھوں سے بابا صاحب کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے چائے بنا کر بچی کے ہاتھ اندر بھجوائی اور خود باہر جانے کے بجائے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندے بیٹھ گئی۔

"آپ نے سچ کہا ہے بابا صاحب! کہ آزمائش میں کوئی کوئی پورا اترتا ہے۔" اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

"جس کو چاہے رفعت دے، جس کو چاہے پستی۔ جس کو چاہے عزت بخشے، جس کو چاہے ذلت۔ جس کو چاہے معزول کرے، جس کو چاہے بحال کرے۔ جس کو چاہے تونگر بنائے، جس کو چاہے مفلس۔" بابا صاحب کہہ رہے تھے اور وہ مسلسل بے آواز رو رہی تھی۔ اس کی سیاہ چادر آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

"اس نے مجھے رفعت عطا کی اور میں نے پستی کا انتخاب کر لیا۔ اس نے مجھے عزت بخشی اور میں نے ذلتوں کے ہار گلے میں ڈال لئے۔ اس نے مجھے نوازا، اتنا نوازا کہ مجھے گندی گلیوں سے اٹھا کر محل عطا کر دیا۔ اور میں نے اپنی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے سب کچھ کھو دیا۔ میں نے کھو دیا سب کچھ۔ میں کتنی خالی ہاتھ ہوں، کس قدر مفلس ہوں میں۔ کچھ بھی نہیں میرے پاس۔ محبت بھی نہیں۔ اے کاش! میرے پاس کچھ بھی نہ رہتا، مگر اس ایک شخص کی محبت قائم رہتی۔ میں آج بالکل قلاش ہوں، میرے پاس کسی کی محبت کے بے انتہا قیمتی سکے تھے، جنہیں میں نے نفس اور خواہشوں کے پیچھے گنوا دیا ہے۔" اس نے سر دیوار سے پٹخا اور اذیت سے کراہی۔

"میں نے تمہاری محبت کی قدر نہیں کی تھی، اسی لئے آج بھی بے سکون ہوں۔ اس سکون کی تلاش نے مجھے در در بھٹکایا ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔

"بی بی صاحب! یہ برتن کہاں رکھوں؟" مریم کی آواز سن کر وہ چونک اٹھی تھی۔ سرعت سے آنسو صاف کئے اور آہستگی سے بولی۔

"یہیں رکھ دو۔ دھولوں گی۔"

"اجازت دیں بابا صاحب! پھر آؤں گا۔" مہمان شاید اجازت طلب کر رہا تھا۔

اسی پل بابا صاحب نے مکرم کے ہاتھ پیغام بھیجا۔

"بابا صاحب کہہ رہے ہیں، دس ہزار روپے ہیں۔"

درمکنون نے مطلوبہ رقم مکرم کو پکڑا دی تھی۔ وہ جانتی تھی، یہ پیسے مہمان کو دینے کے لئے منگوائے ہیں۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ آج تک کوئی خالی نہیں گیا تھا۔ چاہے کوئی ایک مرتبہ آئے یا ایک ہزار مرتبہ، ضرورت کے مطابق بابا صاحب ہر سوالی کی امداد کرتے تھے اور درمکنون بے حد پریشان ہوتی تھی کہ بابا صاحب کے پاس اتنے پیسے نہ جانے کہاں سے آتے ہیں۔ ان کے بینک اکاؤنٹ میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں روپے موجود تھے اور ان کا معیارِ زندگی اس قدر سادہ۔

"اس یک طرفہ ناراضی نے مزید کتنے دن برقرار رہنا ہے؟" پچھلے ایک ہفتے سے وہ گھر نہیں آیا تھا۔ لنچ کرنے کے بعد وہ اپنے بیڈ روم میں آئی تو زیان پہلے سے موجود تھا اور کسی سے فون پر گفتگو فرمائی جا رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر زیان نے فون بند کر کے رخ روشن اس کی طرف کر لیا تھا۔

"اونہہ........ تمہیں پروا ہے کسی کی ناراضی کی۔ ایک ہفتے بعد یاد آئی ہوں میں۔" عنوہ نے جل کر سوچا تھا۔

"میرے محبوب کی پیشانی پر یہ نازک سلوٹیں مجھے باخبر کر رہی ہیں کہ مادام ہمیشہ کی طرح انگارے چبا رہی ہیں۔" اس کی رگ ظرافت ہمہ وقت پھڑکتی رہتی تھی۔

"کس قدر بے حس انسان ہے۔ ایک بیوی کی روح زخمی کی ہے اور دوسری کا جسم۔ مگر شرمندگی نام کی کوئی چیز نہیں جھلک رہی اس فریش چہرے پر۔" اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔ اسے وہ ذلت یاد آ رہی تھی، جو اس گھر میں داخل ہونے کے دوسرے روز اسے کسی ایوارڈ کی طرح ملی تھی، بغیر خواہش کے۔ اسے دوسری بیوی کا طعنہ گالی کی طرح ہی لگا تھا۔ وہ جو فخر اور غرور "من چاہی" بیوی کا تھا، پل بھر میں ہی خاک ہو گیا۔

"اے شعلہ خاتون! انگارہ بدن! اے میری لالہ رو، نازک اندام زوجہ محترمہ! کاہے کو جل جل کر خون جلاتی ہو؟ کھاؤ پیو اور عیش کرو ہمارے ہمراہ۔ اِدھر اُدھر دیکھنا چھوڑ دو۔ یہ ہمدردیاں تمہیں مہنگی نہ پڑ جائیں۔ سب اپنے اپنے کیے کا بھگتان بھگت رہے ہیں۔ کسی نے کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ جس نے جو بویا، وہی کاٹتا ہے۔ یہ عمل کا

ردِعمل ہے۔'' وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے بہت کچھ باور کرا چکا تھا۔ مگر یہ گتھی سلجھنے کے بجائے مزید اُلجھتی چلی گئی۔

''میں تمہاری بات سمجھی نہیں۔'' اتنا تو وہ جان چکی تھی کہ درپردہ وہ رانیہ کے متعلق بات کر رہا ہے۔ اسی لئے اس کی بے چینی اور اُلجھن مزید بڑھ گئی۔

''تمہیں سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ جو تمہارا کام ہے، وہی کرو۔ یعنی ہمارا جی بہلانے کا۔ اب فضول باتیں کر کے میرے اچھے بھلے موڈ کا بیڑہ غرق مت کرنا۔'' اس نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔

''پہلے ہی ایک ہفتے بعد نظر آئی ہو۔ خود کو زینت دو، سجاؤ بناؤ...... آرائش و زیبائش کرو...... ہمارے آگے پیچھے پھرو۔ ظالمو! دل بہلانے کا کوئی سامان تو کرو۔'' وہ مسکرایا اور پھر دو قدم کے فاصلے کو مٹا کر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ دوسرے ہی پل وہ اس کی بانہوں میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔

''عورت اپنے مرد کے لئے خوشی ہوتی ہے یعنی کہ اسے خوش کرنے والی، راضی کرنے والی...... ادائیں دکھا کر دل کو لبھانے والی۔ میں تمہارے عشق میں منتہیٰ یعنی بلندیٔ عشق کی آخری حد تک پہنچا ہوں۔ مجھے اپنی محبت کی زنجیروں میں باندھ دینا عنوہ! میں کسی اور جزیرے کو دریافت کرنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ اتنا یقین رکھنا کہ میرے ہارٹ کے ریجن (علاقے) میں دور دور تک صرف تمہارا قبضہ ہے۔ یہاں کوئی دوسری عورت فتح کے جھنڈے نہیں گاڑے گی۔ ہم آل ریڈی اس جاگیر کو تمہارے نام لکھ چکے ہیں۔ ہاں، اگر اِدھر اُدھر منہ مارا بھی تو خفا مت ہونا۔ کیونکہ لوٹ کے بدھو ہمیشہ گھر کو ہی آتے ہیں۔'' اپنی محبت کی شدتیں لٹاتا وہ آخر میں حد درجہ شرارتی انداز میں اسے چھیڑتے ہوئے بولا تھا جبکہ عنوہ نے تو دل تھام لیا تھا۔

'یعنی کہ میری موجودگی میں بھی اِدھر اُدھر منہ مارنا۔ اور پھر وہ جو اوپر زندہ حقیقت موجود ہے۔ مائی گاڈ!' اس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا تھا۔ غصے کے مارے بھنوئیں تن گئیں۔ احساسِ توہین سے آنکھوں میں سرخی چھا گئی۔ اس نے شدید غصے کے عالم میں زیان کی بانہوں کے حلقے کو توڑنا چاہا۔

''صد افسوس، میری گولڈن چڑیا! اس مضبوط فولاد کے پنجرے میں محض پھڑ پھڑا ہی سکو گی۔ جانم! نہ اتنا زور آزماؤ۔ کہیں ہڈی وڈی نہ تڑوا لینا۔'' اس نے عنوہ کے چہرے پر جھک کر ایک اور لطیف سی، بھرپور شرارت کر ڈالی تھی۔ اس کو ستانے جلانے میں زیان

کو بہت مزہ آ رہا تھا۔ اس نے بازوؤں کو مزید کس کر زوردار جھٹکا دیا تو عنوہ کی چیخ نکل گئی۔

''ظالم، جنگلی، وحشی۔''

''اور بھی کچھ کہو۔ خاموش کیوں ہو گئی ہو......؟'' وہ اس پر جھکے جھکے پوچھ رہا تھا۔

عنوہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اس وقت وہ اسے غصے سے گھور بھی نہیں سکتی تھی۔ زیان اس کی بے بسی پر کھل کر مسکرایا۔

''یہ کہو نا۔ حیا، شرم، لاج، غیرت وغیرہ آ رہی ہے۔ یہ رخساروں کی سرخی، یہ گالوں کی گلابیاں، یہ جھکی جھکی نظریں...... میری گناہ گار آنکھوں نے کیسے کیسے حسین منظر دیکھنے تھے۔'' زیان نے اس کے بالوں کو جھٹکا دیا تو وہ ایک دم چلائی۔

''چھوڑو مجھے۔ اب مجھے چھوا تو پھر دیکھنا۔''

''اس مزاحمت کی وجہ سمجھ نہیں سکا میں۔'' وہ آنکھیں سکیڑ کر حیرانی سے بولا۔

''اونہہ...... جان کر انجان بننے کی ایکٹنگ۔ وجہ تو اوپر موجود ہے۔'' اس نے سلگتے ہوئے کہا۔ زیان چند پل اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر ایک دم ہی پیچھے ہٹ کر تکیے دبوچے نیم دراز ہو گیا۔

''کوئی اور مضبوط دلیل پیش کرو۔ میں اس وجہ کو تسلیم نہیں کرتا۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''آپ تسلیم نہ کریں۔ کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ رانیہ آپ کی بیوی ہے؟ وہ آپ کے نکاح میں ہے؟...... اس گھر میں وہ موجود ہے۔ کس حیثیت سے؟'' عنوہ آگ بگولا ہو گئی تھی۔

''اس نے مجھے سچائی بتائی اور تم نے اسے بے دردی سے مارا، تشدد کیا اس پر۔ ظلم کی کوئی حد بھی ہے کہ نہیں؟ اور رہی میں تو میرے نقصان کا خسارہ کون پورا کرے گا؟ میں اس عظیم دھوکا دہی کا مقدمہ کس عدالت میں پیش کروں؟'' وہ چلا چلا کر بول رہی تھی۔ مگر مقابل ہنوز پُرسکون، جذبے لٹاتی نگاہوں سے دیکھ کر اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

''میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔ تمہاری ماں سب جانتی ہے۔ میرا ماضی اور حال کھلی کتاب کے مانند ہے۔ کم از کم تمہاری ممی میری پوری ہسٹری سے واقف ہیں۔ اب تمہاری ماں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تو اس میں میرا کیا قصور؟''

''کیا ممی جانتی تھیں کہ زیان شادی شدہ ہے اور اس کی پہلے سے ایک بیوی موجود ہے؟' عنوہ نے دکھ کی ایک تیز لہر من میں اُترتی محسوس کی تھی۔

''مم........ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ چلی جاؤں گی میں یہاں سے۔'' اس نے ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ ''مجھے کسی کی سیکنڈ چوائس نہیں بننا۔'' وہ زہرخند ہوئی۔

''مان جاؤ عنوہ ڈیئر! کہ تم زیان عیث کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہو۔ تمہیں بہت جیلسی فیل ہو رہی ہے نا، رانیہ سے؟'' وہ پُریقین لہجے میں تفاخر سے کہہ رہا تھا۔

''بھاڑ میں جاؤ تم بھی اور رانیہ بھی۔'' وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی تھی۔ زیان مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔ عنوہ سوں سوں کرتی سرعت سے اٹھی اور وارڈ روب سے اپنا پرس نکال لائی۔

'رانیہ بے چاری کا کیا قصور ہے؟ اصل فساد کی جڑ تو یہ ہے۔ ہر اچھی شکل دیکھ کر ریجھ جاتا ہے۔' اس نے دل ہی دل میں رانیہ سے سوری کیا اور زیان کی طرف پلٹتے ہوئے پھنکاری۔

''میں تمہاری اس نام نہاد محبت پر لعنت بھیجتی ہوں۔ محبت کے دھوکے میں نہ جانے کس کس کو برباد کیا ہے۔''

''محبت کے دھوکے میں تو میں برباد ہوا تھا۔ میں اپنا کیس کس عدالت میں پیش کروں؟'' وہ سلگتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا تھا۔

''میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔ میں ہر لحاظ سے فیئر تھی۔ مگر میری بدقسمتی، ایک کرپٹ شخص میرے نصیب میں لکھا تھا۔'' اس نے زہرخند لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ زیان اسے جاتا دیکھ کر بھی نہیں اٹھا تھا بلکہ اطمینان سے ٹانگیں ہلاتا رہا۔

''میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے تم جیسی صاف، شفاف بے داغ کردار کی مالک بیوی ملی۔ ایک شریف النفس عورت، مرد کی پوری زندگی کا نادر و نایاب اثاثہ ہوتی ہے۔ جس کے پاس باکردار، باحیا بیوی نہیں، میرے نزدیک اس مرد سے بڑھ کر قلاش کوئی نہیں۔ تمہارے جیسے پارس ہماری سوسائٹی میں ملنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہیں۔ اور میں احمق اس عشبہ گوہر (قیمتی موتی) کی تلاش میں نہ جانے کن کن تنگ و تاریک گلیوں میں بھٹکتا رہا تھا۔ اسے پارس سمجھ کر ہاتھ لگایا تو جانا کہ وہ تو صرف نظر کا دھوکا تھی، انگارہ تھی۔ جلا کر راکھ کر دیا اس نے۔ ہر گوہر شب تاب اصل لعل نہیں ہوتا........ گھاٹ

گھاٹ کا پانی پیا ہے، اتنی سمجھ تو آ چکی ہے۔ ویسے ہماری سوسائٹی میں کچھ بھی خالص ملنا بہت مشکل ہے۔ شراب ہو یا عورت، سب ملاوٹ شدہ۔''

وہ سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے عنوہ کو دروازے کی ناب سے اُلجھتا بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ جھنجلاتے ہوئے دروازہ کھولنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

''جان عنوہ! یہ لاک آپ نہیں کھول سکیں گی۔ اس کوٹھی کے تمام لاک ریموٹ سے کھلتے ہیں جانم! نہ اپنی جان جلاؤ۔ اس حسین زندان سے نکلنا بہت مشکل ہے۔ خود کو کیوں خوامخواہ اُلجھاتی ہو؟........ دوسروں کی خاطر خود کو اذیت دینا کہاں کی عقل مندی ہے؟ رانیہ کے لئے جگہ خالی کرتے ہوئے خود کو مصیبت میں نہ پھنسا لینا۔ اتنی سی بات تمہاری عقل میں نہیں سما رہی کہ اگر رانیہ کی جگہ اس دل میں ہوتی تو وہ تم سے پہلے اس بیڈ روم میں موجود ہوتی۔ تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ میں اپنا ڈیسیژن خود لیتا ہوں۔ اگر میں نے رانیہ کو پہلو میں بٹھانا ہوتا تو تمہیں یہاں کیوں لاتا؟''

وہ دل جلانے والی مسکان لبوں پر سجا کر بول رہا تھا۔ عنوہ ٹھٹک کر واپس پلٹی اور تھکے تھکے قدم اٹھاتی صوفے کی طرف بڑھ گئی۔

''اوں، ہوں........ وہاں نہیں، یہاں آؤ۔'' اس نے تحکم بھرے لہجے میں کہا تھا۔

فرار کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ وہ اسے فاتحانہ مسکراتے دیکھ رہی تھی۔

''میری بے بسی کا اُڑا لو مذاق۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''ہماری جنونی محبت کو مذاق سمجھ رکھا ہے۔'' وہ عنوہ کو اپنے حصار میں لیتے ہوئے گمبھیر جذبوں سے بوجھل آواز میں کہہ رہا تھا۔

❁

''بابا صاحب! عبدالباری آئے ہیں، زمینوں کا حساب لے کر۔'' مکرم نے مؤدب لہجے میں اطلاع دی تھی۔

''اندر بھیج دو، باری کو۔ اور ہاں، در مکنون سے کہو، باری کے لئے کھانا تیار کرے۔'' انہوں نے اپنی مخصوص نرم آواز میں کہا تھا۔

کچھ دیر بعد عبدالباری کمرے میں داخل ہوا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد، مضبوط بدن، تیکھے نقوش، صاف رنگت والا خوبرو نوجوان۔

یہ تھی اللہ کی طرف سے تحفے میں ملی نعمت۔ جس کی شرافت، نجابت، ذکاوت کے

چرچے تھے۔ ان کے ہاتھوں سے پرورش پانے والا مضبوط وجود، جسے انہوں نے انابت، زہد، ورع، توکل، قناعت اور صبر کا درس دیا تھا۔ ان کا کل سرمایہ اور قیمتی اثاثہ عبدالباری تھا۔ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون۔

ایسے بیٹے باپ کا فخر ہوتے ہیں۔ جب قدم سے قدم ملا کر چلیں تو گردنیں اونچی ہو جائیں۔ سینے کی گرمی اور قلب کا چین۔

'کتنے بدنصیب ہیں عبدالباری کو پیدا کرنے والے ماں باپ اور کتنا خوش نصب ہوں میں جسے اس وجود کا سہارا ملا۔' انہوں نے چمکتی آنکھوں سے سامنے بیٹھے باری کی طرف دیکھ کر سوچا۔

'وہ اپنے اصل کی کھوج میں تھا۔ اور بابا صاحب اسے کیا بتاتے کہ جو راز سینوں میں دفن ہیں، انہیں یوں ہی دفن رہنے دو۔ آگہی کا عذاب نرا زہر ہے۔ پورے وجود کو نیلا کر دے گا۔ سچ بھی اور حقیقت بھی۔ جس راز کی پردہ پوشی اللہ نے کر دی ہے، اسے میں کون ہوتا ہوں فاش کرنے والا۔ مت بھٹکو میرے بچے! اپنوں کی تلاش میں۔ نرا خسارہ ہے۔ نرا نقصان۔ کھو جاؤ گے بے حس لوگوں کے ہجوم میں۔ خالص پن دیا ہے میں نے تمہیں۔ تم کیا جانو، کتنی مجبور ہو گئی تھی تمہاری ماں۔'

''بابا جان! کیا سوچ رہے ہیں؟'' عبدالباری کی بھاری دھیمی آواز نے انہیں سوچوں کے حصار سے کھینچ نکالا تھا۔

''بیٹے! اس عمر میں بولنے سے زیادہ سوچنا اچھا لگتا ہے۔ یہ بتاؤ، کیسا رہا ٹور؟''

''بابا صاحب! توقع سے زیادہ منافع ملا ہے۔ فصل بہت اچھی تھی اور پھل بھی تازہ اور صحت مند۔ یہ سارا حساب کتاب لکھا ہے۔ آپ دیکھ لیں۔'' باری نے ایک رجسٹر ان کی طرف بڑھایا، جسے انہوں نے بغیر پڑھے تپائی پر رکھ دیا۔

''یہ رہی تمام رقم........ خرچہ اور لیبر کی تنخواہیں نکال کر پونے نو لاکھ کی بچت ہوئی ہے۔'' وہ انہیں تفصیل بتا رہا تھا۔

''تم نے اپنی پاکٹ منی رکھ لی بیٹا؟''

''میرے کون سے اتنے زیادہ اخراجات ہیں۔ بس زندگی کی گاڑی چل رہی ہے۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔

''اسی لئے تو کہتا ہوں، گھر والی لے آؤ۔ جب روز ضد کرے گی نا شاپنگ کرنے کی، پھر میں پوچھوں گا۔'' بابا صاحب نے مسکرا کر کہا تھا۔

''تو مجھے ایسی فضول خرچ عورت سے شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، جو آئے دن بازاروں میں ہی بسیرا کئے رکھے۔ میرے لئے کوئی ایسی قناعت پسند خاتون لے آئیے گا۔'' اندر آتی درمکنون کو دیکھ کر عبدالباری نے شرارت سے کہا تھا۔ درمکنون کو یوں لگا، گویا کسی نے خنجر سینے میں گھونپ دیا ہے۔

''قناعت پسند۔'' وہ تلخی سے مسکرائی اور کھانا دسترخوان پر چننے لگی۔

''پچھلی مرتبہ جب میں آیا تھا، تب بھی تم نے یہی ڈریس زیب تن کر رکھا تھا۔ ویسے مجھے ایسی قناعت پسند، دوسرے معنوں میں کنجوس ترین خاتون کہیں نہیں ملے گی۔ چراغ کے بجائے ٹیوب لائٹ بھی لے آؤں تو نا کام ہی لوٹوں گا۔'' بابا صاحب وضو کے لئے اٹھے تو عبدالباری کو بھی موقع مل گیا تھا۔

''خاموشی سے کھانا کھاؤ، ورنہ شکایت لگا دوں گی۔'' درمکنون نے اسے دھمکانا چاہا۔

''کوئی پرواہ نہیں۔ اپنا شوق پورا فرما لیجئے۔ میرے لئے تو بابا صاحب تک بات پہنچانے میں آسانی ہو گی۔'' وہ پُرشوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ درمکنون خود سے اُلجھتی باہر نکل گئی۔

'تمہیں معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ جان گئے تو صرف نفرت کرو گے، نفرت۔' وہ تلخی سے سوچ رہی تھی۔ اِک اذیت تھی، اِک درد کا طوفان تھا، جو بائیں پہلو سے اٹھ رہا تھا۔

دوسرے دن عبدالباری جانے کو تیار کھڑا تھا اور ہمیشہ کی طرح بابا صاحب سے اُلجھ رہا تھا۔

''بابا صاحب! اب میں آپ کی ایک نہیں سنوں گا۔ اگلے ہفتے آپ کو حویلی ضرور جانا ہو گا۔ یہاں قطعاً سہولیات نہیں ہیں۔ آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ ہارٹ پیشنٹ ہیں آپ۔ میں آپ کو یہاں آنے سے روکوں گا نہیں۔ بلکہ ہفتے کے چار دن آپ یہاں رہیں گے اور شام کو واپسی۔ کیونکہ ادھر گوٹھ میں آپ کے خوابوں کا محل کھڑا کیا ہے میں نے۔ آپ کی دیرینہ خواہش پوری ہونے والی ہے۔ بس مزید میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ سرپرائز کا مزا کرکرا ہو جائے گا۔'' وہ اپنی عادت کے برخلاف تیز تیز بول رہا تھا۔ یقیناً اسے جانے کی جلدی تھی۔

''آپ بھی خاتون! تیار رہئے گا۔'' اس کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ نرم آواز میں کہتا دروازہ عبور کر گیا تھا جبکہ درمکنون ساکت کھڑی اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہارے خالص جذبوں کی پذیرائی کیسے کروں عبدالباری! کہ میں تو کھوٹی عورت ہوں۔ دو مردوں کی ٹھکرائی ہوئی۔" وہ دھیمی آواز میں آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اور دور کھڑے بابا صاحب کی نگاہیں اس کے چہرے پر نہ جانے کیا کیا کھوج رہی تھیں۔

"میں تین بیٹوں کی ماں ہو کر بھی بے بس ہوں۔" وہ تھکی تھکی آواز میں چہرے پر پھیلے آنسو دوپٹے کے پلو سے صاف کرتی کہہ رہی تھیں۔

"ایک بستر پر پڑا ہے، دوسرا صدا کا اجنبی اور متنفر...... جسے میری محبت کی آنچ بھی پگھلا نہیں سکی۔ اور تیسرا نہ جانے کہاں بھٹک رہا ہے۔"

فاخرہ مسلسل رو رہی تھیں۔ اتنے سالوں بعد آج پھر ان کے لبوں پر بیٹوں کا ذکر آنسو بن کر بہہ رہا تھا۔ زردہ سبزی کی ٹوکری وہیں رکھ کر امی کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"امی! آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

"یہ طبیعت نہیں سنبھلنے والی میرے بچے!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ زردہ اُٹھ کر ٹھنڈا پانی گلاس میں بھر کر لے آئی اور پھر ان کے آنسو اپنے نرم ہاتھوں سے چننے لگی۔ اسی پل سدیہ دھاڑ سے دروازہ کھولے آ گئی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" فاخرہ اور زردہ نے دہل کر پوچھا۔

"امی!...... امی! وہ اسی شہر میں ہیں۔ میں نے خود انہیں دیکھا ہے۔ اتنی شاندار گاڑی میں تھے۔ اتنے خوب صورت۔ پہلے سے بھی زیادہ شاندار۔ مگر......" وہ خوشی سے کپکپاتی آواز میں بتاتی ایک لمحے کو اُلجھ کر خاموش ہو گئی تھی۔

"مگر کیا......؟" سارہ اور مہک بھی باہر نکل آئی تھیں۔ ان کے چہروں پر بھی دبا دبا جوش تھا۔

"ان کے ساتھ درمکنون آپی نہیں تھیں بلکہ کوئی اور بہت ہی حسین لڑکی تھی۔" سدیہ نے بے حد رنجیدگی سے کہا تھا۔ ہزار خدشے چھپے تھے اس کے غم زدہ لہجے میں۔

"کیا......؟" فاخرہ دل تھام کر ڈھے گئی تھیں۔

"امی! پلیز، خود کو سنبھالیے۔ کیوں ان بے حس لوگوں کے لئے آپ خود کو اذیت دے رہی ہیں؟ کس کے لئے یہ قیمتی آنسو ضائع کر رہی ہیں؟...... اُس بے غیرت،

بے شرم بھتیجی کے لئے جو تھوک کر چلی گئی تھی ہم سب پر؟........ اُس نواب کی اولاد کو نفرت تھی ہم سب سے، ہمارے رہن سہن سے، ہماری ان گلیوں اور چوباروں سے۔ اس نے جو چاہا تھا، سب کچھ پالیا۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی ہے۔'' زروہ نے تلخی سے کہا اور امی کی ہتھیلیاں دبانے لگی۔

''مجھے مکنون کی نہیں، اُس سنگ دل کی 'یاد' ستاتی ہے۔ تم نے دیکھا تھا نا، زروہ! جب میں نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر چوما تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ کیسا کٹھور اور بے رحم ہے وہ۔ اجنبی سا بن کر آتا تھا اس گھر میں۔ بات نہیں کرتا تھا، کلام نہیں کرتا تھا۔ حتیٰ کہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ اور میں پھر بھی خوش تھی۔ میری پیاسی نگاہیں اسے دیکھ کر سیراب ہو جاتی تھیں۔ مگر پھر لے اُڑی در مکنون اُسے۔''

''امی! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ان کا ذکر نہیں ہوگا مگر......'' زروہ نے غصے کے عالم میں کہا تھا۔ اسی پل خالہ قمری کسی خاتون کے ہمراہ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئیں۔ فاخرہ انہیں دیکھ کر سنبھل گئی تھیں۔ زروہ سبزی کی ٹوکری اٹھائے مبین کے کمرے میں چلی گئی۔

''فاخرہ! یہ میری پڑوس میں رہتی ہے۔ بیٹی ہی سمجھ لو۔ اپنی زروہ کے لئے آئی ہے۔'' خالہ قمری نے ہاتھ دبا کر فاخرہ سے سرگوشیانہ کہا تھا۔

فاخرہ قدرے بوکھلا گئی تھیں۔

''اندر چلئے۔ یہاں بیٹھنا مناسب نہیں۔''

''نہ بیٹی! تکلف کی ضرورت نہیں۔ بڑی سادہ طبیعت کی ہے شگفتہ۔ ہم یہیں ٹھیک ہیں۔ اور ہاں، چائے پانی کا بھی تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے تیسرے نمبر والے بیٹے کے لئے آئی ہے۔ ماشاء اللہ آرمی میں میجر ہے سلجھا ہوا، شریف بچہ ہے۔ تم ایک دو دن تک آ کر دیکھ لینا۔ میں چلوں گی تمہارے ساتھ۔'' خالہ قمری نے خود ہی سب کچھ طے کر رکھا تھا۔ دراصل وہ روفی کے تیوروں سے خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ کم بخت دو مرتبہ انہیں پیام بھیج چکا تھا۔ وہ تو فاخرہ کی پریشانی کی وجہ سے انہیں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھیں۔ ارادہ یہی تھا کہ فاخرہ کو اعتماد میں لے کر زروہ کا رشتہ طے کرنے کے بعد سادگی سے رخصتی کر دی جائے۔

شگفتہ کے جانے کے بعد خالہ کافی دیر بیٹھی رہی تھیں۔ قمری خالہ، ماڈل ٹاؤن میں اپنے بھتیجے کے ہمراہ رہتی تھیں۔ اولاد تھی نہیں، بھتیجے کے بچوں کو اپنے بچے سمجھ کر پالا تھا۔

دو گلی چھوڑ کر ان کی ایک رشتے کی بھانجی رہتی تھی۔ پہلے پہل خالہ اپنی بھانجی کے پاس رہا کرتی تھیں۔ بھانجی کا شوہر دبئی سیٹ ہو گیا تو وہ بھی بچوں کے ہمراہ شوہر کے پاس چلی گئی تھی۔ خالہ کو ان کا بڑا بھتیجا اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

''خالہ! تو پھر کس دن چلنا ہے شگفتہ کے گھر؟'' فاخرہ کو نفیس مزاج کی شگفتہ بہت پسند آئی تھیں۔ دراصل شگفتہ نے زروہ کو اسکول میں دیکھا تھا۔ انہیں یہ سنجیدہ، سلجھی اور سادہ سی لڑکی بھا گئی تھی۔ بڑی دو بہوئیں اونچے گھرانے سے لا کر وہ بہت پچھتائی تھیں۔ دونوں اپنے اپنے شوہروں کو لے کر الگ ہو چکی تھیں۔ اب وہ تیسرے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ خالہ سے ذکر کیا تو وہ انہیں بالکل صحیح جگہ لائی تھیں۔

''کل اتوار کو چھوڑ کر پیر کی شام کو چلیں گے۔'' خالہ کچھ سوچتے ہوئے آہستگی سے بولی تھیں۔ پھر قدرے قریب کھسک آئیں۔ فاخرہ سمجھ گئی تھیں کہ خالہ کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔

''دیکھ بیٹی! یہ روفی کم بخت کے تیور اچھے نہیں۔ ذرا احتیاط رہنا۔''

''کیا مطلب خالہ؟ میں سمجھی نہیں۔'' فاخرہ نے الجھ کر کہا۔

''وہ دراصل پھر بیاہ کے چکروں میں ہے۔ موا چار ٹکوں پر اکڑتا ہے۔ حیا بد بخت لی نہ جانے کہاں سوئی ہے۔'' خالہ نے تلخی سے کہا اور فاخرہ کے سلوٹ زدہ چہرے میں پوشیدہ تفکر کو دیکھنے لگیں۔

''ادھر کے چکر خبیث ایسے ہی تو نہیں لگاتا۔ میرے منہ میں خاک، کیڑے پڑیں کمینے کے وجود میں، پانی نصیب نہ ہو نزع کے وقت کم بخت کو۔ اپنی زروہ کے لئے دو مرتبہ کہلوا بھیجا تھا اس نے۔''

''کیا.....؟'' فاخرہ کے دل پر گویا گھونسا پڑا۔ برتن دھوتی زروہ کے ہاتھ بھی کپکپانے لگے تھے۔

''بڈھا شیطان، دو کو بھگتا چکا ہے۔'' خالہ ترشی سے کہہ رہی تھیں۔

فاخرہ کو یاد آیا۔ باتوں ہی باتوں میں روفی نے بھی ایک دو مرتبہ ڈھکے چھپے الفاظ میں زروہ کے متعلق بات کی تھی۔

''بے شرم، بے غیرت........ اس کی بیٹی سے بھی چھوٹی ہے زروہ۔ نہ جانے لوگوں کے دیدوں کی شرم کہاں گئی ہے۔'' ان کا تو مارے اشتعال کے رواں رواں سلگ اٹھا تھا۔ مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا۔

”اس کے مکان میں رہتے ہیں، کرایہ دے کر۔ بات تو کر کے دیکھے۔ زبان کھینچ لوں گی میں اس کی۔“ ان کا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ اس کمینے کے وہ لتے لیتیں کہ یاد رکھتا۔ بہانے بہانے سے دروازے کے سامنے کیوں کھڑا ہوتا تھا، وہ تمام معاملہ سمجھ چکی تھیں۔ دل ہی دل میں وہ خالہ کی حد درجہ مشکور ہوئیں۔ زبان سے کہتیں تو خالہ نے برا محسوس کرنا تھا۔ کیا پتہ، خفا ہی ہو جاتیں کہ فاخرہ نے ان کا مان توڑ ڈالا ہے۔ بچیوں سے ان کی محبت ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ ایمرجنسی میں وہ زروہ کے لئے ایک اچھا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ ان کا خلوص اور محبت اسی بات سے ظاہر تھا۔

”فاخرہ! ایک بات بولوں، غصہ تو نہیں کرو گی؟“ خالہ نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ فاخرہ نے ایک گہری سانس کھینچی۔ وہ جان گئی تھیں کہ خالہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔

”تم بات کر کے دیکھو تو۔ اسی شہر میں ہے۔ اتنا کٹھور تو نہیں کہ تمہارے حالات جان کر بے رخی برتے۔ کم از کم تھوڑا بہت تحفظ کا احساس ہو گا۔ کوئی انگلی اٹھانے سے پہلے سوچے گا تو ضرور کہ تمہاری پشت کمزور نہیں۔ سچ کہوں بیٹی! جب سے مبین کے ساتھ حادثہ پیش آیا ہے، تب سے لوگ شیر ہونے لگے ہیں۔ جان گئے ہیں نا کہ گھر کا واحد مرد بستر پر پڑا ہے۔ کوئی کہنے سننے والا نہیں۔ جب دیواریں کمزور ہونے لگیں تو چوروں کو آسانی ہو جاتی ہے۔ پلک جھپکتے میں ڈھا دیتے ہیں۔ شوہر اور بیٹے ہی تو اصل مضبوط قلعہ ہوتے ہیں۔ جب عمارت کمزور ہو تو گرانے میں دیر نہیں لگتی۔ مبین بیمار ہے، بستر پر پڑا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ خود تو اُٹھ نہیں سکتا، بہنوں کو کیا تحفظ دے گا۔ میری بات مانو، ایک مرتبہ اس سے کہہ کر تو دیکھو۔ تمہارا خون ہے، اتنا بھی بے رحم، سنگ دل نہیں ہو سکتا۔“

”اونہہ........اس بدکردار، اوباش اور بدبخت کا بھی تو خون اسی کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ کیوں کرے گا وہ میرا اور میری بچیوں کا احساس۔“ فاخرہ نے تھکی تھکی آواز میں کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

(......❀......)

”مس نینی! رانیہ سے کہیں، ہمارے ساتھ کھانا کھائے۔“ عنوہ نے ڈائننگ روم میں داخل ہو کر مس نینی سے تحکم بھرے لہجے میں کہا تھا۔ گلاس میں جوس ڈالتے زیان نے چونک کر عنوہ کی طرف دیکھا اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”مس نینی! سنا نہیں آپ نے؟“ وسیع و عریض ٹیبل کے ایک طرف کھڑی براؤن

ساڑھی میں ملبوس مس نینی کوئی پتھر کا مجسمہ ہی لگ رہی تھی۔ عنوہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا مس نینی نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ احساسِ توہین سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”رانیہ بی بی! کھانا کھا چکی ہیں۔“ اس کی طرف بغیر دیکھے مس نینی نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

”رانیہ اتنی جلدی ڈنر کر لیتی ہے اور وہ بھی اکیلے؟“ عنوہ نے حیرت سے کہا۔ ڈائننگ روم میں موجود دونوں نفوس نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ زیان بہت رغبت سے کھانا کھا رہا تھا، اسے بیٹھنے کی بھی آفر نہیں کی۔

”آپ رانیہ سے کہیں، میں اسے بلا رہی ہوں۔ کھانا کھا چکی ہے، ساتھ دینے میں کیا حرج ہے؟“ عنوہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے بظاہر سنجیدگی سے بولی تھی۔

”میم! آپ پلیز بیٹھیں اور یہ بتائیں، کیا کھانا پسند کریں گی؟“

وہ اس کا سوال گول کر کے فل سروس دینے کے لئے تیار تھی۔ عنوہ تو سر سے پاؤں تک سلگ اُٹھی۔

”تھینکس۔ میرے ہاتھ سلامت ہیں۔ خود ڈال لوں گی۔ آپ اپنے صاحب کی ”خدمت“ بخوشی کر سکتی ہیں۔“

اس نے جل کر کہا تھا۔ زیان نے لبوں پر اُمڈنے والی بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کا تکلف نہیں کیا تھا۔

”مس نینی! آپ جائیے، ان کے ہاتھ سلامت ہیں۔ یہ روٹی کھائیں گی اور پکا کر لائیں گی۔“

”کیا مطلب؟“ عنوہ اُلجھی۔

”آپ ان کی کچن تک رہنمائی کریں۔ یہ محترمہ تازہ روٹی پکا کر لائیں گی۔ ہری اپ عنوہ!“ زیان، مس نینی سے مخاطب تھا اور دیکھ اس کی طرف رہا تھا، جو کہ اس اچانک افتاد پر بوکھلا گئی تھی۔

”م...... میں......؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”جی، آپ۔ بہت دن ناز نخرے دکھا لئے ہیں۔ اب اپنی ”اوقات“ پر آ جائیے۔“ زیان سنجیدگی سے بلکہ سرد انداز میں کہہ رہا تھا۔

”تم مجھے ”باورچن“ بنا کر لائے ہو؟“ عنوہ نے صدمے سے ڈوبی آواز میں کہا تھا۔

''نہ صرف باورچن بلکہ دھوبن بھی۔'' اس کی معلومات میں اضافہ کیا گیا تھا۔ عنوہ نے رونی شکل بنالی۔

''مس نینی! آج سے آپ عنوہ کو اس کے کاموں کی فہرست بنا کر دے دیجئے گا۔ کل سے یہ ڈیوٹی جوائن کرلیں گی۔''

''میں سمجھی نہیں، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' عنوہ نے حیرانی سے کہا۔

''فارسی میں نہیں بات کر رہا میں۔ مس نینی تمہیں سمجھا دیں گی۔ ابھی فضول تکرار کرنے میں ٹائم ضائع نہ کرو اور فوراً اچھی سی، بالکل گول اور نرم روٹی پکا کر لاؤ۔ کنارے موٹے نہ ہوں اور نہ ہی جلا دینا۔'' آخر میں تنبیہ بھی کی گئی تھی۔ عنوہ حق دق سی دیکھتی رہ گئی تھی۔

''آیئے میم!'' مس نینی گویا اس کا امتحان لینے کھڑی تھی۔ عنوہ مرے مرے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

زیان اس کی جھنجلاہٹ محسوس کر چکا تھا، تاہم بغیر کچھ کہے نیپکن سے ہاتھ پونچھتا کھڑا ہوگیا۔ کھانا تو وہ کھا ہی چکا تھا۔ محض عنوہ کو ستانے کی غرض سے کچن میں بھیجا تھا اور ویسے بھی اس کے ہاتھ کی روٹی کھا کر اس کا مرنے کا ارادہ ہرگز نہیں تھا۔

ادھر کچن میں عنوہ گھبرائی بوکھلائی سی عجیب وغریب شکل کی روٹی ہاتھ میں پکڑے نہ جانے کس بات پر غور کر رہی تھی۔ مس نینی بمشکل ہنسی دبائے اس کی رنجیدہ شکل دیکھ رہی تھی۔

''ایسی روٹی زیان کھانا پسند نہیں کرے گا۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔ ''مجھے ایک اور کوشش کرنی چاہئے۔ شاید پہلے سے کچھ بہتر روٹی پکا سکوں گی میں۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر روٹی بیلنا شروع کر دی تھی۔ اس طرح کی چار پانچ روٹیاں پکانے کے بعد اس نے نڈھال انداز میں پورے تین گلاس پانی پی کر اپنے حواس بحال کیے اور پھر مرے مرے قدم اٹھاتی ڈائننگ روم میں داخل ہوئی۔ زیان کی خالی کرسی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

''صاحب کھانا کھا چکے ہیں میم! سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ لیں گے۔'' اس کا دل جلانے کے لئے ایک مرتبہ پھر ڈائننگ روم میں تشریف لا چکی تھی۔ عنوہ کا اس قدر برا ہو چکا تھا کہ اس نے پلٹ کر اسے کوئی تلخ جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا بغیر کھانا کھائے وہ غصے کے عالم میں باہر نکل گئی۔

''کتنی، مکار........ پتہ بھی تھا کہ وہ کھانا کھا چکا ہے، پھر بھی مجھے نہیں بتایا۔ ترس بھی نہیں آیا اس بے حس انسان کو مجھ پر۔ تین جگہ سے ہاتھ جلا بیٹھی ہوں۔'' وہ آنسو پیتی بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

❁

''یہ کپڑے دھوئے ہیں تم نے؟'' وہ شرٹ ہاتھ میں لئے شدید صدمے کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

''کیا ٹھیک سے صاف نہیں ہوئے؟'' عنوہ بوکھلا کر سرعت سے قریب آئی۔

''نہیں، باقی سب تو ٹھیک ہے۔ بس کالر اور کف دھلنے سے محروم رہ گئے ہیں۔'' وہ بے حد طنزیہ انداز میں جل کر بولا تھا۔

''میں نے تو رگڑ رگڑ کر دھلائی تھی۔ قسم سے ہاتھ بھی دکھنے لگے تھے میرے۔'' عنوہ نے رنجیدگی سے کہہ کر شرٹ کا بغور جائزہ لیا۔

''ایک مرتبہ پھر اسے دھوتی ہوں۔ آپ کوئی اور پہن لیں۔'' وہ مری مری آواز میں بول رہی تھی۔

واش روم کی طرف جاتے ہوئے اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ اس نے ایسے ہی تو دھوبن بننا منظور نہیں کر لیا تھا۔ ایک زوردار معرکہ ہوا تھا، جس کے نتیجے میں وہ اپنا تمام تر فخر وغرور بھی کھو بیٹھی تھی۔ دو دن پہلے اس نے ببانگ دہل اعلان کر دیا تھا کہ وہ زیان کا کوئی کام نہیں کرے گی۔ ایسے نوکروں والے کام وہ اپنی رانیہ بیگم سے کروائے۔

''اصل ''بیگم'' تم ہو، لہٰذا میرے کام تم ہی نے کرنے ہیں۔ کان کھول کر سن لو۔'' وہ لاپروائی سے کہہ رہا تھا۔

''یہ اصل اور نقل کیا ہوتا ہے؟ بیوی تو بیوی ہوتی ہے۔ مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔'' عنوہ نے تنک کر کہا۔

''اصل، نقل کا مفہوم میں تمہیں پھر سمجھاؤں گا۔ ابھی تو تم ادب احترام کرنا سیکھو۔ آئندہ اس لہجے میں بات کی تو دیکھنا۔'' زیان نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تھا۔

''تو پھر کیا کر لو گے تم؟'' اس نے آگ بگولا ہو کر کہا۔

''دو جھانپڑ لگا کر ''آپ جناب'' کرنا سکھاؤں گا۔'' دوسری طرف اطمینان ہنوز برقرار تھا۔

"تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے، یعنی عنوہ ہاشم فریدی پر؟" وہ تنفر سے بولی۔
"یہ غرور تم پر سوٹ نہیں کرتا۔" زیان ٹانگیں جھلاتا کہہ رہا تھا۔
"تم پر تو کرتا ہے نا۔" اس نے تلخی سے کہا۔
"آف کورس۔" وہ مسکرایا۔
"خود پر مغرور ہونے کے لئے کچھ چیزوں کا ہونا ضروری ہے، جو تم میں نہیں۔"
"جو مرضی کہہ لو، مگر میں یہ نوکروں والے کام نہیں کروں گی۔" وہ غصے سے پھنکاری۔
"تمہاری ماں نے تمہیں ایک نوکر سے بھی کم درجے کا سمجھ کر میری طرف ریفر کیا تھا۔ یہ تو میری مہربانی سمجھو جو تمہیں ملازمہ سے مالکن بنا دیا ہے۔" زیان نے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔
عنوہ ایک دم ٹھٹک سی گئی تھی۔ کم از کم اتنا تو وہ سمجھ چکی تھی کہ زیان بغیر "وجہ" اور ثبوت کے کوئی بات یونہی نہیں منہ پر مار دیتا۔
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"
"صرف اتنا کہ تمہاری ڈیئر ممی نے ایک فل اسٹیبلش فیکٹری اور کروڑوں کی مالیت کے ہوٹل کے عوض میرا اور تمہارا رشتہ کیا تھا۔ سستے الفاظ میں یوں کہہ دیتا ہوں کہ انہوں نے تمہیں بیچ دیا ہے۔ بڑی بھرپور بزنس ڈیلنگ تھی۔ تمہاری مکار ممی نے پوری سازش سے فیکٹری اور ہوٹل ہتھیا لیا ہے۔ ایسے ہی تو ڈیئر ممی فرانس جانے کے لئے باؤلی نہیں ہو رہی تھیں۔ ترپ کا آخری پتا سنبھال کر رکھا ہوا تھا ڈیئر خاتون نے۔ میں نے تو رسم و رواج کے مطابق پروپوزل پیش کیا تھا، ان خاتون نے بزنس کی زبان میں باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ میں نے تو تمہیں حاصل کرنا چاہا تھا۔ چاہے میری ساری دولت وہ اپنے نام لکھوا لیتیں۔ پھر فرانس میں موجود معمولی سی فیکٹری اور ہوٹل کیا چیز ہے۔ میں ان معمولی اور مادی خساروں پر توجہ نہیں دیتا۔ اصل نقصان تو دل کا ہوتا ہے۔ بس خیال رکھنا، ہمارا دل نہ ٹوٹے۔"
"کیا یہ سچ ہے؟" اس نے مری مری آواز میں بمشکل کہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا کسی ٹوٹی بوسیدہ عمارت کا سارا ملبہ اس کے اوپر آ گرا ہے۔
"یہی تلخ سچ ہے۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں، صرف یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ تم جو مجھ سے چوری چوری پرائیویٹ ہاسٹلز میں فون کر کے کمرے کی بکنگ کا پروگرام بنا رہی ہو تو ایسا مت کرو۔ یہ سب بے کار ہے۔ تمہاری ممی نے ایک قانونی تحریر میرے

حوالے کی تھی، جس میں انہوں نے تم سے قطع تعلق ظاہر کیا تھا۔ تمہارے پاس خلع کا حق بھی نہیں۔ یعنی تمام راستے بلاک ہیں۔ یہ گھر تمہارا ہے، میرے سمیت۔ نوکروں کی پوری فوج موجود ہے۔ تمہاری بات ان کے لئے "حکم" کا درجہ رکھتی ہے۔ تم ہر معاملے میں خود مختار ہو۔ یہ سامنے ریک میں آخری نمبر والا دروازہ کھولو گی، اس میں لاکر کی چابیوں کا گچھا موجود ہے۔ سیف کھولنا، اندر ہر ملک کی کرنسی موجود ہے۔ جس چیز پر دل آئے، خریدتی جاؤ۔ میں تم سے حساب نہیں لوں گا۔
اونہہ، شک مت کرو........ نہ ہی شکی نگاہوں سے دیکھو۔ یہ سب حرام کی کمائی سے اکٹھا نہیں کیا۔ میرے خون پسینے اور جنون کی کمائی ہے۔ ایک وقت ایسا آیا تھا کہ مجھ میں دولت اکٹھی کرنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ میں نے اتنا کمایا ہے، بے شمار، بے حساب کہ اپنے اثاثوں کی تعداد خود بھی معلوم نہیں مجھے۔ ڈیڈی کی صرف تین فیکٹریاں تھیں، جو مجھے وراثت میں ملی تھیں۔ ان کی حالت بھی آخری ہچکی جیسی تھی۔ نہ مشینری تھی اور نہ ہی ورکر۔ ان تین فیکٹریوں کو تیرہ میں خود میں نے بدلا ہے۔ اپنی ذہانت، محنت اور جنون سے۔ دیکھو عنوہ! تمہیں اپنی ممی کے رویے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مائیں ساری ایک جیسی ہوتی ہیں۔ سیلفش، بے حس۔ چاہے اپر کلاس کی ہوں یا مڈل کلاس کی۔ تمہیں غم کھانے کی ضرورت نہیں۔ جب انہیں تمہاری پروا نہیں تو تم بھی لعنت بھیجو۔ میں نے تمہیں ہائی جینک (صحت افزا) ماحول دیا ہے، تا کہ تم ذہنی بیمار نہ ہو۔ کھاؤ پیو، صحت مند رہو۔"
وہ شرٹ جھاڑتا اسے سوچوں میں گم سم چھوڑ کر چلا گیا تھا اور عنوہ اپنے ریزہ ریزہ وجود کی کرچیاں سمیٹتی رہ گئی۔ سارے کس بل تو خود بخود نکل گئے تھے۔ کہاں کے نخرے اور کیسے نخرے۔ ممی نے تو اسے اپنی ہی نظروں سے گرا کر دو کوڑی سے بدتر کر دیا تھا۔ وہ کس بل بوتے پر اتنا اکڑتی۔ جو پلاننگ کر رکھی تھی، ہاسٹل شفٹ ہونے کی، وہ زیان منہ پر مار کر چلا گیا تھا۔ سوائے اس گھر کے کہیں جائے پناہ نہیں تھی۔ سڑکوں پر دھکے کھانے سے بہتر تھا، یہیں اطمینان سے رہتی۔
ویسے بھی اسے افسانوی سپرہٹ ہیروئن بننے کا کوئی شوق نہیں تھا، جو بھرپور اکڑ سے نہ جانے کیسے گھر بھی چھوڑ دیتی تھی اور نوکری کی تلاش میں بھی ماری ماری پھرنے لگتی تھی۔ اس کی تو سڑکوں کی خاک چھاننے کے تصور سے ہی روح کانپ کانپ جاتی تھی۔
ٹب پانی سے لبا لب بھر چکا تھا اور عنوہ شرٹ ہاتھ میں لئے سرف کا ڈبہ کھولے

سوچوں کے تانوں بانوں میں اُلجھی نہ جانے کون سے مسائل کے حل کی تلاش میں گم بیٹھی تھی۔ زیان نے زور سے کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ گڑبڑا کر واش روم کے دروازے میں ایستادہ زیان کی طرف دیکھنے لگی۔

''کمال ہے عنوہ! اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں سوچنے کے لئے۔'' زیان نے طنزیہ کہا تو عنوہ حد درجہ شرمندہ ہوگئی تھی۔ دو دن پہلے جو کلاس لی تھی زیان نے اس کی، بڑی فائدہ مند ثابت ہوئی تھی وہ جھڑپ۔ محترمہ عنوہ صاحبہ سر تا پا نہیں تو کچھ کچھ پہلے سے بدل گئی تھیں۔ البتہ بعض معاملوں میں اس کی سوئی زیرو پر ہی اٹک جاتی تھی۔ خصوصاً رانیہ کے معاملے میں۔

''وہ......میں......شرٹ دھونے لگی تھی۔'' عنوہ نے گھبرا کر وضاحت کی۔

''ارے گولی مارو شرٹ کو۔ تم ذرا ادھر آؤ۔'' زیان نے آگے بڑھ کر شرٹ کھینچی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔ عنوہ خوشی خوشی شرٹ پھینک کر ہاتھ پونچھتی باہر آ گئی تھی۔

''شکر ہے جان چھوٹی۔'' اسے کپڑے دھونا سخت ناپسند تھا۔

''ذرا میری بلیک چپل پر برش مارنا عنوہ!'' وہ بڑے مصروف انداز میں کہہ رہا تھا۔ عنوہ کی ساری خوشی بھک سے اُڑ گئی۔

''اچھا، تو اس لئے ترس آیا تھا۔ اس سے بہتر تھا، میں شرٹ ہی دھو لیتی۔'' وہ منہ بنا کر شوز ریک سے چپل نکالنے لگی۔ اسے جوتے پالش کرنا، کپڑے دھونے سے بھی زیادہ ناپسند تھا۔

''یار! میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے دھوکے باز لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ ایسے لوگ قابل رحم نہیں ہوتے۔ اب دیکھو نا، کوئی شخص آپ کے ساتھ فراڈ کرے، پھر آپ کو تا عمر اس شخص کے ہمراہ بھی رہنا پڑے تو کس قدر تکلیف دہ زندگی ہو جاتی ہے، ایک دم فضول اور بے کار۔'' وہ بڑے درد بھرے بوجھل لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''تمہارے ساتھ کس نے فراڈ کرنے کی جرأت کی؟'' رانیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''زیان نے۔'' اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے مخصوص صاف گو لہجے میں کہہ دیا تھا۔ ساتھ میں ڈرائی فروٹ کی ٹرے بھی رانیہ کے ہاتھ میں تھما دی۔

''تم تو زیان کے ساتھ رہتی ہو، یقیناً اس کی تمام تر ''خوبیوں'' سے بھی واقف ہو گی۔ ایک نمبر کا دوغلا، شرابی، منافق، چالاک، عیار، مکار شخص ہے۔ بلکہ جیک آف آل ٹریڈز (ہرفن مولا) ہے۔ دیکھو نا، بظاہر کیسی پالش شدہ چمکتی دمکتی عمارت ہے۔ ایک سپر گلوری لائف، بے حد ہینڈسم۔ جینئس بھی کہہ لو (حالانکہ میں تو اسے حد درجہ شاطر سمجھتی ہوں) پر اس پر (خوشحال) ہے تو پھر کوئی بھی لڑکی خواہ کسی بھی طبقے سے ہو، ایسے شخص کے فریب میں آ سکتی ہے۔'' عنوہ غیر محسوس لہجے میں کہہ رہی تھی۔

نہ جانے کیوں اسے چھٹی حس اشارہ دے رہی تھی کہ رانیہ کی گہری دبیز خاموشی اروں بھید چھپائے ہوئے ہے۔ زیان ڈنکے کی چوٹ پر اسے بیاہ کر لایا تھا اور رانیہ خاموش تھی، کوئی احتجاج نہیں کیا تھا اس نے۔

''ہاں، ہوتی ہیں کچھ لالچی لڑکیاں۔'' رانیہ نے اس کی بات سے اتفاق کر لیا تھا۔

نہ جانے کون سا گہرا دکھ اس کے لہجے میں بول رہا تھا۔

''چمک دمک کی دلدادہ، دولت کی پجاری، روپے کو محبت پر ترجیح دینے والی، پونڈز اور ڈالرز کی دیوانی۔'' اس نے تنفر سے کہا۔

"ایسی عورتیں جسمانی خوشی لیتی ہیں، روحانی نہیں۔" عنوہ نے باداموں کی مٹھی بھر کر رانیہ کی طرف بڑھائی، جسے اس نے بے خیالی میں تھام لیا تھا۔

"رانیہ! اگر تم مائنڈ نہ کرو تو اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ مطلب اپنے بیک گراؤنڈ کے متعلق، اور یہ بھی کہ زیان سے تمہاری کیسے ملاقات ہوئی؟" اس نے نوکِ زباں پر مچلتا سوال پوچھ ہی لیا تھا۔ رانیہ خاموش تھی، بالکل ساکت۔ گویا پتھر کا مجسمہ ہو۔ شاید اسے عنوہ سے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی۔

"تم زیان کی زندگی میں کیسے شامل ہوئیں؟ پراپر پلاننگ سے یا پھر کسی ایکسیڈنٹ نے تمہیں زیان سے ملوا دیا تھا؟" اس نے دوبارہ اپنے سوال کو دہرایا تو رانیہ پھیکی سی ہنسی لبوں پر سجا کر بولی تھی۔

"شاید حادثہ تھا یا پھر ایک اذیت ناک سانحہ۔" وہ دونوں رشتے کے لحاظ سے سوتنیں تھیں۔ ایک روایتی، فطری سا حسد رانیہ کو نہ سہی، عنوہ کو ضرور لحہ بہ لحہ گیلی لکڑی کی طرح سلگاتا تھا۔

"یہ شادی ارینج تھی یا لو؟"

"کہا نا کہ ایسا کوئی بھی معاملہ ہمارے درمیان نہیں۔ یعنی محبت وحبت کا۔"

عنوہ کو یوں لگا تھا کہ رانیہ کی آنکھوں کے گوشے بھیگ سے گئے ہیں۔ نہ جانے وہ کیا کریدنا چاہ رہی تھی۔ شاید زیان اور رانیہ کے درمیان کلوزنیس (قربت) کا اندازہ لگانا چاہتی تھی۔ جو شدتیں، جذبے، محبتیں عنوہ کے لئے تھیں، ان میں رانیہ کا کتنا حصہ تھا۔ زیان کی چاہتوں کو رانیہ بھی تو اس کے ساتھ برابر شیئر کرنے والی تھی۔ یہی ایک "پھانس" اسے پورے دل سے خوش نہیں ہونے دیتی تھی۔

بہت قربت کے لمحات میں بھی عنوہ کی سوچیں رانیہ کی طرف بھٹک جاتی تھیں۔ عورت چاہے کسی بھی سوسائٹی کی ہو، کتنی ہی ایجوکیٹڈ کیوں نہ ہو، بہت ماڈل اور لبرل ہو، خود کو جتنا بھی براڈ مائنڈڈ شو کرے، مگر اپنے "مرد" کو دوسری عورت کے ساتھ شیئر کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ چاہے مرد "من چاہا" ہو یا "ان چاہا" سوتن سے حسد فطری عمل ہے۔ اور پھر عنوہ جیسی لڑکیاں جو حد درجہ حساس ہوں، جنہیں والدین کی مشترکہ محبتیں بھی نہ ملی ہوں، جو بروکن فیملی سے تعلق رکھتی ہوں، جن کی دنیا ایک کمرے تک محدود ہو، جو اپنی "چیز" کے متعلق بہت پوزیسیو ہوں، ان کو ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے تو وہ ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہیں۔

وہ فطرتاً بہت نرم دل، حساس اور صلح جو لڑکی تھی۔ وہ رانیہ کے متعلق کوئی بھی منفی رویہ یا دشمنی دل میں نہیں رکھتی تھی، نہ ہی یہ چاہتی تھی کہ زیان اس معصوم ڈری سہمی رنجیدہ سی لڑکی کو خود سے الگ کر دے۔ مگر وہ زیان سے ضرور خفا تھی، ناراض تھی بلکہ حد درجہ اُکھڑی اُکھڑی رہتی تھی، جس نے ان دو عورتوں کے جذبات مجروح کر دیئے تھے۔ وہ دولت اور اسٹرینتھ کی بدولت انہیں "حاصل" کر چکا تھا۔ اس نے اپنے تئیں اندازہ لگا لیا تھا کہ زیان نے یقیناً رانیہ کو اغوا کیا ہوگا، یا پھر یہ کورٹ میرج ہوگی۔ زیان کو جو چیز پسند آ جائے، اس کے حصول کے لئے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

"تم اپنے پیرنٹس سے نہیں ملتیں؟"

"نہیں۔" رانیہ نے آہستگی سے کہا۔

"کیوں، نہ ملنے کی وجہ؟" عنوہ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ نہیں ہیں۔" اس نے گول مول سا جواب دیا تھا مگر عنوہ کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

"فارن میں ہیں؟" دراصل وہ کنفرم کرنا چاہتی تھی کہ آیا وہ دنیا میں موجود ہیں یا نہیں، اسی لحاظ سے اظہارِ افسوس کرنا تھا۔

"ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔" وہ بھیگی آواز میں بولی تھی۔

"ویری سیڈ۔" توقع کے عین مطابق عنوہ کا نرم دل پگھلنے لگا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔

'بے چاری کتنی اکیلی ہے۔ اوپر سے اتنا ظالم، جلاد شوہر۔' عنوہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے سوچا۔

'ظاہر ہے اسے بھی تو تکلیف ہوئی ہوگی، جب زیان مجھے بھی بیاہ کر لے آیا۔ یہ تو پہلے سے موجود تھی، اس بے چاری کا کیا قصور۔ اصل "مجرم" تو زیان ہے۔' اب سوچیں دوسرے رخ پر بہنے لگی تھیں۔

"تم بہت مس کرتی ہوا اپنے پیرنٹس کو؟"

"ہوں۔" رانیہ نے رنجیدگی سے ہنکارا بھرا۔

"اچھا یہ بتاؤ، زیادہ کس سے اٹیچ تھیں، ممی سے یا پاپا سے؟" عنوہ نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

"میں بہت چھوٹی تھی، جب ان کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔"

"تو پھر تمہاری شادی زیان سے کس نے کی؟" عنوہ اُلجھی۔ بات گھوم پھر کر وہیں

اٹک جاتی تھی۔

"شادی سے پہلے پرورش کا سوال ہے، یعنی مجھے پالا پوسا کس نے۔" رانیہ دھیرے سے مسکرائی۔

"ہاں، واقعی۔ یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہیں۔" عنوہ جھینپ سی گئی تھی۔ دراصل اسے زیان اور رانیہ کی ملاقات کا حال جاننے کی جلدی تھی۔

"اماں، ابا کے بعد میری پھپھو امی سرپرست تھیں۔ انہوں نے میری پرورش کی تھی۔" رانیہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔ اس کی شفاف آنکھوں میں کئی کرچیاں سی چبھ رہی تھیں۔ اس پل مس نینی شیطان کی طرح بغیر اجازت کے نازل ہو گئی تھی۔

"میم! صاحب کا فون ہے۔"

"مائی گاڈ!" عنوہ سر پر پیر رکھ کر بھاگی تھی۔

فون اسٹینڈ کے قریب جانے سے پہلے اس نے ایک گلاس پانی پی کر اُلجھی سانسیں ہموار کی تھیں مگر پھر بھی اس "آفت" کو اندازہ ہو گیا تھا کہ عنوہ کہاں سے تشریف لائی ہے۔ زیان سچ کہتا ہے وہ اپنی دو آنکھیں اس کی نگرانی کے لئے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ کمال کا زیرک بندہ تھا۔ پہلی نگاہ میں ہی چہرے مہرے کا انداز، چال گفتار سے مقابل کی پوری ہسٹری جان لیتا تھا۔ وہ چہرے پڑھنے اور لہجے سمجھنے کے فن سے آشنا تھا۔ بقول عنوہ کے بہت زیادہ چالاک اور ہوشیار تھا۔

"تم لاتوں کی "بھوتنی" ہو۔ باتوں سے کہاں مانو گی؟........منع کیا تھا میں نے کہ رانیہ کے پاس بیٹھنے سے گریز کرو۔ مگر ڈھیٹ عورت کی اولاد ہو، چکنے گھڑے کہاں اثر ہوتا ہے کسی نصیحت کا تم پر۔" دوسری طرف سے وہ خوب بھنا رہا تھا، غرا رہا تھا۔

"یو ہیو ٹیکن دِس رسک اِن دِس میٹر۔ (تم نے اس معاملے میں خطرہ مول لیا ہے) اب میں تم پر ایسی پابندیاں لگاؤں گا کہ تم تھرّا جاؤ گی۔ رانیہ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ تم ہی بھاگ بھاگ کر اوپر جاتی ہو۔ ہمدردی کا بخار جلد ہی اُتر جائے گا۔ تمہیں بیڈ روم میں لاک کر کے آیا کروں گا میں۔ رہنا سارا دن کمرے میں بند۔ دیواروں سے باتیں کرنا۔"

"ممی کا ذکر کرنا ہو تو اچھے الفاظ میں کیا کریں۔ میں ہرگز اپنی ممی کے بارے میں کچھ نہیں سنوں گی۔" اس نے گویا زیان کے چیخنے چلانے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس کی سوئی اپنی ممی کے توہین آمیز الفاظ میں اٹک گئی تھی۔

"ارے، ارے........ممی سے اس قدر اُلفت........سچ، میری ممی ایسی ہوتیں تو میں نے پہلی فرصت میں انہیں شوٹ کر دینا تھا۔" اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا، اس کی آواز سن کر۔

"یا وحشت۔" عنوہ کو امید تھی، زیان سے ایسے ہی حسین جواب کی۔

"سنگدل، پتھر دل اور........" اس نے زیرِلب دہل کر کہا تھا۔

"اور نرم دل۔" زیان اس کی سرگوشی سن چکا تھا، مسکرا کر بولا۔

"نرمی تو چھو کر نہیں گزری۔" اس نے منہ بنا کر کہا تھا۔ پھر اچانک یاد آیا۔

"فون کیوں کیا تھا؟"

"ہاں، مس نینی سے کہنا، ڈنر پر خوب اہتمام کر لیں۔ انفارمل ڈنر ہو گا۔ سب فرینڈز بہت عرصے بعد اکٹھے ہو رہے ہیں۔ کچھ اپنی مسز کے ساتھ آئیں گے یعنی کپلز۔ آپ بھی اچھا سا ڈریس زیب تن کر کے میری ذات پر احسانِ عظیم کر دیجئے گا۔ عین نوازش ہو گی۔ ہر وقت اول جلول حلیے میں بدروح کی طرح گھومتی رہتی ہو۔" آخری الفاظ منہ ہی منہ میں بدبدائے تھے مگر عنوہ کی سماعتیں کافی تیز تھیں۔ ایک دم چیخ اٹھی۔

"بدروح کسے کہا ہے؟"

"تمہارے دشمنوں کو۔" وہ برجستہ بولا تھا۔

"دشمن کون ہیں؟" عنوہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ تو تمہیں پتہ ہونا چاہئے۔" زیان نے سرعت سے کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔ عنوہ ٹوں ٹوں کی آواز سن کر ریسیور کریڈل پر رکھ کر پلٹی۔ سامنے ہی مس نینی کھڑی تھی۔ چوبیس گھنٹے الرٹ۔ فی الحال تو عنوہ کو اپنی بڑی دشمن یہی دکھائی دے رہی تھی۔

'چغل خور نہ ہو تو۔ یقیناً اسی نے زیان کو بتایا ہے کہ میں رانیہ کے پاس تھی۔' وہ جلتی بھنتی سوچ رہی تھی۔ معاً اسے پلٹتے دیکھ کر بولی۔

"صاحب کہہ رہے ہیں، ڈنر پر اہتمام کر لیجئے گا۔ ان کے دوست آئیں گے۔"

"او کے میم!" وہ تابعداری سے سر ہلا کر وسیع و عریض کچن میں غروب ہو گئی تھی۔

عنوہ پہلے تو سستی سے اِدھر اُدھر گھومتی رہی، پھر ایک بھرپور نیند لینے کی غرض سے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ لیٹنے سے پہلے آئینے میں اپنا بھرپور جائزہ لیا تھا۔

'آنکھیں کس قدر ریڈ ہو رہی ہیں، شاید نیند کی کمی کی وجہ سے۔ ایک تو مجھے دن کو سونے کی عادت نہیں ہے۔ اور رات بھر زیان سونے نہیں دیتے۔'

سوچتے ہوئے ایک دم وہ اپنے ہی عکس کو دیکھ کر جھینپ گئی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک کھلی کھلی حیا آلود مسکان تھی۔

❁

"اس سوئے ہوئے محل میں کوئی جاگ بھی رہا ہے کہ سب "نندیا" میں گم ہیں؟" ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی تھی۔ عنوہ نے آنکھیں بہ مشکل کھولتے ہوئے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ نہ جانے وہ کتنی دیر تک سوتی رہی تھی۔ ایک دم کھٹا کھٹ کے ساتھ ہی کئی لائٹس روشن ہوگئی تھیں۔ ساتھ میں چلّانے والی خاتون بھی نظر آگئیں۔ عنوہ کے لب مسکرا اُٹھے تھے۔

"بے وفا، بے مروّت دوست! آ گئی میری یاد؟" عنوہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ حنا دھپ سے اس کے قریب بیڈ پر ڈھے گئی تھی۔

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ ایسی "پیا" کو پیاری ہوئی ہو کہ سدھ بدھ ہی بھول گئیں۔ یعنی کہ حد ہی ہوگئی۔ ایک فون کرنے کی توفیق نہیں ہوسکی تمہیں۔" حنا تو پہلے سے ہی بھری بیٹھی تھی، ایک دم پھٹ پڑی۔

"سوری یار! میں اپنی غلطی تسلیم کرتی ہوں۔" عنوہ نے فوراً سیز فائر کیا۔

"چلو، ہم نے بھی معاف کیا۔" حنا نے شاندار انداز میں کہا تھا اور پھر قدرے تجسس بھرے لہجے میں بولی۔ "یار! تمہارے لان میں پھولوں کے کنج کے پاس ایک اُداس شہزادی بیٹھی تھی۔ کون ہے وہ؟ زیان بھائی کی بہن یا کزن؟"

"نہ بہن نہ کزن۔" وہ بال سمیٹ کر بولی تھی۔

"تو پھر کون ہے؟ ویسے ہے تو بہت خوب صورت۔ کاش میرا کوئی بھائی ہوتا تو اسے ضرور بھابی بنا لیتی۔" حنا نے مصنوعی آہ بھری۔

"منہ دھو رکھو۔" عنوہ نے جمائی روکتے ہوئے کہا۔

"منگنی شدہ ہے؟" حنا نے اندازہ لگایا تو وہ ہنس پڑی۔

"نہیں، شادی شدہ ہے۔"

"ایک تو ہر خوب صورت لڑکی پر شادی شدہ کا ٹیگ لگ جاتا ہے۔" حنا نے حاسدانہ انداز میں کہہ کر قہقہہ لگایا تھا پھر قدرے رازداری سے بولی۔

"اگر محترمہ شادی شدہ ہیں تو ادھر کیوں دکھائی دے رہی ہیں؟ انہیں اپنے گھر یعنی سسرال میں ہونا چاہئے۔"

"تو اپنے گھر یعنی سسرال ہی میں تو ہے۔" عنوہ نے چبا چبا کر کہا تھا۔

"میں سمجھی نہیں؟ زیان بھائی کا کوئی اور بھی بھائی ہے؟" حنا نے اُلجھن بھرے انداز میں کہہ کر بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

"میرے خیال میں تو زیان اکلوتے ہیں۔" وہ پُرسوچ لہجے میں آنکھیں سکیڑ کر بولی تھی۔ حنا نے ماتھا پیٹ لیا۔

"تو پھر ان خاتون کا اس گھر سے کیا تعلق؟"

"وہی جو میرا تعلق ہے اس گھر سے۔ اس طرح رانیہ بھی شراکت دار ہے۔" عنوہ کا انداز ہنوز غیر سنجیدہ تھا۔

اب کے حنا قدرے ٹھٹک گئی تھی۔

"پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟ صاف صاف بات کرو۔ میرا دم نکلا جا رہا ہے۔" حنا نے خفگی سے کہا۔ اس کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔ نہ جانے کیوں اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا۔

"بھئی سیدھی سی بات تمہاری کھوپڑی میں نہیں سما رہی۔ زیان کے گھر میں بھلا کوئی عورت بغیر تعلق کے کیوں رہے گی؟ رشتے کی نوعیت جاننا چاہ رہی ہو تو بتا دیتی ہوں۔ ذرا تحمل سے سننا۔ وہ زیان کی بیوی ہے۔" وہ حنا کے جذباتی پن سے واقف تھی، اسی لئے تنبیہا بولی تھی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ کیا بک رہی ہو؟" حنا نے صدمے سے گنگ اس کا مطمئن انداز ملاحظہ کر کے ایک زوردار چیخ ماری۔

"وہی جو تم سن چکی ہو۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"یہ میری نظر کا دھوکا ہے یا ایک تلخ حقیقت؟" اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں، اسے یقیناً عنوہ سے کسی ایسے انکشاف کی توقع نہیں تھی۔ ورنہ وہ رانیہ کا ذکر ہی نہ چھیڑتی۔

"مائی ڈیئر حنا! یہ دنیا ہے اور یہاں کچھ بھی، کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ بس ہمارا ذہن اور دل ان حقیقتوں کو قبول نہیں کرتا۔" عنوہ مسکرائی اور بولی۔

"چھوڑو ان باتوں کو...... یہ بتاؤ، چائے لو گی یا ٹھنڈا؟ ویسے ٹائم کیا ہوا ہے؟ ابھی میں نے تیار بھی ہونا ہے۔ آج گھر میں چھوٹی سی پارٹی ہے۔ زیان کے فرینڈز آئیں گے۔"

"عنوہ! تم...... تم نے یہ سب کیسے برداشت کر لیا ہے؟ کم از کم میں تمہاری جگہ

ہوتی تو ہر شے تہس نہس کر کے اس فساد کی جڑ کو ہی ختم کر ڈالتی۔ تم نے صبر کا کون سا گھونٹ پی کر ''سمجھوتے'' کے ایگری منٹ پر دستخط کر دیئے ہیں؟ یہ سب کیا ہے عنوہ!'' وہ سخت شاک کے عالم میں بار بار بولے جا رہی تھی۔ عنوہ نے اس کا ہاتھ تھام کر ریلیکس کرنا چاہا تھا۔

''برداشت تو کرنا پڑتا ہے ڈیئر! جب پیچھے کھائی ہو، منزلیں گم ہوں، راستوں کی خبر نہ ہو تو واپس مڑنے کا فائدہ؟ اس سے بہتر نہیں کہ اپنی موجودہ زندگی سے صبر شکر کے ساتھ کمپرومائز کر لیا جائے۔''

''تم نے آنٹی کو تو بتانا تھا۔'' وہ رو دینے کو تھی۔ آنسو آنکھوں کے بند توڑنے کے قریب تھے۔

''اس سادگی اور بے خبری کا نظارہ کر کے مجھے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔'' عنوہ نے حد درجہ طنز بھرے انداز میں کہا اور مزید بولی۔

''آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ممی پوری ''باخبر'' تھیں۔ بس انہوں نے ہمیں ہی بے خبری میں مارا ہے۔''

''اُف......زیان بھائی نے دوسری شادی کر لی۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا۔ تم جیسی لائف پارٹنر کے ہوتے ہوئے کوئی اندھا ہی ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ مم......میں زیان بھائی سے ضرور دو دو ہاتھ کروں گی۔ دن دیہاڑے ایسا ظلم اور تم جیسی صدا کی بزدل، احتجاج تک نہیں کیا۔'' حنا نے غصے کے عالم میں مٹھیاں بھینچیں۔

''تمہارے غصے کا گراف کم کرنے کے لئے بتا دیتی ہوں کہ خیر سے دوسرا ہمارا نمبر ہے۔ مطلب رانیہ پہلے سے موجود تھی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور پھر دوپٹہ اُٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

''رانیہ، زیان بھائی کی پہلی بیوی ہے؟'' حنا نے حیرت سے کہا۔

''ہاں۔ اب مزید میرا دماغ مت چاٹنا۔ یہ بتاؤ، آج میں کون سے کپڑے پہنوں؟ یہ بلیک ٹھیک رہے گا؟'' اس نے وارڈروب کھول کر دو تین اسٹائلش قیمتی سوٹ نکال کر حنا کے سامنے پھیلائے۔

''یہ بلیک والا زیادہ اچھا ہے، تم پہ بہت سوٹ کرتا ہے یہ کلر۔'' حنا نے ستائشی نگاہوں سے کپڑوں کا جائزہ لے کر بلیک کلر کے سوٹ کو منتخب کیا تھا اس کے لئے۔

''یار عنوہ! تم رانیہ کے ساتھ رہ رہی ہو۔ زیان بھائی سے کہنا تھا، تمہیں الگ گھ

لے دیتے۔'' کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر کلینزنگ کرتی عنوہ سے مخاطب ہوئی تھی۔

''رانیہ بے چاری قطعاً بے ضرر ہے۔'' وہ مصروف انداز میں بولی تھی۔

''میں چلتی ہوں عنوہ! پھر آؤں گی۔'' اس کا دل حد درجہ برا ہو گیا تھا۔

''کہاں جا رہی ہو؟ پارٹی اٹینڈ کرو۔ ڈنر کے بعد میں تمہیں چھوڑ آؤں گی۔'' عنوہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی بٹھایا۔

''ابو انتظار کر رہے ہوں گے یار! ویسے بھی یہ بڑے لوگوں کا فنکشن ہے۔ میں کیا کروں گی بھلا؟'' حنا نے سستی سے کہا تھا۔

''وہی کرنا جو میں کروں گی۔ یعنی خاموش تماشائی۔ خواتین کی ڈریسنگ دیکھیں گے، ان کے میک اپ اور جیولری پر تبصرے کریں گے۔ انہوں نے جو ایک دوسرے کی برائیاں کرنی ہیں تو ہم بھی خاموشی سے سنتے رہیں گے۔ ویسے ایسی پارٹیوں میں یہی کچھ تو ہوتا ہے۔ سامنے تعریفیں اور پیٹھ پیچھے غیبتیں۔'' عنوہ نے بے زاری سے کہہ کر آئینے میں تذبذب کا شکار حنا کو دیکھا اور بولی۔

''آؤ، تمہاری بھی کلینزنگ کر دوں۔ اور ان میں سے اپنے لئے بھی ڈریس منتخب کر لو۔ اُٹھو بھی حنا! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ پھر ذرا کچن کا جائزہ لیتے ہیں۔''

''میں پہلے ابو کو فون کر لوں......اور ہاں، یہ تو بتاؤ تمہارے ''سرتاج'' کب تک آئیں گے؟''

''بس آنے ہی والے ہیں۔ تم ذرا جلدی سے تیار ہو جاؤ، میں رانیہ کو دیکھ لوں۔ نہ جانے صاحب بہادر کا اس معصوم کے لئے کیا آرڈر ہے۔'' وہ تیز تیز بولتی باہر نکل گئی تھی بلکہ حنا حیران پریشان سی دیکھتی رہ گئی۔

''یہ عنوہ بھی کمال کرتی ہے۔ رانیہ کا اتنا خیال کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔'' اس نے حیرت سے سوچا۔

"امی! آپ کو شگفتہ آنٹی کی فیملی کیسی لگی؟"

سارہ اور سنیہ دروازے سے چپکی مبین اور امی کے درمیان ہونے والی میٹنگ کا متن جاننے کے لئے بے چین تھیں۔ انہوں نے سانس روک کر امی کا جواب سنا، فاخرہ کہہ رہی تھیں۔

"باقی سب تو ٹھیک ہے، رمیز میں کوئی کمی نہیں۔ بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے۔ مگر ایک مسئلہ ہے۔" فاخرہ ایک پل کو رکیں تو ان دونوں کو بے چینی لاحق ہوگئی۔

"کیسا مسئلہ؟" مبین نے تفکر سے پوچھا۔

"رمیز کی ایک بیوہ بہن اور دو بچے بھی ہیں۔" فاخرہ پُرسوچ انداز میں بول رہی تھیں۔

"تو پرابلم کیا ہے؟" وہ امی کا مفہوم سمجھا نہیں تھا، اسی لئے حیرانی سے بولا۔

"کافی سخت مزاج کی لگتی ہے مجھے زرین۔ ہمارے ساتھ تو ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کی اس نے۔ شگفتہ خود بیٹی کے رویے سے پشیمان تھیں۔" فاخرہ نے اُلجھن سے بیٹے کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔

"امی! آپ پریشان نہ ہوں، اللہ کا نام لے کر ہاں کہہ دیں۔ یہ بہت معمولی بات ہے۔ اتنا اچھا رشتہ ایسی بودی سی وجہ کے لئے ہاتھ سے گنوانا دانش مندی نہیں" مبین نے اس کا ہاتھ نرمی سے دبا کر تسلی آمیز لہجے میں کہا تھا مگر فاخرہ کا تفکر ہنوز برقرار تھا۔ جو باتیں وہ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھیں، وہ مبین کو سمجھانا بہت مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھیں۔

"کل خالہ آئیں گی تو میں انہیں "ہاں" کہہ دوں گی۔" وہ خود بھی اپنی اس بے اُلجھن کی وجہ سے رمیز جیسے لڑکے کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ سارہ اور سنیہ دونوں

آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو "اوکے" کا سگنل دیا اور پھر چپکے سے اپنے مشترکہ کمرے میں کھسک آئیں۔

زروہ اسکول سے بچوں کی لائی کاپیاں چیک کر رہی تھی۔ انہیں معنی خیزی سے مسکراتے دیکھ کر چونک سی گئی تھی۔ مگر پھر دوسرے ہی پل سر جھٹک کر دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

"آئیں گے دولہا راجہ
بجے گا بینڈ باجہ"

ان دونوں نے میز بجا بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر ہی لیا تھا۔

"کیا ہوگیا ہے تم دونوں کو؟ مہک سو رہی ہے۔ کیا اسے چیخ چلا کر اور بھونڈی آواز میں گا کر جگانا ہے؟"

"خبر ہی ایسی خوشی کی ملی ہے کہ ناچنے گانے بلکہ بھنگڑا ڈالنے کو جی چاہ رہا ہے۔" سنیہ اس کے قریب دھپ سے بیٹھتے ہوئے چہکی تھی۔

"یہ خوشی کی خبر کون سا چینل نشر کرے گا؟" سارہ نے پُرسوچ انداز میں سنیہ کی طرف دیکھا۔

"کیا بک بک لگا رکھی ہے؟ کام کرنے دو مجھے۔" زروہ اگرچہ ان کی معنی خیز نظروں کے تبادلے سے کسی خاص خبر کے متعلق جان چکی تھی، تاہم خود کو لاپروا ظاہر کرتے ہوئے بولی تھی۔

"آپ خود کو بے نیاز ایکسپوز بے شک شوق سے کرتی رہیں، مگر ہم بھی بڑے "وہ" ہیں۔ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔" سارہ نے مبالغہ آمیزی کی حد کرتے ہوئے کہا۔

"آپی کا زیادہ امتحان مت لو سارہ! بتا دو، بے چاری آپی کو کہ خالہ اور امی کی مشترکہ کوششوں کی وجہ سے آپ کو گھر بدر کرنے کی سازش پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔" سنیہ نے بڑے ہی ڈرامائی انداز میں کہہ کر قہقہہ لگایا تھا۔

"کب؟" وہ بے ساختہ بولی اور پھر کہہ کر پچھتائی۔ ان دونوں نے اس کا بھرپور ریکارڈ لگا دیا تھا۔

"اوہو...... کب؟...... کتنے دن بعد؟" سارہ مسکرا مسکرا کر زروہ کو چڑا رہی تھی۔

"بکو مت۔ میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں۔" زروہ جھینپ کر ڈپٹنے لگی تھی مگر ان

دونوں پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''مطلب کوئی بھی کیوں نہ ہو، بات تو گھوم پھر کر وہیں آتی ہے۔ ساجن جلدی آنا رے۔ ہم کو لے کر جانا رے۔'' سارہ نے مکاری سے آنکھیں پٹپٹائیں تو وہ زچ ہو کر چلا اُٹھی۔

''پوچھتی ہوں میں امی سے کہ کون سی کھچڑی چپکے چپکے پکا رہی ہیں۔'' زروہ تنگ کر اٹھی اور دھپ دھپ کرتی اسٹور میں گھسی فاخرہ کے قریب آ کر غصے سے بولی۔

''امی! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟........آپ جانتی تو ہیں گھر کے حالات۔''

''میں اپنی مجبوریوں کی زنجیر میں تمہیں کیوں باندھوں زروہ؟ اتنا خود غرض سمجھ رکھا ہے تم نے اپنی ماں کو؟ دوسرے بچوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے چکر میں تمہارے ساتھ کیوں دشمنی کروں میں؟ یہی تو عمر ہے گھر بسانے کی۔ وقت ریت کی طرح ہاتھ سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں تمہارے بالوں میں چاندی اترنے کا انتظار کروں، اس گھر کے حالات سنوارنے کے چکر میں تمہارے ساتھ زیادتی کرنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ نہ جانے کون سی ایسی انتہائی خود غرض، مطلب پرست، عاقبت نااندیش مائیں ہوتی ہیں۔''

فاخرہ نے نرم آواز میں کہہ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''تمہارے جیسی بیٹیاں قدرت کی طرف سے انمول تحفہ ہوتی ہیں۔'' ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

''امی! مبین ابھی پوری طرح سے صحت مند نہیں ہوا۔ باقی تینوں زیر تعلیم ہیں۔ آپ کی پنشن سے کیسے گزارا ہو گا؟ اوپر سے یہ ہنگامی رشتہ طے کر دیا ہے۔'' وہ بے حد پریشانی کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

''اللہ بہتر کرے گا۔ اسی پر بھروسہ ہونا چاہئے۔'' فاخرہ مطمئن تھیں۔

''امی! آپ نے ''اُن'' سے بات کر لیتی تھی۔ میں شادی کے بعد بھی جاب جاری رکھوں گی۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد زروہ نے آہستگی سے کہا تھا۔

''تم فکر مند نہ ہو۔ کوئی نہ کوئی وسیلہ اللہ بنا دے گا۔ پتھر میں کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے، یہ پروردگار کا وعدہ ہے۔ بس ہم انسان ہی ناشکرے اور بے صبرے ہیں۔'' انہوں

نے حلاوت سے کہا اور پیٹی میں سے مطلوبہ تھیلی نکال کر کھولنے لگی تھیں۔

''اس میں کیا ہے امی؟''

زروہ نے تجسس سے ماں کی طرف دیکھا۔

''دو کنگن بچے تھے تمام زیور میں سے۔ یہ اچھے وقتوں میں تمہارے ابو نے بنوا کر دیئے تھے۔ باقی زیور تو بیچ دیا تھا مبین کے علاج کی غرض سے۔ یہ دو کنگن نہ جانے کیوں دل نہیں مانا تھا کہ بیچ دوں۔ اب تمہارے کام آ جائیں گے۔ خالی ہاتھ تو نہیں بھیجوں گی تمہیں۔'' وہ مصروف انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''امی! مجھے ان کی ضرورت نہیں۔'' اس نے محبت سے ماں کے ہاتھ تھام لئے اور بولی۔ ''جو آپ نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر مجھے زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا ہے اور جو بہترین تربیت آپ نے ہم سب کی بطور ماں اور باپ بن کر کی ہے، یہی ہمارا قیمتی اثاثہ ہے اور یہی ''اصل'' جہیز ہے۔''

''میری بچی! تم دنیا کی نظروں اور ان کی باتوں سے ناواقف ہو۔ لوگ ایسی باتوں کو کتابی باتیں سمجھتے ہیں۔'' فاخرہ کو دلی خوشی ہوئی تھی اپنی بیٹی کے اعلیٰ و ارفع خیالات جان کر۔ انہیں اپنی تربیت پر فخر محسوس ہوا تھا۔

''امی! ہم نے اپنی چادر دیکھنی ہے، لوگوں کی تو فطرت ہے باتیں بگھارنے کی۔'' زروہ نے نرمی سے کہا تھا اور مزید بولی۔

''آپ ٹینشن مت لیجئے گا، مجھے آپ کی محبتوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں چاہئے۔ نہ ہی مجھے کسی کی پرواہ ہے کہ لوگ باتیں بنائیں گے۔''

''میں نے کمیٹی ڈال رکھی ہے، پیسے مل گئے تو فرنیچر کا آرڈر دوں گی۔'' انہوں نے گویا زروہ کی بات سنی نہیں تھی۔ اس نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

❁

پارٹی کی ارینج منٹ وسیع و عریض قیمتی فرنیچر سے سجے شاندار لاؤنج میں تھی۔

جب وہ دونوں تیار ہو کر بیڈ روم سے باہر آئیں تو لاؤنج پر رک کر طائرانہ ستائشی نگاہ ڈال کر ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا۔

''ویسے عنوہ یار! زیان بھائی نے کیا کمال کی ''چیز'' منتخب کی ہے۔ سچ، تمہارے ''اُن'' کی چوائس بہت اعلیٰ ہے۔ بیویوں اور نوکروں دونوں کے معاملوں میں خوب

چھانٹ کر آبگینے تلاش کیے ہیں۔"

حنا نے ملازموں کو ہدایات دیتی پٹر پٹر انگریزی بولتی مس نینی کو دیکھ کر کہا تھا۔ اب وہ دونوں ڈائننگ ہال میں داخل ہو رہی تھیں۔

وسیع و عریض ٹیبل پر قیمتی نفیس برتن ایک ترتیب سے رکھے تھے۔ ان کے درمیان رکھا نہایت اسٹائلش اور بے حد قیمتی کٹلری سیٹ دور سے ہی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ سب مس نینی کا کمال تھا۔ حنا مسلسل مس نینی کی تعریف کر رہی تھی۔

"اِن فیکٹ شی از اے گڈ ایڈمنسٹریٹر۔ (حقیقت میں وہ ایک اچھی منتظم ہے)"

عنوہ نے بھی بے ساختہ ستائشی انداز میں کہا تھا۔ وہ دونوں سٹنگ روم میں ترتیب سے رکھی دو چیئرز گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ اسی پل مس نینی، بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئی۔

"میم! کچھ چاہیے؟ جوس، کولڈ ڈرنک، کافی وغیرہ؟"

"آں....... ہاں، جوس لے آئیں۔ البتہ فریش ہونا چاہیے۔"

"مینگو یا ایپل؟" مس نینی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"نہ مینگو نہ ایپل۔ آپ یوں کریں، گریپس کا جوس لے آیئے۔" عنوہ نے حنا کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"میم! آئی ایم سوری۔ گریپس تو نہیں ہیں، البتہ پیچ اور سویٹ لیمن موجود ہیں۔ اوہ سوری، یاد آیا۔ پوم گرینیٹ کا بالکل فریش کریٹ آیا ہے۔ پیور ریڈ ہیں۔ صاحب کے فرینڈز شوق سے انار کا جوس پیتے ہیں۔" مس نینی نے قدرے شرمندہ انداز میں جواب دیا تھا۔

"وہ تو سوئر ہوگا۔ گلا خراب ہونے کا خدشہ ہے۔ آپ ایپل جوس ہی لا دیں۔" عنوہ نے بھنا کر کہا تھا۔ وہ "یس میم" کہہ کر تابعداری سے سر ہلاتی پلٹ گئی تھی جبکہ حنا لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ اس کی ہنسی روکنا بہت مشکل کام تھا۔

"یس میم، نو میم، سوری میم۔ ایک ہی گردان بولتے یہ تھکتی نہیں۔" وہ آنکھوں میں ہنسی کی بدولت اُترنے والے پانی کو ٹشو سے صاف کرتی بمشکل بولی تھی۔

عنوہ بھی مسکرا دی۔

"یہ تو صرف ٹریلر تھا۔ پوری فلم آرام سے دیکھنا۔ مس نینی سے تو فرمائش کر کے بندہ پھنس ہی جاتا ہے اور پھر اس گھڑی کو کوسنا شروع کر دیا جاتا ہے جب ان محترمہ سے کچھ لانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اگر آپ کو کافی کی طلب ہے تو محترمہ

پوچھیں گی۔ کولڈ کافی، چاکلیٹ کافی، کریم یا سمپل؟ اگر چائے کی فرمائش کریں گی تو پہلے آپ سے پوچھا جائے گا سپرٹ ٹی، گرین ٹی یا پھر مکس؟ اگر کبھی لنچ یا ڈنر میں آپ کا نان کی جگہ چپاتی کھانے کا موڈ بن جائے تو پہلے مس نینی آپ کی چوائس کے بارے میں معلومات لیں گی۔ مثلاً لوف یا ملٹ لوف یا میز لوف۔ اب کوئی ان سگھڑ خاتون سے بھلا پوچھے کہ ہم نے گوشت پوست کا پہاڑ بننا ہے، مکئی اور باجرے کی چپاتیاں کھا کر۔" عنوہ بہت مزے سے کہہ رہی تھی اور حنا کی ہنسی کے فوارے پھوٹ پڑے تھے۔

"یقیناً مس نینی کو غلط فہمی لاحق ہے کہ تم پچھلے جنم میں گاؤں کی الہڑ مٹیار رہ چکی ہو۔" حنا مسکرائی اور پھر رمی (رمضان) کو جوس کی ٹرے پکڑے اندر آتا دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

"عمر صاحب کا شادی کا کیا ارادہ ہے؟" چانک یاد آنے پر عنوہ نے سوچا، لگے ہاتھوں حنا کی بھی بولتی بند کر دی جائے۔ خلافِ توقع وہ چہکنے کے بجائے قدرے گم سم سی ہو گئی تھی۔

"حنا! خیریت تو ہے؟" وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

"ہوں، سب خیریت ہے۔" حنا کی پھیکی سی ہنسی نے اسے ہزاروں خدشات میں مبتلا کر دیا۔

"تم پریشان کیوں ہو گئی ہو؟ کوئی پرابلم ہے تو شیئر کر لو۔"

"یار! پوری لائف ہی پرابلمز کا شکار ہے۔ بندہ کس کس بات پر دکھی ہو؟" حنا نے بے زاری سے کہا۔

"بتا بھی چکو۔ میرا بی پی لو ہونے لگا ہے۔" عنوہ نے تفکر سے کہا۔

"عمر نے منگنی توڑ دی ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

"مگر کیوں؟" عنوہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔

"اس کی چوائس کوئی اور ہے۔"

"تو منگنی سے پہلے اسے یہ باتیں سوچنا چاہیے تھیں۔ اس نے تمہیں ہرٹ کیا ہے۔ ایسے واہیات لوگوں کو میرا دل کرتا ہے شوٹ ہی کر دوں۔ ان مردوں نے "عورت" کو نہ جانے سمجھ کیا رکھا ہے۔ عورت کے ایموشنز کی کوئی اہمیت نہیں ان کے لیے۔" عنوہ گہرے دکھ سے نڈھال کہہ رہی تھی۔ حنا اس کی واحد دوست، راز دار

تھی۔

''مٹی ڈالو اس قصے پر اور ذرا باہر کے شور پر کان دھرو۔ میرے خیال میں آنرڈ گیسٹ (معزز مہمان) آ گئے ہیں۔''

''ہاں، مجھے بھی گاڑیوں کے دروازے کھلنے بند ہونے کی آواز آئی ہے۔'' عنوہ نے بھرپور تائید بھرے انداز میں سر ہلایا تھا۔ اسی پل زیان سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس، گلے میں ٹائی لٹکائے سٹنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ دونوں ہی گڑبڑا کر اٹھ گئی تھیں۔

''کیا بات ہے خاتونِ خانہ کی۔ ادھر کونے میں بیٹھ کر نہ جانے کون سی میٹنگ فرمائی جا رہی ہے۔ گھر آئے مہمانوں کو ویلکم کہنے کے کچھ مینرز تو ہوتے ہوں گے۔'' زیان دھیرے سے چلتا ہوا ان دونوں کے قریب آ کر طنزیہ لہجے میں بولا تھا۔ وہ دونوں ہی بری طرح شرمندہ ہو گئیں۔ حنا کو کچھ نہ سوجھا تو سلام ہی جھاڑ دیا۔

''کیسی ہیں آپ؟........ یقیناً ٹھیک ٹھاک ہوں گی۔ کچھ مینرز اور ایٹی کیٹس اپنی فرینڈ کو بھی سکھا دیتے، جنہیں سلام کرنے کا بھی ہوش نہیں۔ آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے دیکھ رہی ہیں۔'' زیان کون سا لحاظ کرتا تھا۔ عنوہ نے ٹھیک ہی اسے ''بے لحاظ'' کا خطاب دے رکھا تھا۔

''آپ کب آئے ہیں؟'' اس نے کھسیا کر آہستگی سے پوچھا۔

''جب آپ مردوں کو شوٹ کرنے کی پلاننگ فرما رہی تھیں اور........''

''جورو کے غلام! نکل آ باہر........'' زیان کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ ایک دم دھاڑ سے دروازہ کھلا تھا۔ تین چار خوبرو سے نوجوان آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے تین چار ماڈرن اور خوب صورت لڑکیاں بھی تھیں۔ ایک دم رنگ و نور کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔

''ہائے بھابی!........ ہیلو بھابی!........ کیسی ہیں بھابی؟'' قہقہے، ہنسی، آوازیں۔ ماریہ، ماہم اور سوما بھی آ گئی تھیں۔ زوہا نے آگے بڑھ کر میوزک آن کر دیا تھا۔ سب زیان کے پیچھے ایک مرتبہ پھر لاؤنج میں جا چکے تھے۔ عنوہ، حنا کو بھی گھسیٹ لائی۔ زیان سے مزید جھاڑ کھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس کا۔ حنا کو تو گھبراہٹ ہونا ہی تھی، جبکہ وہ خود بھی بے حد بوکھلا سی گئی تھی۔ ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ کون کہتا تھا کہ وہ کسی اپر کلاس سے تعلق رکھنے والی ہے۔

اسے ممی کی بات یاد آئی۔ وہ اکثر اس کی بوکھلاہٹوں کو ملاحظہ کر کے جتاتی رہتی تھیں

کہ اسے کسی کلرک کے گھر پیدا ہونا چاہئے تھا۔

''زیان! یہ اے سی کولنگ کیوں نہیں کر رہا؟'' ماریہ نے بے تکلفی سے زیان کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا اور پھر گلے میں لٹکا رسی نما اسکارف اتار کر پھینک دیا۔ زویا اپنی پسند کا میوزک ترتیب دے رہی تھی۔ حسن، اسد اور احتشام ایک صوفے پر نیم دراز تھے۔ ان کے قریب کارپٹ پر سوما اور ماہم بیٹھی تھیں۔ عنوہ اور حنا کو آتا دیکھ کر حسّام اور حسن سیدھے ہو گئے۔

''ہیلو بھابی! یہ کون ہے؟'' حسّام اور حسن نے دلچسپی سے پوچھا۔

''بھابی کی فرینڈ ہیں۔ دھیان سے، پہلے ہی بہ مشکل ٹھیک ہوئے ہو، پھر سے ہڈیاں نہ تڑوا لینا۔'' سوما نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔ حسّام جھینپ گیا۔

''یار! ان میں کپلز کون کون سے ہیں؟'' حنا تو گھبرا اُٹھی تھی۔ حسّام دلچسپی سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

''ہم سب ایک دوسرے کے کپل ہیں۔'' ماریہ کی سماعتیں کافی تیز تھیں۔ فوراً فقرہ کیچ کرتے ہوئے برجستہ بولی۔

''بکو نہیں۔ میں تعارف کرواتی ہوں۔'' زویا، حسن کے ہاتھ سے موبائل چھین کر کھڑی ہو گئی تھی۔ موبائل کو مائیک کے انداز میں پکڑ رکھا تھا۔ ''حسن کی مسز سوما اور اسد کی مسز ماہم ہے۔ حسیب اور کومل بس آنے والے ہیں اور باقی سب چھڑے چھانٹ ہیں۔ ان کی بے تکلفی پر پریشان مت ہونا۔ محفلوں میں یہ ایسے ہی اوور ایکٹنگ کرتے ہیں۔'' زویا، ماہم اور اسد پر طنز کرتے ہوئے بول رہی تھی۔ چونکہ ماہم، اسد کے کان میں نہ جانے کیا کھسر پھسر کر رہی تھی، اسی لئے زویا نے اس پر کمنٹس پاس کئے تھے۔ ماہم قدرے گڑبڑا سی گئی تھی۔

''عنوہ! تم ہماری بے تکلفی پر بھی ایکشن مت لینا۔ کیونکہ ہم سب کلاس فیلوز ہیں۔'' ماریہ نے اونچا سا قہقہہ لگایا تھا۔ باقی سب تو ٹھیک تھے، عنوہ کو یہ ماریہ اچھی نہیں لگی تھی۔

''عنوہ! میں گھر جانا چاہتی ہوں۔'' حنا نے دبی دبی آواز میں کہا تھا۔ حسّام ایک دم سیدھا ہو گیا۔

''زیان! حنا گھر جانا چاہتی ہے۔ آپ بابا (ڈرائیور) سے کہیں اسے چھوڑ آئے۔'' عنوہ اس کی گھبراہٹ اور بے چینی کے پیش نظر بولی تھی۔

سب ایک دم چونک سے گئے۔

''ابھی سے؟'' کئی آوازیں ایک ساتھ اُبھریں۔

''حنا کے فادر اکیلے ہیں اور ان کی........''

''کیا انہیں ڈر لگتا ہے؟'' ماریہ نے معصومیت کے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ حشام نے ناگواری سے ٹوکا۔

''مذاق کرتے ہوئے مقابل کے موڈ کو دیکھ لینا چاہئے۔''

''میں پھر آؤں گی۔'' حنا آہستگی سے اس کے کان میں منمنائی تھی۔

حنا کے جانے کے بعد اسے ایک پل کے لئے یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ اجنبی لوگوں کی بھیڑ میں بالکل اکیلی رہ گئی ہے۔

''یار زیان! اتنی اچھی بھابی کہاں سے امپورٹ کی ہے؟'' حسن نے مصنوعی حیرت سے کہا تھا۔ ماریہ جو کہ زیان سے نہ جانے کون سے راز و نیاز میں مصروف تھی، حسن کے متوجہ کرنے پر بدمزہ سی ہوگئی۔

''انہیں ہماری کرپٹ ساس نے اسپیشلی اللہ سے ہمارے لئے مانگا تھا۔'' زیان سے کسی اچھی بات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ عنوہ کا چہرہ مارے خفت اور اشتعال کے سرخ ہوگیا۔

''زیان کو ماریہ سے بچا کر رکھنا۔ بڑی تیز شے ہے۔ ویسے ایرانی ہے مگر سالوں سے ادھر ہے۔ شاید بچپن سے۔ اس کی مدر کا تعلق تائیوان سے تھا اور باپ کا ایران سے۔ کافی سال پہلے سیٹھ حاکم اسے اپنی بیٹی بنا کر لے آئے تھے۔ ان کی اولاد نہیں تھی۔'' ماہم نے چپکے سے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''ہمارے، تمہارے شوہروں کی بڑی پیاری، دلاری ہے۔ ذرا لگام کھینچ کر رکھنا زیان کی۔''

''کیا پٹیاں پڑھا رہی ہو تم بھابی کو؟'' اسد نے ماہم کو آنکھیں دکھائی تھیں۔

''کچھ نہیں۔'' ماہم نے ہاتھ جھاڑے۔ ''ریسیپی پوچھ رہی تھی ایک اٹالین ڈش کی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔

زیان کو جوس پیتے ہوئے زور کا اچھو لگ گیا تھا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟'' حشام نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ماہم کے سفید جھوٹ پر یقین نہیں آیا۔'' حسن، اسد کو بتا رہا تھا۔ عنوہ جھینپ کر

اُٹھی تھی۔

گوٹھ کے آغاز سے لے کر اختتام تک اور اس سے بھی تین چار سو میل دور تک پھیلی وسیع جاگیر کے بابا صاحب اکیلے وارث تھے۔

ان کی سادگی کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ اس قدر صاحب جائیداد اور رئیس آدمی ہیں۔ نہ شخصیت میں کوئی بناوٹ تھی، نہ معیارِ زندگی بہت اعلیٰ۔ لباس، خوراک، رہائش سب میں سادگی کی واضح جھلک تھی۔

''اتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ، صاحب حیثیت اور اعلیٰ حسب نسب رکھنے والے شخص نے شادی کیوں نہیں کی؟'' یہ سوالیہ نشان بہت واضح الفاظ میں جگمگا رہا تھا۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ عبدالباری ان کا سگا بیٹا نہیں بلکہ بہت عزیز دوست کا بیٹا ہے۔

بابا صاحب کی ذات سب کے لئے محبتوں کا وسیع سمندر تھی۔ ہر کوئی اپنی تکلیف، اپنا دکھ ان کی جھولی میں ڈال کر شانت ہو جاتا تھا۔ اسے آج بھی پوری جزئیات سے وہ رات یاد تھی، جب وہ پہلی مرتبہ ایک اجنبی خاتون کے توسط سے بابا صاحب سے ملی تھی۔ اس کا دل ''غم'' اور ''مصائب'' کے بوجھ سے گھائل تھا۔ نفس نے دنیاوی لذتوں کے پیچھے اسے آلودہ کر دیا تھا۔ روح زخم زخم تھی۔ اسے سکون کی کھوج تھی۔ وہ مصنوعی روشنیوں سے چھٹکارا پا کر اصل اور سچی روشنی کی تلاش میں تھی۔

اس نے بابا صاحب سے سارے دکھ کہہ دیئے تھے۔ ندامت کے سارے اشک بہا دیئے تھے۔

''بابا صاحب! مجھے سکون چاہئے۔ میرے اندر آگ کے بھانبڑ جل رہے ہیں۔ میرا وجود آگ کی لپٹوں کی زد میں ہے۔ میں کسی کی ''بددعا'' کے حصار میں ہوں۔ مجھے اس ''بددعا'' کی زنجیروں سے رہائی چاہئے۔ مجھے سب نے ٹھکرا دیا ہے۔ ''وہ'' بھی میری نہیں سنتا۔ میں کس کے در سے بھیک مانگوں؟........ میں کس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں؟ میرا کشکول بھی خالی ہے، میرا دل بھی خالی ہے، میرے ہاتھ بھی خالی ہیں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''درکنون! اس پر نظر رکھو، جو تم پر نظر رکھتا ہے۔ اس کے سامنے رہو، جو تمہارے سامنے رہتا ہے۔ صرف اسی سے محبت کرو، جو تم سے محبت کرتا ہے۔ اس کی بات مانو جو

تمہیں اپنی طرف بلاتا ہے۔ اپنا ہاتھ اسے دو جو تمہیں گرنے سے سنبھال لے گا، بچا لے گا۔ جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا۔ غموں کے اندھیروں میں بھٹکنے نہیں دے گا، نجاستیں دھوئے گا، میل کچیل سے پاک کرے گا۔ تم کو تمہاری سرانڈ اور بدبو اور پست ہمتی اور نفس سے نجات دے گا۔ تمہارے نفس اور لامحدود خواہشوں نے ہر عمدہ اور نفیس شے سے تمہیں محروم کر دیا ہے جو تمہیں اللہ نے عطا کی تھیں۔

ہائے افسوس!........ کب تک خلق؟ کب تک خواہش؟ کب تک رعونت؟ کب تک حشمت؟ کب تک دنیا؟ کب تک حُسن؟........ ہر شے فانی ہے، باقی اللہ کی ذات۔ اوّل بھی وہ، آخر بھی وہ۔ دلوں کی محبت، روحوں کا اطمینان۔ یہ داناؤں کے قول ہیں۔ یہ حکمت کی باتیں ہیں۔'' ان کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ آنکھوں سے آنسو رواں، دل غم زدہ اور وجود لرز رہا تھا۔ ان کا کپکپاتا ہاتھ اس کے سر پر آن ٹھہرا۔

''بہت کثرت سے کلام الٰہی کی تلاوت کیا کرو، اس کے حرفوں کی سیاہی میں وہ سفیدی چھپی ہوئی ہے جو تمہارے گناہوں کی سیاہی کو دور کر کے تمہارے دل کو نور ایمان سے روشن کر دے گی۔'' ان کا حرف حرف درمکنون کے دل میں چبھی ایک ایک پھانس نکال رہا تھا۔

''درمکنون! آیئے پلیز۔'' وہ جیپ کا دروازہ کھولے منتظر کھڑا تھا۔ درمکنون سوچوں کے گرداب سے بمشکل نکلی اور قدرے خجل سی ہو کر باہر آ گئی۔ وسیع و عریض قدیم طرز کی حویلی باہیں پھیلائے شان سے کھڑی تھی۔ پھاٹک کی نیم پلیٹ پر واضح لفظوں میں جگمگا رہا تھا۔ ''شاہ قدوس'' وہ آج ہی بابا صاحب کے ساتھ بستی سے گوٹھ، عبدالباری کے ہمراہ آئی تھی۔ حویلی کے برابر ایک اور عظیم عمارت تفاخر سے کھڑی تھی۔ عبدالباری اسی حصے کی طرف انہیں لے کر آیا تھا۔

یہ ایک اسکول کی شاندار، جدید سہولیات سے مزین عمارت تھی۔ پوری بلڈنگ کو خوب اچھی طرح سے دیکھنے کے بعد درمکنون کی نگاہوں میں ستائش تھی۔ ہر کلاس روم میں اے سی، سردیوں کے لئے ہیٹر کا انتظام، بہترین فرنیچر، کمپیوٹر سیکشن میں ترتیب رکھے تیرہ چودہ کمپیوٹر، وسیع و عریض لائبریری جن میں بچوں کی کتب، دینی کتابوں کی زیادہ تعداد تھی۔ ہاسٹل کی سہولت بھی موجود تھی۔

''تین مزید ٹیچرز کو اپائنٹ منٹ لیٹرز بھجوا دیئے تھے، بابا جان! اس قدر ملک

بے روزگاری ہے کہ یہاں تو لائنیں لگ گئی تھیں۔'' عبدالباری انہیں تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

''یہ ایک ورلڈ وائیڈ پرابلم ہے۔'' انہوں نے رنجیدگی سے کہا تھا۔ درمکنون حیران سی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اگر یہی عظیم الشان بلڈنگ کسی ڈیویلپڈ (ترقی یافتہ) علاقے میں بنی ہوتی تو لوگوں نے محض عمارت کو دیکھ کر ہی ریجھ جانا تھا۔ معیار اگرچہ کیسا ہی کیوں نہ ہوتا۔

''ایک پیریڈ میں قاری صاحب بچوں کو قرآن پاک کا سبق دینے کے لئے آیا کریں گے۔ کل میں نے ایک بچے سے کلمہ سنا تھا۔ اتنی غلطیاں تھیں تلفظ میں۔'' وہ بابا صاحب کے برابر چلتے ہوئے بتا رہا تھا۔

''بابا جان! میری خواہش ہے، کم از کم ہمارے علاقے اور اس کے اردگرد کی بستیوں سے دینی و دنیاوی ہر طرح کی جہالت کا خاتمہ ہو جائے۔''

''اِن شاء اللہ، ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوگی۔'' انہوں نے صدقِ دل سے کہا تھا اور پھر قدرے آہستگی سے مزید بولے۔ ''اسکول کے لئے ایک ایڈمنسٹریٹر کا ہونا بھی ضروری ہے۔''

''درمکنون ہے نا۔'' اس نے بے ساختہ کہا تھا اور پھر ان کی طرف جھک کر بڑے اعتماد سے بولا۔ ''بابا جان! آپ کو نہیں لگتا، یہ لڑکی جانے یا انجانے میں بالکل ٹھیک جگہ پر پہنچ گئی ہے۔ اس کا کردار یہیں فٹ آتا ہے۔''

''ہوں۔'' انہوں نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔ ''تمہیں درمکنون کیسی لگتی ہے؟''

''اچھی........ بلکہ بہت اچھی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اچھی تو وہ ہے، میں بطور لائف پارٹنر کے پوچھ رہا ہوں۔'' وہ دُور سنگی بینچ پر سوچوں میں گم بیٹھی درمکنون کو دیکھ کر بولے تھے۔

''مشرقی لڑکا ہوں، خود سے کیا بولوں۔ شرم و حیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' اس کے انداز میں بھرپور شرارت تھی۔

''ہوں۔'' وہ کھل کر مسکرا دیئے تھے۔

''اب کچھ کام کی بات کر لیں؟'' عبدالباری نے اجازت طلب نگاہ سے انہیں دیکھا تھا۔

''کیا ہم بے کار باتیں کر رہے ہیں؟''

"نہیں بابا جان! میرا یہ مطلب نہیں۔" وہ قدرے گھبرا کر وضاحت کرنے لگا تھا۔ پھر ان کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولا۔

"آپ کو نہیں لگتا، بابا جان! کہ یہ لڑکی بہت کیئرلیس (لاپروا) ہے۔ دیکھیں نا، آج کل کی لڑکیوں والی کوئی خوبی سرے سے موجود ہی نہیں...... نہ شاپنگ کا شوق، نہ ہلا گلا۔ لگتا تو نہیں، پنجاب یونیورسٹی کی پوزیشن ہولڈر ہے۔" وہ حیرانی سے کہہ رہا تھا اور بابا صاحب کچھ اور سوچ رہے تھے۔

"تمہیں کیا پتہ، باری! کہ یہ ان سب چیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے۔"

کوالیفیکیشن کے لحاظ سے پورا اسٹاف ویل ایجوکیٹڈ تھا۔ وہ اسکول کی منتظم اعلیٰ بنا دی گئی تھی۔ اسے اس ذمہ دار سیٹ پر بٹھانے والا خود اسلام آباد جا چکا تھا۔ بابا صاحب نے اس کے استفسار پر بتایا تھا کہ عبدالباری تقریباً ہر ویک اینڈ پر یہاں آتا ہے نئی نئی جاب کی مصروفیت کی وجہ سے۔

عبدالباری نے یونیورسٹی آف ایرڈ سے ایگری کلچر اور نیشنل یونیورسٹی سے ماسٹرز کر رکھا تھا۔ آج کل وہ مقامی کالج میں بطور لیکچرار جاب کر رہا تھا۔

اسلام آباد سے تقریباً ساٹھ میل دور سرمئی پہاڑوں کے عین وسط میں واقع یہ گاؤں قدرت کی صناعی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ فلک بوس پہاڑ، سرسبز وادیاں، گیت گاتی ندیاں، تیز و تند ٹھاٹھیں مارتا دریا، طویل و عریض سبزہ زار، خوش نما جھیلیں، فطرت کے دیوانوں کا سب سے بڑا اور قیمتی سرمایہ تھا۔

آج چونکہ چھٹی تھی، اسی لئے وہ فرصت کے عالم میں قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہونے کی غرض سے باہر نکل آئی تھی۔

تاحدِ نگاہ سرسبز مرغزار اپنی رنگینی سے دل موہ لیتے تھے۔ قریب ہی کسی پہاڑ کے دامن سے دلکش آبشار اور جھرنوں کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ اس حسین وادی کے ایک طرف انگور، اخروٹ، چلغوزہ، خوبانی اور شہتوت کے بار آور درخت شان سے کھڑے تھے۔ دوسری طرف خوش خرام ندی اور سرمست دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ سبز کپڑوں میں ملبوس اس ماحول کا کوئی حصہ دکھائی دے رہی تھی۔

عبدالباری نے گلا کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ چونک کر سیدھی ہوگئی۔

"آپ کب آئے؟"

"کیا "بیویوں" والا سوال ہے۔" عبدالباری خوش دلی سے بولا تھا۔ دُرِمکنون نے ناگواری سے سر جھکا لیا۔

"میرے ساتھ اس لہجے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں۔"
"تو پھر کس لہجے میں بات کروں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔
"میں آپ سے کلام کرنا نہیں چاہتی۔" اس کی ناگواری ہنوز برقرار تھی۔
"مگر میں تو خواہش رکھتا ہوں آپ سے گفتگو کرنے کی۔"
"میں آپ کے گھر میں رہتی ہوں، اس بات کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیے۔"
"میرا گھر......" اس نے حیرانی سے کہا۔ "ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ آپ ہمارے گھر میں جلوہ افروز ہوں۔" عبدالباری کے لہجے میں رنجیدگی تھی۔
"میرا خیال ہے، میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔" اس نے غصے سے کہا تو وہ سرعت سے بولا۔
"نہیں، پلیز۔ آپ قدرتی حُسن سے لطف اندوز ہوں۔ مزاج پر اچھا اثر پڑے گا۔ میں ہی چلا جاتا ہوں۔"
وہ مسکراتا، گنگناتا پلٹ گیا تھا۔ درمکنون غصے سے بھناتی نیچے وادی میں اُتر آئی تھی۔ قطار در قطار بنے پتھروں کے سادہ مکان۔ وہ یونہی بے سبب ناک کی سیدھ میں چل رہی تھی، جب ایک جھنجلائی سی نسوانی آواز سنائی دی۔
"تم جان بوجھ کر ٹال مٹول سے کام لے رہے ہو۔ میں کوئی گرے پڑے خاندان کی نہیں۔ خان افراسیاب کی بیٹی ہوں۔" لڑکی کی آواز میں غرور چھلک رہا تھا۔
"میں مزید کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ میرے ساتھ دوٹوک بات کرو۔" وہ غصے سے پھنکاری۔
"اب اسی وقت میرے ساتھ رابطہ کرنا جب کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاؤ۔" اس نے آگ بگولا ہو کر موبائل کان سے ہٹا لیا تھا۔ اسی پل وہ غصے کے عالم میں پلٹی تھی اور نگاہیں اپنے سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی درمکنون پر گویا جم گئیں۔
"کک......کون ہیں آپ؟" اس نے قدرے ہکلا کر پوچھا تھا۔
"میں......" درمکنون نے اپنی طرف اشارہ کیا اور پھر درمیانی فاصلہ سمیٹ کر اس کے قریب چلی آئی۔ "مجھے درمکنون کہتے ہیں۔ میں بابا صاحب کے اسکول میں جاب کرتی ہوں۔"
"ارے......آپ سردار آغا جان کی بات کر رہی ہیں؟" لڑکی کے چہرے پر جوش کے آثار نظر آئے تھے۔

"ہاں۔" اس نے مختصراً کہا۔
"آغا جان......میرے بابا کے دوست ہیں۔" وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"میرا نام عیشہ ہے اور یہیں وادی کے دوسری طرف ہمارا خوب صورت سا وائٹ ہاؤس ہے۔ آپ کسی دن ہمارے گھر آئیے گا، میں آپ کا انتظار کروں گی۔ آپ کو میری فیملی سے مل کر خوشی ہوگی۔ اور یہ بتائیے، عبدل بھائی کہاں ہوتے ہیں آج کل؟" عیشہ بہت باتونی لڑکی تھی۔ اس کا لب و لہجہ بہت شائستہ تھا۔
"عبدل......؟" درمکنون نے حیرت سے زیرِ لب کہا۔
"ہاں، عبدالباری بھائی ان دنوں کالج سے غیر حاضر تھے نا۔" عیشہ نے وضاحت کی تو اس نے سمجھتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔
"شاید کوئی پرسنل مصروفیت ہوگی۔" درمکنون نے شانے اچکائے اور ایسے ہی بات بڑھانے کی غرض سے بولی۔
"تم پڑھتی ہو؟"
"ہاں جی۔ میں انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کر رہی ہوں۔" اس نے فخریہ بتایا تھا اور قدرے تجسس سے بولی۔
"آپ کہاں سے آئی ہیں؟"
"لاہور سے۔" اس نے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔
"ارے، لاہور سے یہاں جاب کرنے؟ حیرت ہے۔" عیشہ کی حیرانی بجا تھی۔
وہ چند لمحے سوچتی رہی اور پھر آہستگی سے بولی۔
"صرف جاب نہیں، ایک مضبوط سائبان کا بھی مسئلہ تھا۔ میں بابا صاحب کے پاس بہت خوش اور مطمئن ہوں۔"
"ایک بات کہوں؟" عیشہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا تھا۔
"ہاں، کیوں نہیں؟"
"آغا جان آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ میرا آپ سے [illegible] تعارف تھا۔" عیشہ کے انکشاف پر وہ چونک اٹھی۔
"کیا جانتی ہو میرے بارے میں؟"
"[illegible]، بس اتنا کہ آغا جان آپ کی ذہانت، نرم دلی سے متاثر ہیں۔" وہ

بالوں کو جھٹکتے ہوئے مسکرا کر بولی تھی جبکہ درمکنون ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ اس کا دھیان کہیں اور تھا۔

''ابھی آپ میری ''بات'' پر غور کریں اور مجھے اجازت دیں۔ پھر ملیں گے۔'' وہ بہت پُرجوش انداز میں اس کا ہاتھ دبا کر بل کھاتی سڑک سے اُترنے لگی تھی۔

❁

''امی! آپ نے یہ لڑکی منتخب کی ہے رمیز کے لئے؟'' زرین نے حقارت سے زروہ کی تصویر کو ٹیبل پر پٹخ کر کہا تھا۔

''کیا برائی ہے اس میں؟'' شگفتہ نے تنک کر پوچھا۔

''شکل سے ہی مسکینیت ٹپک رہی ہے۔'' وہ زہرخند ہوئی۔ ''سارے شہر کی لڑکیاں کیا مرگئی ہیں؟ اپنے خاندان میں کوئی نہیں ملی آپ کو؟......کیا سب کی بکنگ ہو چکی ہے؟'' زرین مسلسل تلملا رہی تھی۔

''تمہاری زبان کے آگے تو خندق ہے۔'' شگفتہ نے بےزاری سے کہا۔

''میں پوچھ رہی ہوں، کہاں سے یہ ''عجوبہ'' دریافت کیا ہے؟'' زرین نے بل کر کہا اور مزید بولی۔ ''میرے خوبرو، لائق فائق بھائی کے لئے یہی رہ گئی تھی؟ شکل پھٹکار برس رہی ہے۔''

''بک بک مت کرو۔ اتنی خوب صورت اور حساس سی لڑکی ہے۔ سب کا احساس کرنے والی۔ مجھے تو پہلی نظر میں ہی پسند آگئی تھی۔ ماں کی طبیعت بھی بہت بھلی ہے'' وہ کٹی ہوئی سبزیوں کے علیحدہ علیحدہ دو پیکٹ بناتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''آپ رمیز سے تو پوچھ لیتیں، خود ہی رشتہ بھی طے کر دیا ہے۔'' زرین کا پارہ لمحہ لمحہ اوپر کی طرف چڑھ رہا تھا۔

''رمیز سے پوچھ کر ہی بات پکی کی ہے۔'' انہوں نے بےزاری سے کہا۔

''مجھے کچھ بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ یہی عزت رہ گئی ہے میری۔'' اصل تلملا لبوں پر شکوہ بن کر ظاہر ہو چکی تھی۔

''تم نے کیا کرنا تھا وہاں جا کر؟ صرف دل دکھانے والی باتیں۔'' وہ منہ ہی میں بدبدائی تھیں۔

''گھر بار کیسا ہے؟ باپ کیا کرتا ہے لڑکی کا؟ کتنے بہن بھائی ہیں؟'' دھیرے دھیرے وہ مطلب کی بات تک پہنچ چکی تھی۔

''عزت دار، سادہ سے لوگ ہیں۔ بچی کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ چار بہنیں اور ایک بھائی ہے۔'' انہوں نے مختصر بتا کر جان چھڑائی تھی۔ مگر زرین کی شاید تشفی نہیں ہو سکی تھی۔

''لڑکی کا بھائی کیا کرتا ہے؟''

''بیمار ہے۔'' انہوں نے بات سمیٹنا چاہی۔

''کون سی بیماری ہے؟'' زرین نے دہل کر کہا۔ ''کہیں ہیپاٹائٹس یا ایڈز وغیرہ تو نہیں؟''

''لاحول ولا قوۃ۔'' شگفتہ کو بیٹی کی ذہنیت پر حد درجہ افسوس ہوا۔ ''یونیورسٹی میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ بےچارہ بچہ تو بےگناہ اندھی گولیوں کی زد میں آگیا تھا۔ اب تو خیر سے بہتر ہے۔''

''آج کل کے لڑکوں کو ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کی عادت ہے۔ شکر ہے، ہمارا رمیز ایسا نہیں ہے۔'' زرین نے دلار سے اپنے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بھائی کا ذکر کیا تھا۔

''ویسے امی! ایک لحاظ سے آپ نے زروہ کے ساتھ رمیز کا رشتہ طے کر کے اچھا ہی کیا ہے۔ نچلے طبقے سے ہے، خوب دبا کر رکھوں گی۔ کسی بڑے گھر کی ہوتی تو بڑی بہنوں کی طرح دو دن میں ہی الگ ہو جاتی۔'' زرین کی موٹی عقل میں کام کی بات سما ہی چکی تھی۔ اب وہ بڑی خوشی خوشی سے پلاننگ کرنے لگ گئی تھی۔

''آپ بھی آتے ہی اسے سر پر مت چڑھا لیجئے گا۔ اوقات میں رہے تو اچھا ہے۔ شادی کے بعد پہلی فرصت میں تمام نوکروں کی چھٹی کرواؤں گی میں۔ یہ غریب گھرانے کی لڑکیاں زیادہ رزق دیکھ کر پھٹنے لگتی ہیں۔''

''باقی کے منصوبے پھر بنا لینا، ابھی بچوں کے لئے تازہ روٹی پکا لو۔ بھوک بھوک چلاتے آجائیں گے کالج سے۔'' شگفتہ نے کلاک کی طرف دیکھ کر اسے وقت گزرنے کا احساس دلانا چاہا تھا۔

''نواب زادی خود آ کر پکا لے گی۔ مجھ سے نہیں اس گرمی میں چولہے کے قریب کھڑا ہوا جاتا۔ ویسے بھی آج میرا بی پی بہت ہائی ہے۔'' وہ آرام سے تخت پر لیٹ کر جعلی نقاہت سے کہہ رہی تھی۔

''کام چور، ہڈحرام۔'' شگفتہ تلملا کر کھڑی ہو گئیں۔

''امی! ابھی رجو آ جائے گی تو اس سے روٹی پکوا لیجئے گا۔'' اس نے لگے ہاتھوں مشورہ بھی دینا چاہا تھا۔

''اس بدبو کی پوٹ سے میں تو کبھی بھی روٹی نہ پکواؤں گی۔ گندی ہر وقت تو کھجاتی رہتی ہے۔'' انہوں نے خفگی سے کہا۔

''امی! کباب بھی فرائی کر لیجئے گا، وصی کو بہت پسند ہیں۔''

''تف ہے تم پر زرین! بڈھی ماں سے فرمائش کی جا رہی ہے۔ ایسی ہڈ حرامی نہ دیکھی نہ سنی۔'' خالہ قمری کی انٹری ایسے موقعوں پر ہی ہوتی تھی اور وہ تو ویسے بھی زرین کی بے عزتی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔

''خالہ! مجھے تو رات سے سخت بخار ہے۔ پیٹ میں بھی بہت درد تھا۔''

''لو، مجھے بلوا لیا ہوتا۔ ایسا اصلی دیسی جڑی بوٹیوں کا قہوہ بنا کر دیتی کہ منٹوں ہی درد نے بھاگ جانا تھا۔'' خالہ اس کی بیماری کا سن کر فوراً بولی تھیں۔ ان کا دل اس تکلیف کا سن کر پسیج گیا تھا۔

''خالہ! چائے لاؤں آپ کے لئے؟'' زرین مزید علاج اور اس کے حل کے متعلق تقریر سننے سے پہلے بول اٹھی۔

''نہ یہ کون سا وقت ہے، چائے پی کر کلیجہ ساڑنے کا؟ میرے لئے تو ٹھنڈا فالسہ شربت بنا کر لاؤ۔'' انہوں نے ناراضی سے کہا تو زرین کو اٹھتے ہی بنی۔

''بڑی سست طبیعت کی ہے یہ زرین بھی۔ نہ بچوں کی فکر نہ اپنی پروا۔ خیر، بے چارہ اپنی پروا کرے بھی کیوں اور کس کے لئے؟ چاہنے والا، سراہنے والا تو منوں مٹی تلے سویا۔ بھلا وہ کوئی وخت (وقت) تھا، بھری جوانی میں جانے کا۔'' خالہ نے سنجیدگی سوچا اور پھر شگفتہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''دشمن (نواسی) کی بھی کہیں بات چلائی تھی۔ خیر سے بارہویں کا امتحان د ہے۔ یہی تو عمر ہوتی ہے گھر بسانے کی۔'' ان کی سرگوشی اندر آتے وصی نے سن اسی لئے تلملا کر بولا۔

''دشمن نے بارہویں کا امتحان دیا ہے اور میں بے چارا دو سالوں سے چودہ کئے سہرے کے پھول کھلنے کے انتظار میں سوکھ کر کانٹا ہوا جا رہا ہوں۔ مگر میری پروا ہو گی؟ ایک آپ کو اپنا ہمدرد سمجھ رکھا تھا، مگر آپ نے بھی حد ہی کر دی ہے۔ رمز بعد دشمن کے بارے میں سوچا جا رہا ہے اور مجھے درمیان میں سے اچک کر پھینک

بلکہ مکھن سے بال کی طرح نکال دیا ہے۔ میرا اتنا لمبا تڑنگا وجود آپ کو نظر نہیں آیا اور وہ بونی سی دشمن آنکھوں میں پوری فٹ ہو گئی ہے۔ میں اس ناانصافی پر احتجاج کروں گا۔ آج سے میری بھوک ہڑتال۔'' اس کی دہائیاں زور و شور سے جاری تھیں۔ خالہ منہ پر کپڑا رکھ کر ہنسے جا رہی تھیں۔

وصی ان کے قریب گھٹنے پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''چل ہٹ مسخرے! ہر وقت ہری ہری سوجھتی ہے۔ وخت آ لینے دو، تمہارا بھی کچھ سوچوں گی۔''

''نہ جانے کب وہ عظیم دن اور سہانا وخت (وقت) آئے گا۔ خالہ! یہ نہ ہو کہ میں اس وخت کے آنے تک ''بابا'' بن جاؤں۔ مجھے بالوں میں خضاب لگانا پڑے گا، نقلی دانتوں کی بتیسی پر الگ خرچہ ہوگا۔ سات آٹھ سو کی سستی سی، موٹے عدسوں والی عینک کا ہونا بھی ضروری ہے۔ آخر دلہن کو بھی تو دیکھنا ہے۔'' وہ بڑی لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

کچن سے زریں بھناتے ہوئے باہر نکلی۔

''بک بک کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا لو۔''

''امی حضور! شیروں کے منہ دھلے ہوتے ہیں، انہیں دھونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ مسکراتا ہوا خالہ سے ''ابھی آتا ہوں'' کہہ کر کچن کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جبکہ خالہ ایک مرتبہ پھر شگفتہ بیگم کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

❀

''ویسے تم نے کبھی سوچا نہیں ہوگا کہ یوں میرے ساتھ ایک دن ''ڈیٹ'' پر جاؤ گی۔'' زیان نے ایک زچ کر دینے والی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر آنکھ دبائی تھی۔

''استغفر اللہ۔'' عنوہ کانوں تک سرخ ہو گئی۔

''ذرا الفاظ میں درستگی کر لیں۔ میں آپ کے ساتھ ''ڈیٹ'' پر نہیں، ''ڈنر'' کرنے جا رہی ہوں۔'' عنوہ نے چبا چبا کر کہا تھا۔ زیان نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

''بات تو ایک ہی ہے۔ دونوں صورتوں میں رومانس ہی بگھارا جاتا ہے۔''

''اپنے اپنے مینٹل لیول کے مطابق ہر کوئی سوچتا ہے۔'' اس نے چبھتے لہجے میں کہہ کر ونڈو سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

''اور آپ کا ''لیول'' کیا ہے؟'' زیان نے احتیاط سے ٹرن لیا۔

''کم از کم آپ سے میچ نہیں کرتا۔'' اس نے بھی دل جلانے والے انداز میں کہا تھا۔

"اور اسے برابر کرنے کے لئے کیا کرنا ہوگا......؟" بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا گیا تھا۔

"آپ کو کیا ضرورت ہے اپنی "سطح" سے نیچے آنے کی۔" اس کا انداز ہنوز وہی تھا، جلا کٹا سا۔

"مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا ہے۔" زیان نے لب بھینچ کر مسکراہٹ دبائی۔ عنوہ تلملا کر پہلو بدلنے لگی تھی۔ کچھ نہ سوجھا تو اسی روٹھے انداز میں بولی۔

"میں نے کچھ اسینشلو خریدنا ہیں۔"

"پہلے بتانا تھا نا۔ اب تو ہم مارکیٹس اور شاپنگ مال کافی پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ چلو کوئی بات نہیں، ابھی واپس ٹرن لے لیتے ہیں۔ آخر کو پہلی مرتبہ آپ نے فرمائش کی ہے۔ پورا کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔ حالانکہ مجھے خواتین کے ہمراہ شاپنگ کرنا سخت آکورڈ لگتا ہے۔" اس نے احتیاط سے گاڑی کو دوسرے روڈ پر ڈال دیا تھا۔

پندرہ منٹ بعد اس نے اپنی سپر لگژری سوک کو ایک بہت بڑے شاپنگ مال کے پارکنگ ایریا میں بہت مشکل سے پارک کیا تھا۔

"اترو بھی۔" اس نے عنوہ کو مخاطب کیا جو ہینڈ بیگ میں سے نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

"یہیں تو رکھی تھی۔" عنوہ نے جھنجلا کر کہا اور ایک ایک چیز نکال کر دیکھنا شروع کر دی۔ "پتہ نہیں کہاں رکھ دی ہے۔" اب وہ ایک مرتبہ پھر پرس کو کھنگالنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ اُلٹا کر کے جھاڑ کر بھی دیکھ لیا۔

"بھئی کیا مسئلہ ہے؟" زیان نے جھلا کر کہا۔ "خوامخواہ ٹائم ضائع کر رہی ہو۔ نکلو بھی باہر۔"

"ایکچوئلی لسٹ تو میں شاید گھر بھول آئی ہوں۔" اس نے سر پر ہاتھ مار کر اپنے بھلکڑ پن کو کوسا۔

"لسٹ کی کیا ضرورت ہے؟ ایسے ہی خرید لو، جو کچھ خریدنا چاہ رہی ہو۔ کیا وہ بھی بھول چکی ہو؟" زیان نے طنزیہ کہا۔

"نہیں، وہ تو یاد ہے مگر......" عنوہ ایک دم جھجک کر خاموش ہو گئی تھی۔

"کم آن عنوہ!" وہ گاڑی کا ڈور کھولتے ہوئے بولا مگر عنوہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"چکنے گھڑے نکل آؤ باہر کہ اٹھا کر لے جاؤں؟" وہ بھنا کر پلٹا تھا۔ عنوہ انگلیاں

چٹخاتی منمنائی۔

"رہنے دیں۔ میں خرید لوں گی۔ بلکہ آپ کو لسٹ دوں گی، آپ لے آیئے گا۔ اصل میں پہلے بھی ممی ہی ایسی "چیزیں" خریدتی تھیں۔ میں نے کبھی اس قسم کی شاپنگ نہیں کی۔ مجھے تو بہت عجیب فیل ہوتا ہے۔ بھلا میں کیسے خریدوں گی؟"

وہ بہت آہستہ آواز میں جھجکتے ہوئے کہہ رہی تھی اور زیان ایک دم چونک گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے تمام اُلجھن رفع ہو گئی تھی۔ اب بے یقینی اور صرف حیرت کا عکس جھلک رہا تھا۔

رات کے ابتدائی پہر، کھلے ستاروں سے سجے چمکتے دمکتے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر محض ایک منٹ اور پینتالیس سیکنڈ کے اندر لمحے کے ہزارویں حصے میں زیان عبیث کو اپنی خوش قسمتی، بلند بختی کا ایسا ادراک ہوا تھا کہ دل گویا خوشی، مسرت اور شادمانی کے احساس سے جھوم جھوم اُٹھا۔ اتنے سالوں بعد پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ وہ ایک سنگلاخ زمین پر کھڑا ہے اور اس کے اردگرد بہت مضبوط فولادی قلعہ ہے، جسے زیان عبیث نے "فتح" کیا ہے۔ اس راجدھانی پر صرف زیان عبیث کا قبضہ تھا۔

عنوہ کے دل کی سپاٹ، سلیٹ کی مانند زمین پر وہ اپنی محبت کی جو فصل بوئے گا، وہی زیان عبیث کی پوری زندگی کا حاصل تھا۔ اس کا اصل سرمایہ، اس کی ذاتی جاگیر، عنوہ کا خالص، سچا، کھرا نایاب دل۔ یہ درِ ناسفتہ خدا نے اسے عطا کیا تھا۔ وہ ایک ایسا "دیا" تھی، ایک ایسا روشن منور چراغ تھی، جس نے زیان عبیث کے ظاہر باطن ہر طرف اجالا کر دیا تھا۔ دل کے طاقچے پر کئی ننھے منے دیے ٹمٹمانے لگے تھے۔ وہ خوشی و انبساط کے عالم میں جنونی انداز میں پلٹا اور قدرے گم سم اور پشیمان سی عنوہ کو جھنجوڑ ڈالا۔

"کیا چیز ہو تم عنوہ! اتنا خالص پن کہاں سے لیا ہے تم نے؟ میں قسمت کا دھنی ہوں، مگر آج تو مجھے سچ مچ اپنے "خوش بخت" ہونے کا یقین آ گیا ہے۔ تم بے پانی کا بادل ہو، جس نے سنہری دھوپ میں مجھ پر سایہ کر دیا ہے۔ تم میری روح کی آسودگی، اطمینان اور سکون ہو۔ یار! آج دل خوش کر دیا ہے۔ ایسی معصومیت اور بے خبری پر قربان ہو جاؤں۔ جی چاہ رہا ہے کہ سچ مچ اپنی ڈیئر ساس کو ایسا اسپیشل "پیس" پیدا کرنے پر کوئی تحفہ، سوغات یا نذرانہ پیش کروں۔" وہ خوشی سے لبریز بھرپور انداز میں چمکاتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ وہ بہت زیرک نگاہ رکھتا تھا۔ اس کے دوست اسے "دراک" یعنی بہت ہی ذہین، ہوشیار اور بات کی تہہ تک جانے والا

سمجھتے تھے۔ وہ عنوہ کی جھجک اور بات کے مفہوم تک پہنچ گیا تھا۔ اب وہ بہت محبت پاش نظروں سے عنوہ کی طرف دیکھ رہا تھا، جو بے حد گھبرا، بوکھلا کر انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے کی ساری تابندگی، درخشندگی، چمک اور روشنی اسی سادگی میں تھی، جس نے زیان کو اپنا اسیر کر رکھا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ کی نیت بدل گئی ہے۔ ڈنر کروانے کا ارادہ نہیں لگتا۔'' عنوہ جزبزسی ہوکر بولی تھی۔ زیان نے گہری خوشگوار سانس کھینچ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''نیت میں تو واقعی فتور آ چکا ہے، مگر ڈنر کروانا بھی لازمی ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا تھا اور پھر مزید اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ فائیو اسٹار کے وسیع ہال میں وہ مطلوبہ ٹیبل کی طرف بڑھ گئے تھے۔

زیان نے اپنی فیورٹ ڈشز کا آرڈر دے کر مینو کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''اس ہوٹل کے تھرڈ فلور پر میوزک کنسرٹ ہو رہا ہے۔ اگر تم شوق رکھتی ہو تو ایمرجنسی ٹکٹ خرید لیتے ہیں۔''

''اونہہ....... مجھے نہیں اچھل کود کرتے لوگ پسند۔'' اس نے ناگواری سے کہا تھا۔

''سنگرز میں کون فیورٹ ہے؟'' زیان نے پوچھا۔

''کوئی بھی نہیں۔'' عنوہ نے بے نیازی سے کہا۔

''کون سی صدی سے تعلق ہے تمہارا؟'' وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ آنکھوں میں بھرپور شرارت کی چمک تھی۔

اسی پل دو لڑکیوں اور لڑکوں کا گروپ ان کے قریب سے ہوا کے جھونکے کی طرح گزرا تھا۔ ایسے ہی غیر ارادی، بالکل سرسری سی اُڑتی پڑتی نگاہ اُٹھی تھی اور پھر ایک چہرے پر ٹھٹک کر ٹھہر سی گئی۔ عنوہ نے بھی زیان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔ وہ انٹرنس کے گلاس ڈور کو دھکیل کر باہر نکل رہے تھے۔ عنوہ نے زیان کو اپنی جگہ سے اُٹھتے دیکھا، اس کے چہرے پر بے حد سرخی اور آنکھوں میں شعلوں کی سی لپک تھی۔ اس کے لبوں سے مغلظات کا ایک طوفان اُٹھنے لگا تھا۔

''دفع ہو گئے ہیں بے غیرت۔ نہ جانے کس کے ساتھ گھوم رہی ہے۔'' واپس آ کر اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔ عنوہ نے بے حد حیرانی سے اس کے غضب ناک تاثرات والے چہرے کی طرف دیکھا۔

''کون تھی وہ لڑکی جسے دیکھ کر آپ آگ بگولا ہو گئے ہیں؟'' اس نے برفیلے لہجے

میں پوچھا تھا۔

زیان اپنے حواس میں نہیں لگ رہا تھا۔ ایک اجنبی لڑکی کو سرسری سا دیکھنے کے بعد یوں آپے سے باہر ہونا کم از کم عنوہ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ دوسری مرتبہ زیان کو اس قدر اشتعال کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے گویا لہو ٹپک رہا تھا۔

''زیان! آپ ٹھیک ہیں؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہوں....... اوں....... مجھے کیا ہوا ہے؟'' وہ ایک دم چونکا، ٹھٹکا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو۔ کچھ دیر پہلے وہ اس کے وجود کو یکسر فراموش کر چکا تھا اور اب یوں حیرانی سے عنوہ کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کی موجودگی کی اسے توقع نہیں تھی۔

''آؤ، گھر چلتے ہیں۔'' وہ پینٹ کی جیب سے والٹ نکال کر ویٹر کو فارغ کرتے ہوئے بولا تھا۔ اس کا موڈ یکسر بدل چکا تھا۔

''مگر.......'' عنوہ کچھ کہتے کہتے یک دم رک گئی تھی۔ زیان تیزی سے انٹرنس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی سر جھکائے سوچوں میں اُلجھی اس کے پیچھے چلی آئی۔ ڈرائیونگ کے دوران بھی وہ لب بھینچے بہت خاموش اور سنجیدہ تھا۔

گھر کے گیٹ کے سامنے اسے اتار کر وہ زن سے گاڑی لے اُڑا تھا۔ عنوہ حق دق سی دیکھتی رہ گئی اور پھر تھکے تھکے قدم اٹھاتی اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

''میم! دودھ لیں گی یا چائے؟''

بیڈ روم کی طرف اس کے اُٹھتے قدم لحظہ بھر کو رکے تھے۔ مس نمی کچن کے دروازے میں کھڑی پوچھ رہی تھیں۔ عنوہ بغیر جواب دیئے دروازہ دھاڑ سے بند کئے اندر چلی گئی تھی۔

''انہیں کیا ہوا ہے؟'' مس نمی نے حیرت سے سوچا اور پھر شانے اچکائے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

"کون تھی وہ لڑکی؟" اگلے دن شام کو وہ کسی انگلش میوزک کی ٹون گنگناتا، مسکراتا بیڈ روم میں داخل ہوا تھا۔ آتے ہی اس کے تھانیدارانہ انداز پر قدرے چڑ گیا۔

"آتے ساتھ ہی تفتیش...... نہ چائے نہ پانی۔" اس نے آنکھ دبائی اور دھپ سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں کیا پوچھ رہی ہوں؟" اپنا سوال نظر انداز کئے جانے پر اسے غصہ آ گیا۔

"میرے اور اپنے متعلق بات کیا کرو، اس کا جواب دوں گا تفصیلاً۔"

"مجھے ٹالنے کی کوشش مت کریں۔" اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو وہ بھرپور انداز میں مسکرایا اور بولا۔

"تم ٹلنے والی ہو بھی نہیں۔ میرا بلیک ڈنر سوٹ نکالو، شرٹ کو خوب اچھی طرح جما کر پریس کرو۔ مناکو سے پہلی مرتبہ پاکستان میں وفد آئے ہیں۔ تمام سرمایہ دار حضرات انہیں "کیچ" کرنے کے چکروں میں ہیں۔ دیکھو قرعہ فال کس کے نام نکلتا ہے۔ سب سے زیادہ امریکی ڈالروں میں فی کس آمدنی کے حساب سے ان ممالک کا نام بھی سرفہرست آتا ہے۔ اس ہنگامی میٹنگ میں ملک بھر کے تمام بڑے بزنس مین شمولیت کر رہے ہیں۔ تم دعا کرنا، اس ایگری منٹ فائل پر پہلے سگنیچر میرے ہوں۔" وہ کھینچ کھانچ کر شرٹ اتارتے ہوئے بڑے مصروف انداز میں تیز تیز بول رہا تھا۔ عنوہ نے جلتے بھنتے حکم کی تعمیل کی اور جواب دینا بھی ضروری سمجھا۔

"اتنی دولت اکٹھی کر کے کیا کریں گے؟" اس نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

"یہ سوال قابلِ غور ہے۔ میں بھی "غور" کرتا ہوں، تم بھی سوچ بچار کرنا۔" وہ اس کے ہاتھ سے چھیننے کے سے انداز میں شرٹ لے کر واش روم میں گھس گیا تھا۔

دتاب کھاتے ہوئے پھیلاوا سمیٹنے لگی۔

"بلیک شوز بھی نکالو۔" وہ دس منٹ میں شاور لے کر باہر آ چکا تھا۔ تولیے سے بال خشک کرتے جوں ہی اس کی نگاہ ٹائی پر پڑی، وہ ایک دم چیخ اٹھا تھا۔

"یہ کون سی ٹائی نکالی ہے؟ تم کیا کلر بلائنڈ ہو؟"

"اوہ، سوری۔" عنوہ شرمندہ سی ہو کر مطلوبہ ٹائی نکال کر لے آئی تھی۔ زیان مسکرا رہا تھا۔ شاید طنزیہ اسے بھی غصہ آ گیا۔

"اپنے کام رانیہ سے کروایا کریں۔ میں کوئی فالتو نہیں ہوں۔"

"میں تو تم ہی سے سارے کام کروایا کروں گا۔ آخر کو اتنا خرچہ کر کے لایا ہوں تمہیں۔" زیان نے بھرپور شرارت سے کہتے ہوئے اس کی ناک دبائی اور مزے سے بولا۔ "رانیہ تو فری میں ملی ہے، جبکہ تمہیں حاصل کرنے کے لئے وقت اور روپیہ دونوں ہاتھوں سے لٹایا ہے۔ ایک شاندار ہوٹل اور فل اسٹیبلش فیکٹری تم پر وار دی ہے جان! اب اتنا "حق" تو ہمارا بنتا ہے کہ تمہارے پیارے پیارے ہاتھوں سے دو چار ذاتی کام کروا لیں۔" زیان اسے کچھ "جتا" نہیں رہا تھا، محض چھیڑنے اور ستانے کی غرض سے بولا تھا۔ تاہم عنوہ کو یوں لگا تھا، اس کا دل کسی نے جلتی بھٹی میں لا پھینکا ہے۔ وہ بالکل گم سم اور ساکت سی کھڑی رہ گئی تھی۔ جبکہ زیان تو جا چکا تھا۔ اسے اپنی جارحانہ قربت اور لمس کا احساس دے کر۔

عنوہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا اس کے گرم لمس سے پورا وجود سلگنے لگا ہے۔ وہ بے جان سی بیڈ پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ اس کی ماں نے اسے تاحیات زیرِ بار کر دیا تھا۔ وہ کبھی بھی اعتماد کے ساتھ زیان عبیث کے سامنے سر اٹھا کر بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا تمام فخر اور غرور خاک میں مل چکا تھا۔ اس کی انا اور خودداری کی دھجیاں بکھر چکی تھیں۔ عزتِ نفس کا بت پاش پاش ہو چکا تھا۔

"ممی! آپ نے میرا، اپنی بیٹی کا "سودا" کر دیا ہے۔ چند مادی آسائشات کی خاطر آپ نے مجھے بیچ ڈالا۔ آپ نے عنوہ کی بولی لگا دی۔ اتنی کم قیمت تھی میری کہ چند ٹکوں کے عوض آپ نے مجھے تمام عمر کے لئے میری ہی نظروں سے گرا دیا ہے۔ میری ذات کا افتخار خاک میں مل گیا ہے۔ مجھ سے بہتر تو رانیہ ہے، مجھ سے بھلی تو سوما، ماہم اور ماریہ ہیں۔ میں کیا ہوں، میری پہچان کیا ہے؟ میری حقیقت کیا ہے؟ میں تو بالکل قلاش ہوں نہ ماں کی محبت، نہ رشتوں کا مان اور تحفظ۔ جو اپنی ذات پر تھوڑا سا گھمنڈ تھا، وہ بھی تہہ خاک ہوا۔ آپ نے مجھے ریزہ ریزہ کر دیا ہے ممی!...... میں آپ کو کبھی

معاف نہیں کروں گی۔'' وہ تکیے پر سر پٹختے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

❀

''کس قدر خوب صورت لہنگا ہے، نانو! کتنے تھاؤزنڈ کا ہوگا؟''

ثمن نے فیروزی اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے لہنگے کے بھاری کام سے بوجھل دوپٹے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پُرجوش انداز میں پوچھا۔

''قیمت نہیں دیکھتے، چیز کی خوب صورتی دیکھتے ہیں۔ میری آنکھوں کو بھی بھلا تھا، سو لے آئی۔ بیالیس ہزار کا ہے۔'' شگفتہ بیگم نے نواسی کو محبت سے ساتھ ہوئے بتایا اور بولیں۔

''تیرے لئے اس سے بھی اچھا خریدوں گی۔''

''ارے نانو! میرا یہ کہنے کا مطلب نہیں تھا۔'' وہ بری طرح شرما گئی۔

''اور میری دلہن کے لئے کیسا لہنگا خریدیں گی؟'' وصی کے بھی فوراً کان کھڑے گئے تھے۔

''تم اتنے اتاؤلے مت ہو، شادی کے لئے۔ اتنی جلدی ہرگز تمہاری باری والی نہیں۔'' شگفتہ بیگم نے نواسے کو لاڈ سے جتایا تو اس نے روتی سی شکل بنالی۔ ہنس ہنس کر دہری ہو رہی تھی۔

''نہ جانے تمہاری ماں کدھر ہے۔ ذرا اسے بھی بلا کر لاؤ۔ ایک دفعہ دیکھ لیتی تو انہیں پیک کر کے سوٹ کیس میں رکھ دیتیں۔'' شگفتہ بیگم، زیورات کے ڈبے کھولتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''میں امی کو لے کر آتا ہوں۔'' وصی نے ثمن کو اُٹھتے نہ دیکھ کر کہا اور باہر نکل گیا کچھ دیر بعد ماتھے پر بل ڈالے زرین بھی آ گئی۔

''مجھے دکھانے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ ایسے ہی پیک کر دیتیں۔'' اس نے ہی پتھر پھوڑے۔

''اتنا قیمتی لہنگا......؟'' زرین نے دیکھتے ساتھ ہی مالیت کا اندازہ لگا لیا تھا او زیورات دیکھ کر تو اس کی آنکھیں ہی پھٹ پڑیں۔

''امی! یہ وائٹ گولڈ کا لاکٹ کتنا پیارا ہے۔ اور یہ دیکھیں، لہنگے سے میچ کرتا کتنے سیٹ بنوائے ہیں، پہننے والی کی ''اوقات'' تو دیکھ لیتیں۔''

''فیروزے کا سیٹ۔'' ثمن نے ماں کے تیور دیکھے بغیر جوش اور خوشی کے عالم

ڈبے کھول کھول کر زرین کے سامنے کیے تھے۔ شگفتہ بیگم نے تحمل سے دو مخملی ڈبے زرین کی طرف بڑھائے۔

''یہ پرل کا بریسلٹ ثمن کا اور دو کنگن تمہارے لئے ہیں۔ خود پہننا چاہو تو شوق سے پہن لینا، ورنہ وصی کی دلہن کے لئے سنبھال لینا۔''

''یہ ''خیرات'' دینے کی کیا ضرورت تھی؟'' زرین کا ازلی احساسِ کمتری عود کر آیا تھا۔

اس وقت وہ اُجڈ، کم تعلیم یافتہ، حسد کی ماری عورت دکھائی دے رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر اپنے نقصان یاد آ رہے تھے۔ اپنے بہن بھائیوں میں وہ سب سے بڑی تھی۔ والد صاحب انکم ٹیکس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ان کی اچانک وفات کے بعد گھر کے حالات یکسر بدل گئے۔ وہ خود اٹھارہ سال کی تھی، نوید پندرہ اور نویز تیرہ سال کا تھا جبکہ رمیز صرف سات سال کا، جب کہ زرین کی شگفتہ بیگم نے شادی کر دی تھی۔ اچھا رشتہ کیا آیا، انہوں نے چھان پھٹک کے بغیر اسے بیاہ دیا۔ سسرال میں جا کر ٹوٹلی مختلف ماحول ملا تھا۔ جاتے ہی جہیز نہ لانے کا طعنہ ملا۔

''اتنے بڑے افسر کی بیٹی اور خالی ہاتھ آئی ہے۔'' ساس نندوں نے طعنے دے دے کر پورے دو سال اسے ہر طرح کی ذہنی اذیت دی تھی۔ ہر طرح سے اس پر زندگی کو تنگ کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ شوہر بھی ماں کی زبان بولنے والا کاٹھ کا اُلو تھا۔ نہ اپنی مرضی تھی اور نہ ہی کھلا ڈُلا ماحول تھا کہ چند سانسیں بیرونی فضا میں ادھار لی جا سکتیں۔ چار سال کی ان تھک مشقت کے بعد اولاد نہ ہونے کا طعنہ بھی ملنا شروع ہو گیا تھا۔ نندوں کے کوسنے، جٹھانیوں کا تحقیر بھرا انداز۔ وہ ذہنی توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکی تھی۔ خصوصاً جب سے اولاد نہ ہونے کے طعنے ملنا شروع ہوئے تھے، تب سے ہی اس کی جٹھانیوں نے اس کے پاس بیٹھنے سے بھی گریز کرنا شروع کر دیا تھا۔

پانچ سال بعد وصی کی آمد کی نوید ملی تھی، مگر اس کے بعد بھی حالات ویسے کے ویسے ہی تھے۔ ننانوے فیصد سسرالیوں کی طرح اس پر بھی ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ وصی کے بعد ثمن کی پیدائش پر اس کی ساس نے خود کو پیٹنا شروع کر دیا تھا۔

''ہائے ہائے، میرے بے چارے بچے پر بیٹی کا بوجھ آن پڑا ہے۔''

ابھی یہ واویلا جاری وساری تھا کہ ان کا بے چارا بیٹا خود ہی ہر طرح کے بوجھ سے آزاد ہو کر ٹریفک حادثے میں چل بسا۔ زرین کو منحوس کا خطاب دے کر دو بچوں سمیت گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ اس قدر تلخیوں، معاشی بدحالی اور بیوگی کے صدمے نے

زرین کے مزاج کو بھی بے حد روکھا اور تلخ کر دیا تھا۔ اس تلخی کا شکار پہلی دو بھابھیاں شادی کے فوراً بعد الگ ہو گئی تھیں۔ اکثر شگفتہ بیگم بھی بیٹی کی تلخ کلامی کی زد میں آ جاتی تھیں۔ مگر انہوں نے کبھی اسے ٹوکا نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ دکھوں کی ماری بیٹی کا دل نہ ٹوٹ جائے۔ اس اثناء میں دوسرے بے شک تکلیف میں رہیں۔ ان کا دل ٹوٹے یا صدمہ پہنچے، ان کی بلا سے۔

اس وقت بھی شگفتہ بیگم نے بیٹی کو سمجھانے کے بجائے اور اس سے منہ ماری کے خوف سے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ اگر انہوں نے زروہ کی فیملی کی حمایت میں کوئی بات کر دی تو پھر اگلے تین گھنٹے زرین کے لیکچر کی نذر ہو جاتے۔ سو خاموشی میں ہی عافیت تھی۔

”اتنا مت سر پر چڑھائیں۔ لے اُڑے گی رمیز کو۔“ زرین غصے سے بل کھا کر کہہ رہی تھی۔

”میرا انتخاب اتنا بھی برا نہیں۔“ انہوں نے زروہ کا معصوم سنجیدہ چہرہ تصور میں لا کر کہا۔

”رمیز کو رشتوں کی کمی تو نہیں تھی۔ ایک سے ایک اچھی لڑکی اپنے خاندان میں ہی موجود ہے۔ لاکھوں کا جہیز لاتی۔ گاڑی، کوئی پلاٹ وغیرہ۔ نویز اور نوید کی بیویاں کچھ لائی تھیں۔“

”گستاخی معاف امی! چار دن بھی انہوں نے ہمارے ساتھ رہنا گوارا نہیں کیا اپنی قیمتی گاڑیاں اور جہیز سمیت کر دوسرے ہی دن الگ ہو گئی تھیں۔“ وصی نے چبا چبا کر کہا تھا۔ زرین چپ سی رہ گئی۔ بات تو وصی نے ٹھیک کی تھی، مگر زرین اپنے مزاج کے تابع رہی تھی۔ زبان پر تلخی اور آنکھوں سے شعلے ہی لپکتے رہتے تھے۔ اس وقت جب وصی نے لاجواب کر دیا تو وہ اس بے چارے پر چڑھ دوڑی۔

”عورتوں کی باتوں میں دلچسپی لینا۔ کوئی کام دھام مت کرنا۔ بی کام کر کے جان پر احسان کر دیا ہے۔ نواب زادے! رمیز سے کہہ کر فارم منگواؤ اور یونیورسٹی داخلہ لو۔“

”امی! میں نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے ایک پرائیو بینک میں اچھی جاب مل گئی ہے۔ سیکنڈ ٹائم میں ایم کام کروں گا۔ مجھے رمیز ماما بر نہیں بننا۔“ اس نے بڑے سنجیدہ انداز میں ماں کو بتایا تھا۔ زرین بیٹے کی بات کا

سمجھے بغیر چلائی۔

”اب میں اور میرے بچے بوجھ ہو گئے ہیں۔ یقیناً امی! آپ نے ہی کہا ہو گا۔ ابھی تو وہ فتنی اس گھر میں آئی بھی نہیں اور ہمیں بوجھ سمجھا جانے لگا ہے۔“ وہ غصے سے پھنکار رہی تھی، جبکہ وصی مدد طلب نگاہوں سے نانو کو دیکھ کر اس وقت کو کوس رہا تھا، جب اس نے ماں سے اپنے نیک خیال کا اظہار کیا تھا۔

❁

”آج پھر تم دیر سے آئی ہو؟“ زروہ نے کڑی نظروں سے سارہ کو گھور کر کہا۔

”وہ آپی! میں نادیہ سے نوٹس لینے چلی گئی تھی۔“ سارہ نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

”جھوٹ مت بولو۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں آپی!“

’اس گھر میں کیا پھر سے ایک اور کہانی دہرائی جائے گی؟ ایک نئی داستان جس میں کردار بدل چکے ہوں گے۔ نئے کردار، نئے خواب، نئی کہانی۔‘ وہ دہل کر سوچ رہی تھی اور بڑی جانچتی نگاہ سے اس کے چہرے کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔

”روز روز مختلف اور گھسے پٹے بہانے بنا کر کس کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو۔ ہم میں اور دکھ، بدنامی کے بوجھ اٹھانے کی ہمت نہیں سارہ! بس اتنا سوچ لینا کہ ہماری ماں نے بہت غم برداشت کئے ہیں۔ مزید کوئی صدمہ سہنے کی ان میں طاقت نہیں ہے۔“ وہ بے حد رنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

”چار دن پہلے تم نے کرن سے نوٹس لینے تھے، ایک دن تم کالج سے بازار چلی گئی تھیں، نادیہ کے ساتھ۔ کل شام تم کرن کی سالگرہ کے بہانے رات نو بجے آئی ہو۔ مبین یہ پوچھ کر تھک گیا تھا۔ میں اسے تسلیاں دیتی رہی، یہ سب کیا ہے سارہ؟“ زروہ نے تھک کر پوچھا۔

”آپی! میں واقعی کرن کی سالگرہ میں نادیہ کے ہمراہ گئی تھی۔“ سارہ نے منمنا کر اپنی صفائی پیش کرنی چاہی تھی۔

”تمہیں پتہ ہے نا کہ تم کس کی بیٹی ہو، مولوی عبدالرحمٰن کی۔ اپنے امام مسجد، شریف اور عزت دار باپ کی لاج رکھنا۔ یہی سبق دے کر ہماری ماں نے ہمیں کالج اور یونیورسٹیوں میں بھیجا تھا، پڑھنے کی غرض سے، اعلیٰ تعلیم دلوانے کی غرض سے۔“ وہ سارہ کو بہت کچھ سمجھا رہی تھی۔ بہت سی باتیں بتا رہی تھی۔

''اس گھر کی دیواریں کمزور ہیں سارہ! اور ہمارے کردار کی عمارت بہت مضبوط ہے۔ اس فولادی عمارت کو ڈھینے نہ دینا کہ اس معاشی طور پر بدحال خاندان کے یہی قیمتی اور انمول اثاثے ہیں۔''

''جی آپی!'' اس نے سر جھکا کر تابعداری سے کہا، مگر دور کہیں چمکتی دمکتی، ننھی منی روشنیاں اسے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔

کرن کا کزن نبیل اسلام آباد سے مائیگریٹ ہو کر لاہور آیا تھا۔ خوش شکل، چلبلا سا، بے فکرا، کھلنڈرا سا نوجوان........ وہ مبین کا ہی ہم عمر ہو گا، مگر مبین سے یکسر مختلف ایڈونچرز کا شوقین، بے حد چنچل، جبکہ مبین حد درجہ سنجیدہ، غصیلا اور بے حد چڑچڑا سا سے بھی بے زار۔

کبھی کبھی وہ سوچتی تھی کہ مبین بھائی کی بھی بھلا کیا زندگی ہے۔ سارا دن چھت کڑیاں گنتے رہتے ہیں یا پھر چیختے چلاتے ہیں۔ پہلے تو وہ ایسے نہیں تھے۔ بہت شوخ ہنس مکھ اور زندگی سے بھرپور۔ مگر جب وہ چلی گئیں تو پھر........

''سارہ! آٹا گوندھ لو۔'' سعیہ نے اس کا شانہ ہلا کر کہا۔

''سعیہ! تم گوندھ لو آٹا۔ میرے ناخن ٹوٹ جائیں گے۔'' اس نے اپنے ہاتھ پھیلا بے چارگی سے کہا تھا۔

''اچھا، پھر برتن دھو لو۔''

''برتن........ بھئی میں نہیں دھو سکتی۔ میرے ہاتھ کالے ہو جاتے ہیں۔''

''کیا بات ہے آپ کے ہاتھوں کی، کیا نزاکت ہے ماشاء اللہ سے۔''

بولی۔

''آٹا گوندھ لو، مہارانی صاحبہ! آپی کپڑے سلائی کر رہی ہیں۔ آج میں پکائی ہے، لہٰذا دس منٹ میں فارغ ہونا چاہتی ہوں۔'' سعیہ برتن دھونے کے کھول چکی تھی۔ سارہ چارپائی پر بیٹھی ٹانگیں جھلاتی رہی۔

''آج تم سارا کام کر لو، کل میں تمہارے حصے کا کام کر لوں گی۔'' سارہ نے سستی سے انگڑائی لے کر کہا تھا۔

''سارہ! تم کچھ لاپروا نہیں ہوتی جا رہیں، بلکہ کام چور کہنا بہتر رہے گا برتنوں کو صاف کرتے ہوئے کہا اور مزید بولی۔

''آپی کے جانے کے بعد تمہاری ذمہ داری میں اضافہ ہو جائے گا۔ تم آپی

پر بیٹھنے کی تیاری کر لو ابھی سے ہی۔''

''کیا مطلب؟ آپی کہاں جا رہی ہیں؟'' سارہ نے حیرانی سے پوچھا تو سعیہ نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

''تم یہیں رہتی ہو یا خلا میں پرواز کر چکی ہو؟''

''اوہ........ مجھے خیال نہیں رہا۔ ویسے کیا ارادہ ہے شگفتہ آنٹی کا۔''

''ارادے تو نیک ہیں، بس امی فی الحال خاموش ہیں۔'' سعیہ کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے بولی تھی۔

''کیا مطلب؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم نہیں جانتی کیا؟ ایسی بھی بے خبری اچھی نہیں۔'' سعیہ کو غصہ آ گیا تھا۔

''بتاؤ بھی۔'' اس نے اصرار کیا تو وہ آہستگی سے بولی۔

''ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ مطلب روپوں کا مسئلہ ہے۔''

''اونہہ، بیٹے کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں۔''

''شاید اس دفعہ کمیٹی امی کو مل جائے تو پھر ڈیٹ فکس کریں گی امی۔'' سعیہ نے دھلے برتن خشک کرتے ہوئے کہا۔

''سعیہ! بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ پریشانیوں اور مسائل سے بوجھل۔'' وہ اُداسی سے کہہ رہی تھی۔

''دکھ اور سکھ زندگی کا حصہ ہیں۔''

''یہاں تو صرف دکھ ہی اردگرد بکھرے ہیں، سکھ کہیں نظر نہیں آتا۔'' سارہ کی آنکھوں میں حسرتیں کروٹ لے رہی تھیں۔ سعیہ کو بے حد حیرت ہوئی۔

''آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

''یار! خواب دیکھنے میں کیا حرج ہے؟'' اس نے یاسیت سے کہا۔

''خوابوں پر پابندی ہے نہ پہرہ، بس اتنا دھیان رکھنا چاہئے کہ خواب کس نوعیت کے دیکھنے ہیں۔'' سعیہ نے سنجیدگی سے کہا تو وہ مسکرانے لگی اور بولی۔

''خوابوں کی بھی نوعیت ہوتی ہے۔''

''ہاں۔'' سعیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ کیسے؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''کچھ خواب روشنی کی طرح ہوتے ہیں۔ گویا جگنو سے۔ راستوں اور گم شدہ

منزلوں کا پتہ دیتے ہیں، نشاندہی کرتے ہیں۔ کچھ خواب ولولہ انگیز ہوتے ہیں، بلندیوں
کی طرف لے جانے والے۔ کچھ خواب رہنما اور پیشوا ہوتے ہیں۔ کچھ خواب غافل اور
گم نام کر دیتے ہیں۔ کچھ خواب عروج کی طرف لے جاتے ہیں، کچھ پستیوں میں اتار
دیتے ہیں۔ یہ تو آدمی کی سرشت اور خصلت پر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کے نوخیز خواب
آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے۔'' وہ بڑے جذب کے عالم میں آنکھیں
موندے کہہ رہی تھی۔

''اے سدیہ! تم نے ایسی باتیں کہاں سے سیکھیں؟'' سارہ نے حیرانی سے آنکھیں
پھیلا کر اس کا کندھا ہلایا۔

''پیاری بہن! وقت سکھاتا ہے، حالات اور وقت سے بڑا کوئی استاد نہیں۔'' سدیہ
مسکرائی اور بولی۔ ''ہم نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی ہے، اس کے کچھ اصول ہیں۔
کچھ بہت پیاری روایتیں ہیں، جس کی پاسداری ہم پر فرض ہے۔ دیکھو سارہ! ہمیشہ
ایکسٹراویگنٹ (حد سے نکلنے والے) خسارے میں رہتے ہیں۔''

''سدیہ کیسی خطرناک باتیں کر رہی ہے، اس کا انداز طنزیہ نہیں سمجھانے والا ہے۔ کیا
مجھ میں بغاوت کی بُو سونگھ چکی ہے؟'' سارہ نے حیرت سے سوچا۔

''عورت کی سب سے قیمتی متاع اس کا کردار ہوتا ہے، عزت ہوتی ہے، عورت
اپنے اچھے مضبوط کردار کے حصار میں محفوظ ہوتی ہے۔ ایسے کردار کی عورتیں مردوں کو
اٹریکٹ کرتی ہیں اور وہ ایسی عورتوں کو منہدم کرنے، ڈھانے، گرانے اور مسمار کرنے
خواہش رکھتے ہیں۔ ایسے مردوں کو کہتے ہیں، بیمار ذہن کے سطحی سوچ رکھنے والے
سے مرد۔''

''تمہیں تو فلاسفر ہونا چاہئے۔'' سارہ نے ستائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھا

''یہ فلسفہ نہیں، آگہی ہے۔ میرے خیال میں ہر لڑکی شعور کی پہلی منزل طے کر
کے ساتھ بھرپور عورت بن جاتی ہے۔ اس کے پاس ایک ایسی راز اور بھید ظاہر کر
والی اور مقابل کے اندر تک اُتر جانے والی آنکھ کا ہونا ضروری ہے۔ دوربین جیسی تیز
جو باطن تک کو اجاگر کر دے۔'' اس نے گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھ کر آٹا گوندھنا شر
کر دیا تھا۔

''انسان کو پرکھنے کا کوئی آلہ ہوتا ہے؟'' سارہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''صاف شفاف بینائی ہو۔ مادی اشیاء اور چمک دمک آنکھوں کو اندھا کر

ہے۔ جب آپ ظاہر چھوڑ کر باطن کو دیکھیں گے تو بہت سے راز پردہ اسکرین پر اُبھر
آئیں گے۔ ایک ہوتی ہے قوتِ ممیزہ، یعنی انسان کی ایسی قوت جس سے وہ اچھے،
برے، نیک، بد، اچھائی، بھلائی اور برائی میں تمیز کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی حس ہے جو
عورت کو الرٹ کرنے کے لئے کافی ہے۔'' وہ آٹا گوندھ چکی تھی، اب ہاتھ دھو رہی تھی۔

''میں چھلکے اتار لیتی ہوں، تم اب آرام کر لو۔'' سارہ نے نرمی اور ہمدردی سے کہا
تھا۔ سدیہ نے تشکر بھری نگاہ سے اسے دیکھا اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

'زروہ آپی اور سدیہ دونوں میں ایک ہی روح حلول کر گئی ہے۔' وہ چولہا جلاتے
ہوئے سوچ رہی تھی۔

''رمیز! فارغ ہو تو آ جاؤں؟'' زرین نے کمرے میں جھانک کر پوچھا تھا۔ وہ جو
آفس کی کوئی فائل دیکھ رہا تھا، ایک دم چونک کر سیدھا ہو گیا۔

''آیئے آپا!'' اس نے احترام سے کہا۔

''دفتر کا کام گھر میں بھی اٹھا لاتے ہو۔ کیا ضرورت ہے اتنی دیر تک جاگنے کی۔
صحت خراب کر لو گے۔'' زرین نے فطری محبت سے مغلوب ہو کر کہا۔ چھوٹا ہونے کی
وجہ سے رمیز ان سب کا بہت لاڈلا تھا۔

''تمہیں پتہ ہے کہ امی کون سی کھچڑی پکا رہی ہیں آج کل؟'' کچھ دیر خاموش رہنے
کے بعد زرین نے آنے کا مقصد بیان کرنا شروع کیا۔

''میں گھر میں ہوتا ہی کہاں ہوں جو مجھے کسی کھچڑی کا پتہ چل سکے۔ آپ ہی بتا
دیجئے۔'' اس نے بے نیازی سے کہہ کر فائلیں سمیٹیں اور آپا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تمہارے رشتے کی بات چل رہی ہے۔'' زرین کے منہ میں کڑوے بادام آ
گئے تھے۔

''ہاں، کچھ سنا تو ہے اس بارے میں بھی۔'' رمیز نے لاپروائی سے کہا۔

''اپنی ہونے والی سسرال کے بارے میں جاننے کا کوئی شوق اور دلچسپی نہیں
ہے؟'' زرین نے معنی خیزی سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر صوفے
کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

''جب پراپر سسرال بن گیا تو پھر دلچسپی بھی لیں گے۔ ابھی تو صرف بات چل رہی

"بہت ہی غریب سے لوگ ہیں۔ نہ جانے امی نے کیا دیکھا ہے۔ نوید اور نویز کے سسرال والے اتنے امیر اور خوشحال ہیں، جبکہ زروہ کا میکہ..... کس قدر سبکی ہو گی ہماری۔ نومیہ اور ثناء کو تو باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ امی نے ان کی بہنوں کو ریجیکٹ کر کے زروہ کو نہ جانے کس وجہ سے ترجیح دی ہے۔ بس ایک شکل ہی تو اچھی ہے، اور معاملوں میں تو نومیہ اور ثنا کے پاسنگ بھی نہیں۔" زرین جل بھن کر کہہ رہی تھی۔

"غربت گالی تو نہیں۔ آپ نے کب سے انسانوں کو دولت کے ترازو میں تولنا شروع کر دیا ہے آپا! انسان کی شرافت اور عزت، نیک نامی کی کوئی ویلیو نہیں؟ جس کے پاس پیسہ نہیں، کیا وہ انسان نہیں؟........ اور امی نے کچھ دیکھ اور پرکھ کر ہی فیصلہ کیا ہے نا۔ مجھے امی کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں۔ اور رہی بات نومیہ اور ثنا بھابی کی تو آپ ان کے ساتھ زروہ کا مقابلہ نہ کریں۔ ہر انسان کی اپنی شخصیت ہوتی ہے۔ مزاج کا فرق ہوتا ہے، سوچ مختلف ہوتی ہے۔ پھر سب کو ایک ہی لائن میں کھڑا نہیں کرتے۔ کم از کم میں نومیہ اور ثنا بھابی جیسی کسی بھی عورت کے ساتھ دو پل نہیں گزار سکتا، کجا کہ پوری زندگی مجھے اپنے بھائیوں پر ترس آتا ہے۔ بے چاروں کی اپنی کوئی چوائس تو رہی نہیں، حتیٰ سوچ تک بیویوں کے پاس گروی رکھ دی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"بات تو ٹھیک کر رہا ہے۔" زرین نے کچھ کچھ اتفاق کر لیا تھا، مگر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"تمہیں اپنے سسرال کو حلقہ احباب سے متعارف کرواتے ہوئے شرمندگی نہیں ہو گی؟" اس نے چبھتے لہجے میں کہا تھا۔

"کم از کم میں ایسی سطحی سوچ نہیں رکھتا۔ نہ ہی اسٹیٹس کے لحاظ سے لوگوں سے ہوں۔" رمیز نے فائلیں اٹھا کر بریف کیس میں محفوظ کر لیں اور کلک کی آواز کے سا اسے بند کر دیا۔

"ہاں، میں تو وصی کے بارے میں بات کرنے آئی تھی۔" زرین نے جان بوجھ موضوع ہی بدل دیا تھا۔

"کیا بات کرنی ہے؟"

"مجھے بتا رہا تھا کہ اسے جاب مل گئی ہے۔" زرین نے جلے کٹے انداز میں کہا مزید بولی۔

"پہلے تعلیم تو مکمل کر لیتا۔ تم ہی اسے سمجھاتا۔ خوامخواہ اِدھر اُدھر ٹانگیں اڑا ضرورت نہیں۔"

"آپا! وہ جاب کر رہا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ اعتماد اور تجربے میں اضافہ ہو گا۔ آج کل اچھی نوکریاں کہاں ملتی ہیں؟" رمیز نے اسے سمجھانا چاہا تو زرین کٹیلے لہجے میں بولی۔

"ابھی تو وہ بچہ ہے، میں اس پر ذمے داریوں کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔"

"آپا! ذمہ داری کیسی، وہ جاب شوقیہ کر رہا ہے۔ اور آپ تو شکر کریں کہ اس میں احساسِ ذمہ داری کے جراثیم موجود ہیں جو آج کل کے لڑکوں میں قطعاً نہیں پائے جاتے۔ اور پھر آوارہ دوستوں کے ساتھ پھرنے سے بہتر ہے کہ وہ مصروف رہے۔" رمیز نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔ زرین جھنجلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"آپا بھی حد کرتی ہیں۔ ابھی تک اسے بچہ بنایا ہوا ہے۔ ماشاء اللہ، وصی سمجھ دار ہے، ضرور ترقی کرے گا۔" رمیز نے سوچتے ہوئے نائٹ سوٹ نکالا اور واش روم میں گھس گیا۔

❁

درمکنون، عیشہ اور عیشہ سے ہونے والی سرسری سی ملاقات کو یکسر بھلا چکی تھی۔ مگر کچھ دیر پہلے ماسی نے اسے کسی لڑکی کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ اس وقت کلاس رومز کے راؤنڈ پر تھی۔ جوں ہی آفس میں قدم رکھا، نگاہ صوفے میں دھنسی عیشہ پر پڑی وہ بہت پُرجوش سی اس کی طرف بڑھی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟........ آئی کیوں نہیں ہمارے گھر؟ میں نے آپ کا اتنا انتظار کیا تھا۔" وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے خفگی بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"آئی ایم سوری عیشہ! بس مصروفیت میں یاد ہی نہیں رہا تھا۔" درمکنون اس کے ملبوس سے متاثر سی صفائیاں دینے لگی۔ "آج شام کو آؤں گی۔"

"اب آنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے آدھے گھنٹے تک واپس ہاسٹل چلے جانا ہے۔ ویک اینڈ پر آؤں گی، پھر آئیے گا۔" اس نے خفا خفا انداز میں کہا۔ "ابھی صرف دس منٹ کے لئے آپ سے ملنے کے لئے آئی تھی۔"

"شکریہ اس طرح یاد رکھنے کا۔" درمکنون نے پیار سے اس کا نرم ہاتھ دبا کر کہا۔

"میں نے عبدل بھائی کو پیغام بھی دیا تھا۔ یقیناً انہوں نے آپ کو نہیں بتایا ہو گا۔ کالج جا کر ان کی کلاس لوں گی۔" عیشہ نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں۔ درمکنون چونک اٹھی۔

''میں نے عبدل بھائی سے کہا تھا کہ میں درمکنون آپی کا شام کی چائے پر انتظار کر رہی ہوں، انہیں ضرور ہماری طرف بھجوایئے گا۔ مگر انہوں نے آپ کو میسج نہیں دیا۔ میں نے اتنا اہتمام کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے کیک بیک کیا، کباب بنائے، پزا بھی بنایا تھا۔'' وہ رنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

''اچھا آپی! ابھی میں چلتی ہوں۔ ڈرائیور انتظار کر رہا ہوگا۔ اگلے ویک اینڈ پر ملاقات ہوگی۔'' وہ اس کا گال چومتے ہوئے محبت سے بائے بائے کرتی باہر نکل گئی تھی، جبکہ درمکنون ششدر سی سوچتی رہی۔

'کیا میں اس محبت کے قابل تھی؟'

گھر آکر بھی وہ مسلسل عیشہ کے متعلق ہی سوچتی رہی۔ بابا صاحب، عبدالباری اور اب عیشہ۔

''میں ان سب کی محبتوں کے قابل خود کو نہیں سمجھتی۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''عبدل لالہ کہہ رہے ہیں، اچھی سی چائے بنا کر مردانے میں مکرم کے ہاتھ بھیجیں۔'' بخذن بی بی کی آواز پر وہ چونک کر سر ہلاتے ہوئے کچن کی طرف آگئی۔

''بابا صاحب سے پوچھ کر آؤ، ان کے لئے بھی چائے لاؤں؟'' اس نے برنر آن کر کے آگ جلاتے ہوئے کہا۔

بابا صاحب کی پچھلے دو دن سے طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ویسے تو اکثر ہی انہیں تکلیف ہو جاتی تھی، مگر آج کل موسمی بخار نے انہیں جکڑ رکھا تھا۔ اس نے چائے ٹی پاٹ میں رکھ کر مردانے میں بھجوائی اور پھر ان کے لئے کالی مرچوں کی گریوی تیار کی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے سلفچی میں ہاتھ دھوئے اور الماری سے گرم شال نکال کر اپنے اردگرد اچھی طرح لپیٹ کر صحن میں چلی آئی۔ یہ ہل سائیڈ (پہاڑی علاقہ) تھا۔ شام کے وقت اچھی خاصی ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ بخذن بی بی نے تو دو دن سے سویٹر پہن لیا تھا۔

''بابا صاحب نے چائے نہیں پی۔ وہ تسبیح پڑھ رہے ہیں۔ کیا میں چائے پی لوں بی بی صاحب؟'' وہ معصومیت سے اجازت طلب نظر سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ درمکنون کو ہنسی آگئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ خوشی خوشی کچن کی طرف بڑھ گئی،

''ہنستی رہا کریں، نیک دل خاتون! اچھی لگتی ہیں۔'' اپنے پیچھے بھاری مردانہ سن کر وہ اچھل کر پلٹی۔

عبدالباری گرے شال کندھوں پر ڈالے مسکراتی نظروں سے اس کا جائزہ لے کر

رہا تھا۔ درمکنون نے سختی سے گلابی لب یوں بھینچ لئے تھے، گویا اب کبھی بھی نہ کھلیں گے۔

''اگلے ہفتے میں آؤں گا تو تمہیں عیشہ کی طرف لے کر جانا ہے۔ وہ مجھ سے بہت لڑ جھگڑ کر گئی ہے۔ ایکچوئلی، اس نے دو دن پہلے مجھے ایک میسج دیا تھا، جو گھر آنے تک میرے ذہن سے آؤٹ ہو گیا تھا۔ بے چاری کیک اور پزا بنا کر تمہارا انتظار کرتی رہی تھی۔ میں نے بھی دل میں پلاننگ کی تھی کہ اکیلے تو میں بھی درمکنون کو پزا کھانے نہیں دوں گا۔'' اس کی آنکھوں میں بھرپور شرارت تھی۔ درمکنون کو اس کی مکاری پر غصہ آ گیا۔

''ایک معصوم بچی کو ہرٹ کر کے تمہیں کیا ملا ہے؟''

''بچی ہرٹ کہاں ہوئی تھی؟ غصے کے عالم میں تمام کھانے پینے کی چیزیں ٹوکری میں ڈال کر نیچے بستی میں اپنے نوکر کے گھر دے آئی تھی اور اس کے بچوں کے ساتھ دو گھنٹے کھیلتی رہی۔'' وہ مزے سے بتا رہا تھا۔

''عیشہ سکول میں بھی آئی تھی۔ بہت خفا تھی مجھ سے۔''

''اس کی خفگی پل دو پل کی ہوتی ہے۔ وہ پھر سے تمہیں گھر بلانے کے پلان بنا کر آئے گی۔ ویسے ایک تسلی تو ہے دل کو کہ عیشہ کا کوئی بھائی نہیں۔'' اس نے شریر انداز میں درمکنون کو چھیڑا تو اس کی بھنویں تن گئیں۔

''میرے ساتھ فرینک ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''تو پھر کس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کروں؟'' بڑی معصومیت سے پوچھا گیا تھا۔

''شہر کی لڑکیاں مر گئی ہیں کیا؟'' اس نے غصے سے آنکھیں سکیڑ کر کہا۔

''ہمیں شہر کی لڑکیوں سے کیا لینا دینا؟ ہماری تو آپ ہی سب کچھ ہیں۔'' عبدالباری نے بے نیازی سے کہہ کر سفید پالش شدہ کرسی گھسیٹی اور اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

''اب پلیز بابا جان کا ڈراوا دے کر دھمکانے کی کوشش نہ کرنا۔'' اس نے ڈرنے کی بھرپور ایکٹنگ کی تھی۔

''میرے ساتھ ایسی باتیں نہ کیا کرو عبدالباری!'' وہ گہرے دکھ سے کہہ رہی تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ کرب تھا۔ ''میرے زخموں سے خون رسنے لگتا ہے۔ کسی کی شوخ ہنسی اور جاندار زندگی سے بھرپور آواز میرے کانوں میں زہر انڈیلنے لگتی ہے۔ میرا ماضی اژدھے کی مانند پھنکارتا ہوا میری طرف لپکنے کی کوشش کرتا ہے اور میں آنکھیں موند کر اندھا دھند بھاگنے لگتی ہوں، تا کہ کوئی آواز، کوئی یاد میرا پیچھا نہ کرے۔'' درمکنون نے ...ند کر سوچا اور سر کو کرسی کی پشت سے ٹکا کر گہرے سانس لینے لگی۔

"زندگی بوجھ بن کر رہ گئی ہے۔ نہ جانے کب سانسوں کی قید سے رہائی ملے۔ کب زندگی کی اذیت سے چھٹکارا پاؤں گی۔" اس کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔ عبدالباری اس کے چہرے کے تاثرات بغور پڑھ رہا تھا۔

"درمکنون! کیا تمہیں کسی ایسے ساتھی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، جس کے کندھے پر سر رکھ کر تم تمام درد کہہ دو؟"

"نہیں۔" اس کے لہجے میں پتھروں کی سی سختی تھی۔

"تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟" وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"تم کیوں ایک زخم زخم عورت کی رفاقت کے خواب دیکھ رہے ہو؟ میرے پاس کچھ بھی نہیں تمہیں دینے کے لئے۔ نہ کوئی امنگ ہے نہ جذبہ، نہ کوئی خواہش زندہ رہ چکی ہے۔ اب تو صرف راکھ کا ڈھیر بچا ہے، جس میں اگر کوئی چنگاری تھی بھی تو اب وہ بھی بجھ چکی ہے۔' اس نے تھک کر سوچا اور دھیرے سے بولی۔

"تم بابا صاحب کے بیٹے ہو، میرا تم پر اعتبار قائم ہے۔"

"تھینکس گاڈ! ہماری کوئی تو خوبی آپ پر آشکار ہوئی۔ خواہ بابا جان کے توسط سے ہی سہی۔" عبدالباری نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے اور مزید بولا۔ "اگر تمہیں کسی نے دھوکا دیا ہے تو ضروری نہیں کہ سب کو ایک ہی پیمانے سے ناپا جائے۔"

"بغیر تصدیق کے کسی کے بارے میں حتمی رائے دینا دانش مندوں کا شیوہ نہیں۔"

وہ ہنسی تھی۔ ایک ٹوٹی، افسردہ، تھکی تھکی سی بے جان ہنسی۔

"آپ نے ہمیں دانش مند تو تسلیم کر ہی لیا ہے۔" عبدالباری جاندار انداز میں مسکرایا تھا۔

"ہماری عنایات، کرم، مہربانی، شفقت اور محبت کو بھی مان ہی لیں گی۔" اس نے پہلی مرتبہ بہت واضح لفظوں میں اظہارِ محبت کیا تھا۔

"تمہارے سامنے ایک واضح منزل ہے۔ وسیع جہان اور بہت سی خوشیاں تمہاری منتظر ہیں۔ جبکہ میری دنیا بہت محدود ہو چکی ہے۔ میں نے اپنے اردگرد ایک دائرہ کھینچ لیا ہے، جس کے حصار سے نکلنے کی مجھے خواہش ہی نہیں۔"

وہ گویا خواب کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

دھڑا دھڑ شاپنگ ہو رہی ہے، مگر ڈیٹ تو ابھی فکس نہیں کی۔" زرین نے ساگ کاٹتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"آج جاؤں گی فاخرہ کی طرف۔ نئے چاند کی چودہ ٹھیک رہے گی۔" شگفتہ بیگم نے سوچتے ہوئے بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

'حیرت ہے...... اتنی دلچسپی۔' انہوں نے سوچا تھا، کہا نہیں۔

"میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔ اسکول میں سرسری سا دیکھا تھا، بھائی جان کو۔ ایک تفصیلی ملاقات تو ہونی چاہئے۔" زرین نے معنی خیزی سے آنکھیں نچائیں۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ وصی سے کہیں گے، لے چلے گا ہمیں۔ رمیز کی گاڑی شام کو ورکشاپ سے آئے گی۔" انہوں نے سوچتے ہوئے پروگرام ترتیب دیا تھا۔

وصی یونیورسٹی سے آتے ہوئے گاڑی لے آیا تھا۔ ثمن بھی جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ ان کا ارادہ تھا، خالہ قمری کو ساتھ لے کر جانے کا، مگر وہ اپنی کسی سہیلی کی عیادت کے لئے شادمان گئی تھیں۔

وصی بھی چونکہ آج پہلی مرتبہ آیا تھا، اسی لئے وہ خود ہی اسے راستہ سمجھا رہی تھیں۔ جوں ہی وسیع سڑک کا اختتام ہوا، زرین کے ماتھے پر بل پڑنے لگے۔ چھوٹی چھوٹی تنگ گلیاں، پرانی طرز کے مکان، مکینوں کی مالی پوزیشن کو واضح کر رہے تھے۔

"یہاں ہم بارات لے کر آئیں گے؟" زرین سے زیادہ دیر چپ نہیں رہا جا سکتا تھا۔ وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

"بارات میں لوگ ہی کتنے ہوں گے؟ سادگی سے نکاح کرنا ہے، صرف گھر کے افراد ہوں گے۔ البتہ ولیمہ دھوم دھام سے کروں گی۔" انہوں نے تحمل سے جواب دیا تھا۔

"گڈ۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ میری سوچ نانو سے ملتی جلتی ہے۔" وصی نے

جوش کے عالم میں اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔

"نومیہ اور ثنا کو تو باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔" زرین نے جل بھُن کر کہا۔

"انہیں ولیمہ کی دعوت دوں گی۔" انہوں نے نرمی سے کہا اور پھر وصی کی جانب متوجہ ہوگئیں، جو غلط ٹرن لے چکا تھا۔

"اب بیک کیسے کروں؟ اگلی گلی سے ٹرن لے لوں گا۔" وصی نے فکرمندی سے کہا۔

"دعا کرنا بچو! تمہارے ماما بھی ان گلیوں کی بھول بھلیوں میں گم نہ ہو جائیں۔" اس نے حسب توقع زہرافشانی کی۔

"اللہ نہ کرے۔" انہوں نے دہل کر بیک زبان کہا۔

"اب بتائیں نانو! کہاں جانا ہے؟" وصی نے احتیاطاً پوچھا تھا، مبادا پھر سے وہ غلط راستے پر گاڑی نہ ڈال دے۔

"یہیں روک دو بیٹا! آگے گاڑی کہاں جائے گی۔"

"اب کیا پیدل مارچ کرنا ہے؟" زرین نے ناگواری سے پوچھا تو ثمن جھٹ سے بولی۔

"صرف پانچ منٹ کے واکنگ ڈسٹینس پر ہے زروہ مامی کا گھر۔"

"کون سا مکان ہے؟" کیچڑ اور کوڑے کے ڈھیر سے بچتے بچاتے زرین نے تنک کر پوچھا۔

"یہ رہا، سبز پینٹ والا دروازہ۔" ثمن نے دھیرے سے دستک دی تو وصی جھٹ سے بولا۔

"اتنی نزاکت سے دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے۔ یوں دیتے ہیں دستک۔" وصی نے زوردار انداز میں دروازہ دھڑ دھڑانا چاہا، جب ہی ایک دم کواڑ کھول دیا گیا۔ وصی بے چارے کا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔ اوپر سے ثمن کی کھی کھی کے ساتھ سامنے موجود لڑکی کی دبی دبی ہنسی نے اسے حد درجہ شرمندہ سا کر دیا تھا۔

"السلام علیکم خالہ جان!" سنیہ نے شگفتہ بیگم کو دیکھ کر ادب سے سلام کیا۔ زرین نے بغور سنیہ کا جائزہ لے کر اسے اوکے کر دیا تھا۔

'اس غربت میں اتنا حُسن۔' اس نے پہلی مرتبہ اچھے انداز میں سوچا۔ سنیہ نے انہیں ایک صاف ستھرے سادہ سے کمرے میں بٹھایا۔

"زروہ کہاں ہے؟" انہوں نے ہونے والی بہو سے جلد از جلد ملنا چاہا تھا۔ ثمن اور

وصی بھی بے تاب سے بیٹھے تھے۔

"آپی آ رہی ہیں۔" سنیہ نفیس سی ٹرے میں کولڈ ڈرنکس کے گلاس سجائے اندر داخل ہوئی تو انہیں اشتیاق سے اِدھر اُدھر دیکھتے پا کر مسکرانے لگی۔

"کہاں ہیں مامی؟ کب تک آئیں گی؟" وصی نے بے چینی سے پوچھا تو ثمن نے آنکھیں دکھائیں، جبکہ سنیہ، مامی کے مفہوم میں قدرے اُلجھی سی سوچ رہی تھی جب زروہ اور امی دونوں کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے دھیرے دھیرے چلتا ہوا مبین بھی آ گیا۔

سنیہ چپکے سے باہر نکل آئی۔ گلی میں سے بچے کو پکڑ کر چائے کے لوازمات منگوائے۔ اسی اثناء میں سارہ بھی آ چکی تھی۔

"مہمان آئے ہیں، آپی کے سسرال والے؟" سارہ نے اشتیاق سے پوچھا۔ سنیہ نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا، پھر اسے بغور دیکھ کر دھیمی آواز میں بولی۔

"تم پھر دیر سے آئی ہو۔ آپی آج تمہاری کلاس ضرور لیں گی۔"

"یار! آج وین خراب ہوگئی تھی۔" پلیٹ میں رکھے کیک میں سے ایک اٹھا کر سارہ نے منہ میں رکھا اور منمناتے ہوئے بولی۔

"آنٹی لوگ کیا ڈیٹ فکس کرنے آئے ہیں؟" مہک بھی چپکے سے قریب کھسک آئی تھی۔

"کتنا مزہ آئے گا آپی! تم میرے لئے شرارہ سوٹ بنا دینا۔" اس نے بچوں جیسے شوق اور تجسس سے کہا۔ سنیہ دھیرے سے ہنس کر اثبات میں سر ہلانے لگی تھی۔

"یار سنیہ! آپی کے جانے کے بعد گھر کتنا سُونا سُونا ہو جائے گا۔" سارہ نے افسردگی سے کہا۔

"ہوں۔" سنیہ نے ہنکارا بھرا اور چائے ٹی پاٹ میں ڈالنے لگی۔

ایک گھنٹہ مزید وہ لوگ بیٹھ کر چلے گئے تھے۔ جاتے جاتے وصی نے لمحہ بھر کے لئے سنیہ کے پاس ٹک کر کہا۔

"آپ نے چائے اچھی بنائی ہے، پھر نوش فرمانے کے لئے آئیں گے۔"

ثمن، وصی کی اُردو دانی پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی، جبکہ سنیہ قدرے جھجک سی گئی۔

"آپی کی ساس بہت اچھی ہیں۔" سارہ نے ان کے جانے کے بعد تبصرہ کیا۔

"مگر نند بالکل روایتی نندوں والا اور بجنل ماڈل لگ رہی تھیں۔" سعیہ نے بھی زرین کے مغرورانہ تیور نوٹ کئے تھے۔

"زرین آنٹی کے بچے بہت ہنس مکھ تھے۔ ویسے آنٹی بہت ینگ سی ہیں۔ شاید کم عمری میں ان کی شادی ہوئی ہو گی۔ بچے بالکل برابر کے لگتے ہیں۔" سارہ برتن سمیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"سارہ! کام ختم کر کے میری بات سننا۔" زروہ کی آواز سن کر سارہ کے ہاتھوں کے تمام طوطے، کبوتر اُڑ گئے۔

"آپی غصے میں تو نہیں لگ رہیں؟" اس نے معصومیت سے سعیہ کی طرف دیکھ کر تصدیق کرنا چاہی۔

"مجھے کیا پتہ۔" سعیہ نے بے نیازی سے کہا۔

"میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں سعیہ!" اس نے ہراساں ہو کر برتن ٹوکری میں رکھ دیئے۔

"خوف کی وجہ کیا ہے؟" سعیہ نے چبھتے لہجے میں طنزیہ پوچھا۔ "میرے ہاتھ تو نہیں کانپ رہے۔" وہ غصے سے کہہ رہی تھی۔

"میں لیٹ جو آئی ہوں۔" سارہ بسوری۔

"تو خیال رکھنا تھا نا۔" سعیہ نے رگڑ رگڑ کر چولہا صاف کیا، برتن شیلف پر رکھے اور اس کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئی۔

"سعیہ! تم بھی ساتھ آؤ۔" سارہ لجاجت سے کہتی ہوئی گھوم کر اس کے سامنے آ گئی تھی۔

"آپی "ہوا" تو نہیں۔ کمال کرتی ہو سارہ!" وہ ہاٹ پاٹ اٹھا کر مبین کے کمرے کی طرف چل دی تھی۔ جبکہ سارہ بے بسی سے ساتھ والے بند دروازے کو دیکھنے لگی۔

"نئے چاند کی چودہ ٹھیک رہے گی۔" قمری خالہ نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو فاخرہ قدرے بوکھلا سی گئیں۔

"ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے خالہ؟ کم از کم ایک ڈیڑھ سال تک میں شادی کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ دراصل مبین کے علاج پر جمع جتھا سب خرچ ہو گیا ہے۔"

"کیسی احمقانہ باتیں کر رہی ہو فاخرہ!" خالہ نے خفگی سے کہا۔

"روفی کے تیور اچھے نہیں دکھائی دے رہے۔ اسے بھی رشتے کی سن گن مل گئی ہو گی۔ آج کل میں وہ کینو کا ٹرک لے کر کراچی گیا ہوا ہے۔ دو، تین ہفتوں بعد واپسی ہو گی۔ یہی دن مناسب ہیں، سادگی سے نکاح کر کے زروہ کو رخصت کر دو۔ اس بدمعاش سے کیا بعید، خوامخواہ بدمزگی پھیلائے گا۔"

"خالہ! یہ نئی مصیبت گلے آن پڑی ہے۔ پہلے کیا پریشانیاں کم تھیں؟" فاخرہ نے دہل کر کہا۔

"تم فکر نہ کرو۔ تھوڑا بہت انتظام کر لینا۔ چار، پانچ مرد اور گھر کی خواتین ہوں گی۔ میں نے شگفتہ سے بات کر لی ہے۔ بڑی نیک اور بھلی طبیعت کی معاملہ فہم عورت ہے۔ بات کی کرید نہیں کرتی۔" خالہ نے پان کی گلوری منہ میں رکھی اور ہاتھ چادر کے پلو سے صاف کئے۔

"خالی ہاتھ رخصت کرنے کو دل نہیں مانتا۔" وہ اپنے خدشات کو زبان نہیں دے پا رہی تھیں۔ زرین کے ڈھکے چھپے الفاظ کا مفہوم ان پر بخوبی آشکار ہو گیا تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں بہت کچھ کریدنا چاہا تھا۔

"یہ لوگوں نے نہ جانے کیسے اصول بنا لئے ہیں۔ پلی پلائی لڑکی لے کر جی نہیں بھرتا۔ لاکھوں کی مالیت کا جہز چاہئے۔ پہلے زمانے گئے جب سادگی لوگوں کا معیار ہوتی تھی۔ نمود و نمائش کے جراثیم نہیں پھیلے تھے۔ نہ ٹی وی تھا، نہ ریڈیو، نہ ہی موا فیشن تھا۔ اب تو لڑکیاں ہزاروں روپے بیوٹی پارلر پر ضائع کر آتی ہیں۔ نہ جانے کون کون سی کریموں کے مساج کئے جاتے ہیں۔ شوہروں کی جیبوں کا کباڑا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ہمارے وختوں (وقتوں) میں یہ خرافات نہیں تھیں۔ کینو کے چھلکے کا غازہ بنا کر منہ پر مل لیا جاتا تھا۔ مہندی، سرمہ اور خوشبو میں زعفران، عطر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہار سنگھار میں زیادہ نہیں، بس بازو بند، کڑے، بالی، ہار، انگوٹھی۔ یہ تھا جامع سنگھار۔ مگر اب تو آوے کا آوا ہی بگڑ گیا ہے۔ نومیہ اور ثنا کے بھی یہی لچھن تھے۔ آئے دن بیوٹی پارلروں کے چکر۔ میرے من کو تو ایسی باتیں نہیں اچھی لگتی ہیں۔ اسی لئے تو ایسی ہیرا لڑکی ڈھونڈ کر دی ہے۔ ساری زندگی سنور جائے گی شگفتہ کی۔ اتنی سگھڑ، سلیقہ مند، سمجھ دار، چراغ لے کر بھی ڈھونڈتی تو نہ ملتی۔ جب اپنے دل کا ٹکڑا دے رہے ہیں تو پھر مادی اشیاء کی کیا حیثیت۔" خالہ کی طویل گفتگو کا اصل متن واضح ہو گیا تھا۔ مگر فاخرہ پھر بھی کشمکش میں مبتلا تھیں۔

"خالہ! لوگ کیا کہیں گے؟"

"ارے بھاڑ میں گئے لوگ اور ان کی باتیں۔" خالہ نے تنگ کر کہا اور سعیہ کو آواز دی۔

"بچے! تیز پتی والی چائے تو لاؤ۔"

"اچھا خالہ جان!" سعیہ نے برآمدے میں کپڑا لگاتے ہوئے احترام سے جواب دیا۔ قمری خالہ نہال ہی ہو گئیں۔

"فاخرہ! بچیاں تمہاری سب ہی نیک اور بھلی مانس ہیں، مگر سعیہ کی عادتیں سب سے اچھی ہیں۔"

"شکریہ خالہ جان!" سعیہ نے ہانک لگائی تو خالہ قل قل ہنسنے لگیں۔

"شکریہ کا ہے کا؟ تم تو میری سب سے اچھی بیٹی ہو۔" انہوں نے محبت سے کہا اور فاخرہ کے کان میں بولیں۔ "اس کی بھی فکر نہ کرنا۔ سارہ کے بعد اس کا نمبر ہے نا۔"

"جی خالہ!" فاخرہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھیں، چونک کر اثبات میں سر ہلانے لگیں۔

"مبین کا مزاج کیسا ہے؟ بچہ بے چارا کملا کر رہ گیا ہے۔" خالہ نے تاسف سے ہاتھ ملے اور سعیہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی تھام لی۔

"بس خالہ! پریشانیوں نے گھر جو دیکھ لیا ہے۔ جوان بیٹے کو اس حال میں دیکھ کر دل کٹتا ہے میرا۔" فاخرہ کی آواز بھرا گئی۔

"اگر مناسب علاج اور اچھی دوا میسر آتی تو اب تک بھلا چنگا ہو چکا ہوتا، فاخرہ! ایک بات کروں، تمہارا دل تو ضرور دکھے گا، مگر اپنے ہی کام آتے ہیں برے وقت میں۔ تمہارے دل کا ٹکڑا تمہارا خون ہے وہ، اتنا پتھر دل نہیں۔ تم بات تو کر کے دیکھو شاید اب حالات مختلف ہوں۔" انہوں نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا تھا۔ ویسے بھی وہ دل میں بات رکھنے والی نہیں تھیں۔

"مجھے خیرات اور بھیک نہیں چاہئے۔ نہ میں کشکول لے کر اس کی منتیں کروں گی۔" فاخرہ نے سرد آواز میں کہا۔

"وہ کوئی غیر یا اجنبی تو نہیں۔" انہوں نے چائے پی کر ہونٹ چادر سے صاف کئے اور کپ تخت کے نیچے کھسکا دیا۔

"میرے لئے قطعاً اجنبی ہے۔" وہ زہرخند ہوئی تھیں۔ اگرچہ اس کے ذکر سے پر آرے سے چل گئے تھے، مگر آنکھوں میں مکمل سختی تھی۔

"فاخرہ! دل بڑا کر کے ایک مرتبہ کہہ کر تو دیکھو۔ یقیناً تمہاری کچھ پریشانیاں تو کم ہو جائیں گی۔" وہ اپنے موقف پر ہنوز قائم تھیں۔

"میں اس کے زہر میں بجھے لفظوں اور معنوں کو سچ نہیں کرنا چاہتی۔ وہ تو یہی کہے گا کہ مجھے ضرورت اس تک کھینچ لائی ہے۔" فاخرہ نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"تمہارا اس پر پورا پورا حق ہے۔" خالہ نے اپنی عینک صاف کی اور ناک پر ٹکائی۔ وہ فاخرہ کی دلی کیفیات سے واقف تھیں۔ جانتی تھیں کہ بہت سے صدمات فاخرہ نے اپنے ناتواں دل پر جھیل لئے ہیں۔ ماضی کریدنے سے محض دل ہی دکھے گا بے چاری کا۔

"خالہ! درخت کا پھل وہی کھانے کا حق رکھتا ہے جس نے اس درخت کی دیکھ بھال کی ہو، کانٹ چھانٹ کر کے اپنی محنتوں اور محبتوں کا پانی دیا ہو، اس کی بھرپور حفاظت کی ہو۔" فاخرہ کی آواز رندھ گئی تھی۔ انہوں نے دوپٹے کے پلو سے نم آنکھیں پونچھیں۔

"میں اس درخت کی گھنی چھاؤں کے نیچے بیٹھنے کا کوئی حق نہیں رکھتی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ "میرے مقدر میں کڑی دھوپ میں جلنا لکھا ہے۔"

"فرض کرو، کبھی وہ خود آ گیا تو؟" خالہ نے کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"کبھی نہیں آئے گا۔ بڑا انا پرست ہے۔ اور پھر وہ اسے آنے بھی کہاں دے گی، جسے ہم سے نفرت ہے، ہمارے ماحول اور رہن سہن سے نفرت ہے۔" فاخرہ تلخی سے بولیں۔

"پالنے پوسنے کا یہ صلہ دیا ہے۔" خالہ کو بھی نہ جانے کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔

اسی پل سارہ کالج سے آ گئی تھی۔ خالہ کو دیکھ کر سلام کیا اور بیٹھ کر جاگرز اتارنے لگی۔

"تمہارے امتحان کب شروع ہوں گے؟" اب وہ سارہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

"دو ماہ تک۔" اس نے مختصر جواب دیا اور جھک کر جاگرز اٹھانے لگی۔

"آج کیا پکایا ہے........؟" سارہ نے کتاب میں سر دیئے بیٹھی سعیہ سے آہستگی سے پوچھا۔

"آلو کا پراٹھا ہاٹ پاٹ میں رکھا ہے۔ اچار بھی موجود ہے۔ چائے بنا لو اور مزے دار لنچ سے لطف اندوز ہونے کے بعد برتنوں کے ڈھیر کو بھی دھو لینا۔ کل بھی تم نے برتن

نہیں دھوئے تھے۔ آپی تھکی ہاری اسکول سے آتی ہیں اور پھر بکھرے پھیلاوے کو دیکھ کر انہیں سب کچھ سمیٹنا پڑتا ہے۔'' سعیہ نے کتاب پر نگاہیں جمائے جواب دیا۔ خلافِ توقع سارہ نے منہ بنائے بغیر او کے میڈم کہہ کر سب سے پہلے برتن دھوئے اور پھر پراٹھا گرم کر کے پیٹ پوجا کی۔

سعیہ حیران سی تمام کارروائی دیکھ رہی تھی، پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''سارہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''کیوں، مجھے کیا ہوا ہے؟'' سارہ نے حیرانی سے کہا۔

''بغیر ماتھے پر بل ڈالے برتن دھو رہی ہو۔ خاموشی سے آلو کے پراٹھے کو من و سلویٰ سمجھ کر کھا لیا ہے...... میری حیرت تو بجا ہے نا۔'' سعیہ نے وضاحت کی تو وہ مسکرانے لگی تھی۔

''میں کیا اتنی بری ہوں؟''

''نہیں، تم تو بہت اچھی ہو۔ سب سے اچھی۔ مگر تمہاری کچھ عادتیں درمکنون آپی سے ملتی ہیں۔'' سعیہ سادہ سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ مگر داخلی دروازے سے اندر آتی زروہ کے قدم گویا زمین نے جکڑ لئے تھے۔

***

''میری جان! تم بھی بھولنے کی چیز ہو کیا؟ تمہاری کھنکتی ہنسی تو ابھی تک کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ اور یار! تمہاری قربت کا خمار تو چھ سال بعد بھی نہیں اُترا۔ اب اسکا آفرز پر میں کان دھرنے والا نہیں۔ ارے وہ تو بپھری شیرنی ہے۔ پتہ چل گیا نا اسے تو میری اور تمہاری ایسی کی تیسی کر ڈالے گی۔ نہ یارا! میں تو سچی توبہ کر چکا ہوں۔ جب اپنا مال موجود ہو تو اِدھر اُدھر منہ نہیں مارتے۔ تم بھی کوئی حتمی فیصلہ کر کے اپنی نیا پار لگاؤ۔ کب تک ہمارے جیسوں سے جی بہلاؤ گی؟ ویسے بھی سیٹھ حاکم نے تمہارے لئے کافی کچھ چھوڑ کر دنیا کو گڈ بائے کہا تھا۔ کوئی قسمت کا مارا! اسٹیٹس کا شیدائی دام میں پھنس ہی جائے گا۔ ذرا ہم سے نگاہ ہٹا کر اِدھر اُدھر نظر دوڑاؤ۔ کوئی کاٹھ کا اُلو تمہیں مل ہی جائے گا۔ نہ جی، ہم تو اسیرِ عشق ہو کر بالکل بے کار ہو چکے ہیں۔''

''حد ہو گئی بے شرمی کی۔ اتنی عامیانہ گفتگو۔'' عنوہ کے رخسار تپ اٹھے۔ دھاڑ۔ دروازہ کھولے وہ خونخوار تیور لئے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''لو، آ گئے ہماری جان کے دشمن۔'' اس نے موبائل آف کر کے صوفے پر پٹخا

خود بیڈ پر نیم دراز ہو کر بغور عنوہ کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔

''کس سے ایسی گھٹیا گفتگو فرمائی جا رہی تھی......؟'' عنوہ نے آگ بگولا ہو کر کہا اور موبائل اٹھا کر نمبر چیک کرنے لگی۔ مارنیہ کا نام اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔ عنوہ تپ کر چیخ اٹھی۔

''کیوں کیا تھا اس فسادن، بے شرم، بے حیا، بے غیرت نے فون؟''

''کوئی اور بھی بے رہ گئی ہے تو کہہ ڈالو۔ غصہ دل میں نہیں رکھتے۔ خوامخواہ بی پی شوٹ کر جائے گا۔'' وہ نہایت اطمینان سے ٹی وی آن کر کے ریموٹ اچھالتا بولا۔

''اگر آئندہ اس لومڑی سے بات کی تو پھر دیکھئے گا۔'' اس نے وارننگ دینے والے انداز میں بھڑک کر کہا تو زیان عش عش کر اٹھا۔

''اس ادا پر قربان ہو جاؤں۔ اس کے منہ پر لومڑی کہہ دینا۔ قسم سے ایوارڈ دوں گا۔''

''میں ہی پاگل ہوں، جو چیختی چلاتی رہتی ہوں۔ ان محترمہ کو تو پروا نہیں۔ آپ جسے ہے پہلو میں بٹھائیں، جس سے چاہے جان، جان کہہ کر گفتگو کریں۔ جس کا دل ہے منہ اٹھا کر گھر آ جائے۔'' وہ غصے سے پھنکار رہی تھی۔

''اسی بات سے اندازہ لگا لو۔ اس کے نزدیک میری کوئی ویلیو نہیں اور مجھے اس ے کوئی دلچسپی نہیں۔ ویری سمپل، نہ اسے مجھ سے لگاؤ ہے نہ مجھے رانیہ سے انسیت۔''

زیان نے سوچا، لگے ہاتھوں عنوہ کی کچھ غلط فہمیاں دور کر دے۔ جو خدشات اسے رانیہ ے تھے، سب بے بنیاد اور بودے تھے۔ وہ صرف ایک کاغذی تعلق تھا، جسے آج کل وہ نی طور پر ختم کرنے کا سوچ رہا تھا۔ وہ مزید اسے اپنے کھونٹے سے باندھ کر اپنے اعمال کو سیاہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے کیے کا کفارہ ادا کر چکی تھی، اس کے اندر بھی ت اور انتقام کی چنگاریاں بجھ گئی تھیں۔ اس نے بہت منظم طریقے سے اپنی لائف کو یا تھا۔ اب مزید کوئی نقصان برداشت سے باہر تھا۔

''ہ آپ کی بیوی تو ہے نا؟''

''اب نہیں رہے گی۔'' اس کا اطمینان قابلِ دید تھا۔ عنوہ ٹھٹک سی گئی۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''ہی جو تم سمجھ چکی ہو۔'' زیان ٹی وی پر تھرکتی حسینہ کو بغور دیکھتا سنجیدگی سے بولا

ہ نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور پھر غصے سے ریموٹ اٹھا کر چینل

بدلنے لگی۔ زیان حیران پریشان عنوہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا بات ہے جلن اور حسد کی۔ ڈیئر بیگم! اس حسینہ نے اُچھلتے کودتے ٹی وی سے باہر تو نہیں آ جانا تھا۔ خود چھ فٹ دور بیٹھ کر گولہ باری کرنا اور مجھے ٹی وی پر ناچتی حسیناؤں کو دیکھنے کی بھی اجازت نہیں۔''

''وہ........ میں نے ڈرامہ دیکھنا ہے۔'' عنوہ قدرے خجل سی ہو کر بے ربط بولنے لگی۔

''آپ نے کب سے ڈراموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے؟'' زیان کو اسے ستانے، چڑانے میں مزا آنے لگا تھا۔

''تمہارے جلنے اور حسد کی رفتار دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم تو میرے موبائل، لیپ ٹاپ، سیل اور گاڑی سے بھی جیلس ہونا شروع کر دو گی۔ کیونکہ یہ سب ماڈل مجھے کافی عزیز ہیں۔ میرے دوستوں سے تو تم آل ریڈی جلتی ہو، اب سیکرٹری سے حسد کرنا شروع کر دیا۔ یہ علامات محبت کو ظاہر کرتی ہیں۔ مان جاؤ کہ زیان عبیش سے تمہیں گہری، بے تحاشا، بے حساب محبت ہو گئی ہے۔''

''اونہہ، خوش فہمی بہت ہے اپنے بارے میں۔'' عنوہ جزبز سی ہو گئی۔ زیان کے درست اندازے اکثر اسے خجل کر دیتے تھے۔

''عنوہ! میں بہت کونفیڈنٹ ہوں۔ مجھے یقین ہے میری محبت کی آخر جیت ہو گی تم میری محبت کی شدتوں کے آگے سرنگوں ہو جاؤ گی۔ میں لوگوں کو بیک آؤٹ نہیں کر اور تمہیں دغا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کبھی میری چاہتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنا۔ میں تمہارے ساتھ فیئر ہوں۔ سر سے پاؤں تک تمہارا۔ اس دل میں سوا تمہارے کسی کی شبیہہ نہیں۔ میں ماضی میں رہنے والا انسان نہیں۔ جو بیت گیا، اسے کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ میرا اور رانیہ کا کوئی ریلیشن نہیں۔ نہ کل تھا، نہ آج شادی شدہ ہو، جان چکی ہو گی کہ میری بات کا مفہوم کیا ہے۔ بار بار وضاحتیں نہیں گا۔ یہ ایک پیپر میرج ہے۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ مجھے اس پیپر میرج کو نبھانا پڑا وہ اس گھر میں موجود ہے، ضرورت کی تمام چیزیں اسے میسر ہیں۔ اس کے علاوہ رانیہ کو کچھ نہیں دے سکتا۔ کبھی اس کی وکالت کرنے کی کوشش بھی نہیں کرنا۔ تم وہ جانتیں جو کچھ میں جانتا ہوں۔ میری زندگی میں تمہاری جو اہمیت ہے، وہ کسی کی بھی نہیں ہو سکتی۔ اپنے ذہن

تمام خدشات جھاڑ پھونک دو۔ مجھے فریش عورت خصوصاً بیوی دل کو لبھاتی ہے۔ اب اپنا موڈ بہتر کرو اور ہمارا دل بہلانے کا سامان کرو۔ ذرا تیار شیار ہو کر میرے سامنے بیٹھو، تاکہ تمہیں دیکھ کر میں اپنی خوش بختی پر اور مغرور ہو جاؤں۔''

اس نے بات کے اختتام پر کشمکش میں مبتلا عنوہ کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف گھسیٹا۔ وہ توازن برقرار نہیں رکھ سکی تھی، کٹی ہوئی شاخ کی طرح لہراتی اس پر آن گری تھی۔ زیان نے اس کے نازک وجود کو جھٹکا دے کر زور سے بھینچا تو وہ چلا اٹھی۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے زیان؟''

''اسے بے ہودگی نہیں، محبت کہتے ہیں۔ تمہاری کچھ باتیں ناقابل برداشت ہوتی ہیں، مگر کچھ ایسی حرکتیں مثلاً ماریہ سے جلنا کڑھنا اور رانیہ سے جیلسی، یہ چیزیں مجھے بہت اٹریکٹ کرتی ہیں۔ میرا تمام تر غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ اب جو تم نے ٹی وی کی ماڈلز سے جلنا شروع کیا ہے تو مجھے تم پر ٹوٹ کر پیار آ رہا ہے۔ اب اس پیار بھری مشقت کو تو سہنا ہی ہے۔ ہماری جنوں خیزی کے کچھ عملی مظاہرے تو آپ دیکھ چکی ہیں، کچھ اب دیکھ لیجئے گا۔''

اس نے عنوہ کے بالوں کو جھٹکا دے کر بھرپور شرارت کر ڈالی تھی۔ وہ حیا اور شرم سے جھنجلا اٹھی۔ یہاں تو سسرال والوں کا بھی کوئی ڈراوا نہیں تھا اور نہ ہی زیان صاحب کسی سے ڈرنے جھجکنے والے تھے۔

''ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے جم جانا تھا۔'' وہ گھبرائی، بوکھلائی سی دھیمی آواز میں بولی۔

''ہاں تو جائیں گے نا۔ نہا دھو کر۔'' زیان اس کے چہرے پر جھکا تو وہ کھسک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر جاندار شریر گدگدانے والی مسکراہٹ تھی۔ عنوہ شرم سے سرخ پڑ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے دھکیل کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ نے بے شرمی میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔'' وہ بے ترتیب دھڑکنوں کو ہموار کرتے ہوئے کھلے بال سمیٹ کر بولی۔

''ارے، ارے....... جا کہاں رہی ہو، ہمیں تڑپا کر؟'' زیان نے غیر محسوس طریقے سے کھسکتی عنوہ کی کلائی مروڑی اور ایک مرتبہ پھر اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

''زیان! آپ بہت خراب ہوتے جا رہے ہیں۔'' اس نے زیان کے مضبوط سینے میں منہ چھپا کر بھنچی آواز میں کہا۔ اس کی تمام تر مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔ وہ خود کو زیان

کی پناہوں میں بہت محفوظ، بہت مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ ایک دم مسرور اور سرشار۔ محبتوں کی بارش میں بھیگتی شب دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔

"میں نے پہلی ملاقات میں تم سے جھوٹ بولا تھا۔ تمہارے چہرے پر تفاخر، خوشی اور خماری کا احساس دیکھ کر میرے اندر کہیں کانٹا سا چبھا تھا۔ شاید اسی لئے ایک کمینی سی وقتی خوشی حاصل کرنے کی غرض سے میں نے تمہیں ڈبل مائنڈڈ کرنا چاہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ زیان کا بیڈ روم شیئر کرتی ہوں۔ عنوہ! ہمارے درمیان ایسا کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔"

وہ بہت پشیمانی سے سر جھکائے گویا اعتراف جرم کر رہی تھی۔ عنوہ کے دل سے آخری پھانس بھی چپکے سے نکل گئی۔ تاہم کچھ ایسی الجھنیں ضرور تھیں جو ہلکی سی چبھن کا احساس دے رہی تھیں۔ زیان کا رویہ رانیہ کے ساتھ ناقابلِ فہم تھا۔ اس نام نہاد تعلق کے پیچھے کون سی وجہ تھی۔

"جب تم دونوں ہی ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے تو پھر شادی کیوں کی؟"

"بعض حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں۔ جان کر کیا کرو گی؟" رانیہ نے اُداسی سے کہا۔

"میں پھر بھی جاننا چاہوں گی۔" اس نے اصرار کیا۔

"میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔" رانیہ نے بے بسی سے کہتے ہوئے کنپٹیاں دبائیں۔

"مگر کیوں؟ کیا وجہ ہے نہ بتانے کی؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "تمہیں سب کچھ بتانا ہوگا رانیہ!" اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے اجازت نہیں۔ اگر کچھ بولوں گی تو اس آخری پناہ گاہ سے نکال دی جاؤں گی۔" اس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی کرچیاں تڑخ رہی تھیں۔

"مگر میں زیان کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔" عنوہ نے اسے یقین دلانا چاہا۔ رانیہ پھیکی سی ہنسی لبوں پر سجا کر بولی۔

"کیوں اپنی ازدواجی زندگی کو تباہ کرنے پر تلی ہو؟ سب جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے پاس بھی میری طرح کوئی آپشن نہیں ہے۔ تمہاری ممی نے تمہارے ہاتھ پاؤں جکڑ دیئے ہیں۔ ابھی صرف زیان کی محبت دیکھی ہے، نفرت کا ذائقہ نہیں چکھا۔ غصے میں بپھرا ہوا نہیں دیکھا تم نے۔ اسی لئے کہہ رہی ہوں، خاموشی میں ہی عافیت ہے۔

آئندہ زیان پر ایسی بات لانا بھی مت ورنہ یہ جو مس نیٹی ہے نا، چلتا پھرتا ٹیپ ریکارڈر ہے۔ اس گھر کے تمام نوکر اپنے مالک سے انتہائی وفادار ہیں۔ اب تم جاؤ اور پلیز آئندہ اوپر مت آنا۔ اسے میری درخواست سمجھ لو یا پھر خواہش۔" وہ آنکھوں پر بازو رکھ کے تمام تاثرات محفوظ کر چکی تھی۔ عنوہ نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر پھر لب بھینچ کر سست قدموں سے پلٹ آئی۔

زیان اور رانیہ کا تعلق کیوں اتنا مشکوک تھا، وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بے زار تھے اور دونوں فریق ایک دوسرے کی کوئی بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی، کیا راز تھا، کون سی ایسی حقیقت تھی جو عنوہ کو وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ بات کا کوئی بھی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ ایسی گتھی تھی جو سلجھنے کے بجائے مزید اُلجھتی جا رہی تھی۔

"تم نہ بتاؤ، میں پھر بھی جان کر رہوں گی۔" اس نے زیرِلب بڑبڑا کر کہا۔ اسی پل حنا کی آمد کی اطلاع ملی تھی۔ وہ بال سمیٹ کر کیچر میں جکڑتی باہر آ گئی۔ حنا نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔

"عید کے چاند کی طرح مغرور ہو گئی ہو، لاکھ کوششوں سے بھی نظر نہیں آتا۔"

"حنا یار! گھر سے نکلنا ہی نہیں ہوتا۔ میں سارا دن فارغ ہوتی ہوں اور پھر بھی یہ کام ختم نہیں ہوتے۔" وہ حیرانی سے حنا کو بتا رہی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ فارغ بھی ہوتی ہو اور مصروف بھی۔ یہ کہو نا، زیان بھائی اپنے کاموں میں اُلجھائے رکھتے ہیں۔" حنا بہت دور کی کوڑی لائی تھی۔ عنوہ بے ساختہ مسکرا دی۔

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اس نے خندہ پیشانی سے اعتراف کر لیا تو حنا نے مارے حیرت کے پوری آنکھیں کھول لیں۔

"عنوہ! میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟........ یہ تم کہہ رہی ہو؟ ذرا یاد کرنا اپنے الفاظ اور وہ باتیں جو شادی سے پہلے تم کرتی تھیں۔ مجھے زیان اچھا نہیں لگتا، بہت دو نمبر آدمی ہے، بہت ہی واہیات اور بے باک ہے، انتہائی چالاک اور مکار ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"تم بھی کیا سوچتی ہو گی کہ زندگی میں ایک ہی شادی کی ہے اور ہنی مون کا مزا نہیں چکھا۔"

زیان سے کسی سیدھی بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسے ویسے بھی پٹری سے اُترتے دیر نہیں لگتی تھی۔ زیان کی بے باک نگاہیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کانوں تک سرخ ہو گئی۔

"کبھی کوئی بات سیدھے طریقے سے بھی کر لیا کریں۔ ایک ہی شادی...... لاحول ولا قوۃ۔" اس نے تپ کر کہا تو زیان سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔ عنوہ سوچ رہی تھی، سب ایک ہی شادی کرتے ہیں، ہر کوئی آپ جیسا تو نہیں۔

"میں نے غلط بات تو نہیں کی۔ بعض لوگ کرتے ہیں دو تین چار شادیاں جیسا کہ تمہاری ممی اور میری ماں......" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم ہی لب بھینچ کر اٹھ گیا تھا۔ عنوہ کے مارے شرمندگی کے رخسار تپنے لگے۔

"ایک تو ممی کے ایسے حوالے میری جان لے کر چھوڑیں گے۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔ پاپا کی ڈیتھ کے بعد ممی نے دوسری شادی کر لی تھی، ایک طویل عرصہ بورڈنگ میں گزارنے کے بعد وہ اس وقت گھر آئی تھی، جب ممی نے اپنے دوسرے شوہر سے طلاق لے کر ایک مرتبہ پھر آزادانہ لائف گزارنا شروع کر دی تھی۔

ممی کے اور اس کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس کے باوجود وہ ان کے ساتھ رہنے پر اس لئے مجبور تھی کہ اسے دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنے کی عادت ہو چکی تھی۔

جب وہ مری میں ففتھ اسٹینڈرڈ کی اسٹوڈنٹ تھی، تب اس کی ملاقات رمیز سے ہوئی تھی۔ رمیز اس سے کئی سال سینئر تھا۔ شروع شروع میں جب وہ ممی کو مس کرتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رویا کرتی تھی، تب اس کے کلاس فیلوز اور روم میٹ تک

سے کتراتی رہتی تھیں۔

"پور گرل۔ نانی بے بی...... ماما کا بچہ۔" ہر کوئی با آسانی اسے تحقیر اور مذاق کا نشانہ بنا کر انجوائے کرتا تھا۔ سب اسے روتا دیکھ کر چھیڑتے تھے۔ رمیز کا گروپ اس کے قریب سے گزرا تو عنوہ کے اردگرد کھڑے ہجوم کو دیکھ کر رک گیا۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" رمیز نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"اس کا فیڈر گم ہو گیا ہے۔" کسی منچلی نے شرارتاً کہا تھا۔

"بے بی کو لالی پاپ دو۔" سب بے فکرے چہرے کھیل کود میں مصروف تھے۔ ایک وہی غمگین اور اُداس بیٹھی تھی۔ اس دوران رمیز نے اس کی بہت ہیلپ کی۔ اس نے سب بچوں کو جھڑکا جو کہ عنوہ کو ستانے کا پلان بنائے بیٹھے تھے۔ سینئرز کا رعب دیکھ کر سب بچے بھاگ گئے۔ یوں عنوہ کو ایک ہمدرد سہارا میسر آ گیا۔ رمیز اس لئے بھی اس کا خیال رکھتا تھا کہ وہ دونوں ایک ہی شہر سے تھے۔ ایک دن رمیز بھی بہت افسردہ سا سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ عنوہ نے پوچھا تو اس نے آزردگی سے بتایا۔

"میں اپنی آپی کو مس کر رہا ہوں۔"

"تمہاری آپی بھی ہیں رمیز؟" عنوہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں، آپی بھی ہیں اور دو بھائی بھی۔ لیکن وہ تینوں مجھ سے بہت بڑے ہیں۔" وہ اسے تفصیلاً بتانے لگا تھا۔ اسی پل عنوہ کی آنکھوں میں حسرتیں کروٹ لے رہی تھیں۔ ایک گھر، بہن بھائیوں کا تصور۔ وہ گویا ذہنی طور پر رمیز کے گھر اس کے بہن بھائیوں کے درمیان پہنچ چکی تھی۔

"تمہاری آپی پڑھتی ہیں؟" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

"ارے نہیں تو۔ ان کی شادی ہو چکی ہے اور تمہارے جتنے تو ان کے بچے ہوں گے۔" رمیز چونک کر ہنستے ہوئے بتانے لگا۔ اگر رمیز اس سے اپنی ہر بات شیئر کر لیتا تھا تو وہ بھی ممی کے بی ہیویئر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی رمیز کو بتانے لگی۔ ننھے منے سے دکھ، چھوٹی چھوٹی محرومیاں۔ رمیز اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اسکول میں کسی کی جرأت نہیں تھی کہ وہ اسے کوئی اُلٹا سیدھا مذاق یا چھیڑ چھاڑ کرتا۔

اکثر رمیز اسے چڑانے کی غرض سے کہتا۔

"عنوہ! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہاری "ماں" ہوں۔ میرے کلاس فیلوز

بھی یہی کہتے ہیں۔ مگر اب تم مجھے ''ممی، ممی'' نہ کہنا شروع کر دینا۔''

صرف ایک سال تک رمیز کا اور اس کا ساتھ رہا تھا۔ پھر رمیز کسی اور کالج چلا گیا تھا، اپنی بہت سی اچھی یادیں چھوڑ کر۔ اگر وہ حقیقت پسندی سے پچھلے ایک سال پر نگاہ ڈالتی تو اسے رمیز کا رویہ صرف اپنے ساتھ غیر معمولی نہیں محسوس ہوتا تھا۔ وہ بہت نرم دل رکھنے والا ہمدرد لڑکا تھا۔ اسے سب کا احساس اور خیال رہتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو خود تکلیفیں اٹھا لیتے ہیں مگر اپنے سے وابستہ لوگوں تک کسی بھی آنچ کو پہنچنے نہیں دیتے۔ زندگی کے پلیٹ فارم پر بہت سے لوگ ملتے ہیں، مگر کچھ اپنی یادوں کی وجہ سے نقش چھوڑ جاتے ہیں، ذہن میں محفوظ رہ جاتے ہیں۔ رمیز بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔

اسکول میں رمیز کو سب پسند کرتے تھے۔ کلاس فیلوز، فرینڈز، ٹیچرز۔ اور وہ فخر یہ کہا کرتا تھا کہ اس کی تربیت اور اس میں موجود خوبیوں کا سارا کریڈٹ اس کی مدر کو جاتا ہے۔ ایک دن وہ اپنے فرینڈز سے کہہ رہا تھا۔

''مجھے سنبھالنے اور میری تعمیر کرنے والے ہاتھوں میں محبت کی گرمی، ایثار کے جذبے موجود تھے، اس لئے ایک اچھی عمارت تعمیر ہونے کا امکان ہے۔ میں نے بہت ہی محبت کرنے والی اور خود کو فنا کر کے دوسروں کی خوشیاں سلامت رکھنے والی عظیم ماں کی گود میں پرورش پائی ہے۔ لوگوں کی نظر میں وہ ہماری اسٹیپ مدر ہیں، مگر میں کہتا ہوں، ماں صرف ماں ہوتی ہے، سگی یا سوتیلی نہیں۔''

''ایسی مدر کہاں ہوتی ہے؟'' عنوہ یاسیت سے کئی پہر سوچتی رہتی۔

اور کل شام اتنے سالوں بعد اس نے نیو فیشن بوتیک میں بالکل اچانک غیر متوقع رمیز کو دیکھ لیا تھا اور نہ صرف دیکھا بلکہ اس میں ظاہری تبدیلیوں کے باوجود پہچان کے مراحل بھی طے کر لئے تھے۔ اس کے ساتھ ایک بزرگ خاتون اور ایک خوش شکل لڑکی بھی کھڑی کسی ڈریس پر دلائل دے رہی تھی اور بزرگ خاتون قدرے تحمل سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

''زروہ ایسے کپڑے نہیں پہنتی، پھر لینے کا فائدہ؟ تم کچھ اور دیکھ لو۔''

''رمیز......!'' اس نے کچھ جھجکتے ہوئے رمیز کو مخاطب کر ہی لیا تھا۔ وہ اپنا نام سن کر چونکا، پلٹا اور پھر ٹھٹک کر بغور اسے دیکھنے لگا۔ آنٹی اور لڑکی بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

''نہیں پہچانا؟'' عنوہ نے مایوسی کے عالم میں دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''عنوہ........''

ایک دم ہی کچھ فلیش ہوا تھا۔ پونی ٹیل جھلاتی، روتی دھوتی گلابی گلابی سی بچی گھاس پر پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ رمیز کو بہت کچھ یاد آ گیا اور عنوہ کی یادداشت پر بھی شدید حیرانی ہوئی۔ جبکہ عنوہ اس کے منہ سے اپنا نام سن کر خوشی سے کھل اٹھی تھی۔

''تم نے مجھے پہچان لیا ہے رمیز؟'' ایک بہت اچھا، پرانا اور گمشدہ دوست اچانک سامنے دیکھ کر فطری سی خوشی نے عنوہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''یقیناً۔'' رمیز نے مسکرا کر کہا اور پھر ماں کی طرف متوجہ ہو کر تعارف کی رسم نبھائی۔

''امی! یہ عنوہ ہے۔ مری میں ہم ساتھ تھے۔ مگر یہ مجھ سے کافی جونیئر تھی۔ پہلی ملاقات میں یہ مجھ سے روتی دھوتی ملی تھی۔ مگر وہ بات کافی پرانی ہے۔ اس عنوہ سے آج کی عنوہ مختلف لگ رہی ہے۔ خوش باش اور پُراعتماد۔ امیزنگ یار! یہ کس کا کمال ہے عنوہ؟''

''آپ نے تعارف کروایا ہے یا ہمیں مطلع کیا ہے کہ عنوہ پہلے بہت رویا کرتی تھیں؟'' ثمن نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور قدرے تپ کر بولی۔

''میں ثمن ہوں۔ بدقسمتی سے ان کی بھانجی۔ اکثر اپنے جاننے والوں سے میرے ماما جان میرا تعارف کروانا بھول جاتے ہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' ثمن نے بہت پُرجوش انداز میں اس سے ہاتھ ملا کر کہا۔

''کیا کر رہی ہو آج کل؟'' اب وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔

''فارغ۔'' عنوہ نے ہاتھ جھاڑے اور اس کی طرف دیکھا، گویا کہہ رہی ہو، تم لیڈیز بوتیک میں کیا کر رہے ہو؟

وہ کچھ بتانا چاہ رہا تھا، جب ثمن جھٹ سے بولی۔

''ارے آپ فارغ ہوتی ہیں، پڑھتی وڑھتی نہیں ہیں؟ میری نانو کہتی ہیں، خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ بے شک پوچھ لیں نانو سے۔ پاس ہی تو کھڑی ہیں۔''

ثمن، رمیز کے آنکھیں دکھانے کے باوجود پٹر پٹر بول رہی تھی۔ شگفتہ بیگم کپڑوں کی طرف متوجہ تھیں۔

''میں نے ماسٹرز کیا ہے اور میری شادی ہو چکی ہے۔''

''ارے سچ......؟'' ثمن نے ایک دلفریب چیخ ماری۔ رمیز نے بھی اس کے پُراعتماد انداز کو خوشگوار حیرت سے ملاحظہ کیا تھا۔

''آپ شاپنگ کرنے آئی ہوں گی یقیناً۔'' ثمن نے اس کے ہاتھ میں موجود

شاپنگ بیگ دیکھ کر اندازہ لگایا۔ وہ رانیہ کے لئے کچھ ڈریسز خریدنے کی غرض سے مارکیٹ آئی تھی۔

"ہوں۔ میں نے تقریباً شاپنگ کر لی ہے۔ اب واپس جانے لگی تھی، جب رمیز نظر پڑی۔ رمیز میں بھی بہت چینج آ گیا ہے۔" وہ بھرپور صحت مند نوجوان مرد کے روپ میں کھڑا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"ماما! آپ انہیں انوائٹ نہیں کریں گے؟" چلبلی سی ثمن نے رمیز کو ٹھوکا دے کچھ یاد کروانا چاہا تھا۔

"کیوں نہیں۔ نکاح تو سادگی سے ہو رہا ہے، البتہ ولیمہ کا کارڈ تمہیں مل جائے گا اپنا ایڈریس تو بتاؤ۔"

"تمہاری شادی ہو رہی ہے؟........ فنٹاسٹک۔" وہ خوشی سے بھرپور لہجے میں تھی۔ "میں ضرور آؤں گی۔ تم ایڈریس نوٹ کر لو۔"

"عنوہ بیٹے! کتنے بچے ہیں آپ کے؟" شگفتہ بیگم اپنی خریداری مکمل کر کے اس طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ عنوہ ان کے سوال پر بے حد جھینپ گئی۔

"ابھی تو نہیں ہیں۔" اس نے سرخ چہرے کے ساتھ سر جھکائے جواب دیا۔

انہوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔

"اللہ جلد گود ہری کرے۔ عورت ماں بن کر ہی مکمل ہوتی ہے۔" ان کے لہجے شفقت اور نرمی تھی۔ عنوہ حد درجہ متاثر ہوئی۔

"میری امی بہت گریٹ ہیں۔" بہت پہلے رمیز کے بولے گئے چند الفاظ ذہن کے پردے پر لہرائے تو عنوہ کو سچ مچ ان کے "عظیم" ہونے کا یقین آ گیا۔ اس نے مرتبہ ایک سوتیلی ماں کا اپنے بچوں سے والہانہ انداز ملاحظہ کیا تھا۔

'یہاں تو اپنی کوکھ سے پیدا کرنے والی مائیں اولاد کو کسی "سزا" کی طرح قبول ہیں۔' اس نے تنفر سے سوچا۔

❀
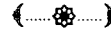
"یہ نبیل نے تمہارے لئے موبائل دیا ہے۔" کرن ایک خوب صورت پیکنگ لپٹے موبائل فون کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ سارہ یوں اچھل کر دو فٹ ہوئی گویا ریڈ کلر کے گفٹ پیک کے بجائے کوئی زہریلا خطرناک اژدھا ہو۔ کاٹنے، ڈسنے کے لئے بے تاب۔

"مم...... مجھے...... مگر کیوں؟" اس نے خوف زدہ انداز میں آنکھیں پھیلائیں۔

ایک سرسری سی ملاقات کے بعد یہ تحائف کا لین دین کم از کم اس کی سوچ سے بالاتر تھا۔ کرن کی سالگرہ میں اسے دیکھا تھا، بظاہر خوش شکل، شوخ اور ذہین...... کھلنڈرا نوجوان...... مجموعی تاثر اچھا تھا۔ مگر اب اس چیپ حرکت پر اسے اپنی سوچ میں ردوبدل کرنا پڑا۔ کچھ دیر ہنسنے بولنے کا شاید انعام تھا یہ گفٹ پیک۔

"اتنی انجان مت بنو۔ میرے کزن کی راتوں کی نیندیں اڑا دی ہیں اور اب بھولی بن کر مجھے چکر دینے کے 'چکر' میں ہو۔" کرن نے ہنسی دبائی تو سارہ کو غصہ آ گیا۔

"اس کے منہ پر مارنا یہ تحفہ۔"

"اتنا ہینڈسم لڑکا کسی اور کو ایسی "آفرز" کرتا تو شاید وہ لڑکی خود کو کچھ اور ہی مخلوق سمجھنے لگتی۔ اور ایک تم ہو۔" کرن حد درجہ تاسف سے اسے گھورا تو وہ زہرخند ہوئی۔

"میں 'ان' گھٹیا لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔" اس نے نوٹس بناتے ہوئے رکھائی سے کہا تو کرن اپنے لہجے کو بدلتے ہوئے بولی۔

"دوستی کی آفر ہی تو کی ہے اس نے، تم خوامخواہ غصہ کرنے لگی ہو۔ اور فرینڈز کو گفٹ وغیرہ تو دیتے ہی رہتے ہیں۔"

"اول تو میں اسے اپنے دوستوں کی فہرست میں شامل ہی نہیں سمجھتی۔ اور دوم دوستی کے لئے میرا معیار کچھ اور ہے۔" سارہ نے بے نیازی سے کہا تو کرن چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں آپ کا 'معیار' جاننا چاہ رہی ہوں۔"

"مگر میں آپ کو بتانا نہیں چاہتی۔ دیکھو کرن! ہم اچھی فرینڈز ہیں، تم کیوں ایک غلط بات پر مجھے قائل کرنے کی کوشش میں وقت ضائع کر رہی ہو؟ تم جس طبقے سے تعلق رکھتی ہو، وہاں ایسی باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتیں۔ مگر میرا ماحول، تربیت اور ماں کی نصیحتیں جو مجھے گھٹی میں پلائی گئی ہیں، ان کا تقاضا یہ ہے کہ میں ان چمکتی دمکتی باتوں سے گریز کروں۔" وہ اس ایک سرسری ملاقات میں نبیل کی آنکھوں سے لپکتے پیغام کو سمجھ چکی تھی۔ اس نے بہت سوچا تھا، ہر پہلو کو سامنے رکھ کر آدھی آدھی رات تک جاگتی رہی اور اس کا نتیجہ انکار کی صورت میں سامنے آ چکا تھا۔

وہ اپنی روایات سے بغاوت کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اگرچہ اچھی زندگی کے خواب کس کو برے لگتے ہیں۔ مگر یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے بے زار تھی

یا اپنے گھر کے مسائل، معاشی پریشانیاں اسے زہر لگتی تھیں۔ بلکہ اپنی ماں کے "تفکر" احساس اسے اپنی دوسری بہنوں جتنا ہی تھا۔ بس وہ اظہار کے طریقوں سے نابلد تھی کرن شاید اس کی باتوں سے قائل ہو چکی تھی، لہٰذا اس کے گال پیار سے تھپتھپا کر گفہ اٹھائے واپس چلی گئی۔

سارہ نے اس آزمائش میں کامیابی پر اللہ کا شکر ادا کیا اور کتابوں کی طرف ہوگئی۔

وہ کرن کو جواب دے کر اور مایوس لوٹا کر ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔ ان کی دوستی پہلے طرح قائم دائم تھی۔ اکثر وہ کرن اور نادیہ کے ہمراہ پزاہٹ اور آئس کریم پارلر تک جاتی تھی۔ اسے اپنی دوستوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا اچھا لگتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس پر دقیانوسی خیالات کی مالک، گنوار پن اور اجڈ لڑکی کا لیبل لگ جائے وہ سب شوخ، چنچل، آزاد خیال لڑکیاں اسے تحقیر بھری نظروں سے دیکھیں اور اس مذاق بنانے کی کوشش کریں۔ اسے اپنی عزتِ نفس اور انا بہت عزیز تھی۔

بہت سے دن کوئی انوکھا واقعہ رونما ہوئے بغیر گزر گئے تھے، جب ایک دن پھر سے نبیل کا پیغام لے آئی۔

"سارہ یار! وہ ایک مرتبہ تم سے ملنے کو بے چین ہے۔ وہ تم سے کوئی ضروری کرنا چاہتا ہے۔ اس نے میری بہت منتیں کی ہیں کہ ایک مرتبہ میں تمہیں اس دوں۔ یار! میں بھی تو تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ بات سن لینے میں کیا حرج ہے" لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

"سوری کرن!" وہ آخری سیڑھی سے اترتے ہوئے بولی۔ "میں اس سے ایک بھی ملنے کی خواہش نہیں رکھتی۔" اس کا انداز حتمی تھا۔ گویا وہ مزید بات سننے کی خوا نہیں رکھتی تھی۔ اب وہ دونوں گراؤنڈ میں آ چکی تھیں۔ سنہری دھوپ کی حرارت قدرے پرسکون کیا تھا، ورنہ لائبریری میں تو مسلسل دانت بج رہے تھے۔

"تو گویا تم نبیل کے سامنے کمزور ہونے سے ڈرتی ہو۔ مان لو سارہ! کہ پرسنالٹی بہت چارمنگ ہے۔" کرن نے مختصر الفاظ میں بہت گہری بات کہہ دی چند لمحوں کے لئے سارہ بالکل گم سم سی رہ گئی۔

"میں اس کی باتوں کے سحر سے خوف زدہ ہوں۔" اس نے چپکے سے اعتراف تھا، مگر بظاہر مضبوطی سے بولی۔

"ایسی بات نہیں۔"

"اوں، ہوں....... اینجیلی! تم اندر سے گیلی نرم مٹی کی طرح ہو چکی ہو، مگر ظاہر نہیں کرتیں۔ تمہیں وہ اچھا بھی لگتا ہے مگر اپنے ماحول اور اسٹیٹس کی وجہ سے اس سچائی کو تسلیم نہیں کرنا چاہتیں۔ اگر تمہیں وہ اتنا ہی ناپسند ہے تو یہی بات اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ دینا، اپنی نفرت کا اظہار اس کے منہ پر کرنا، میں مان جاؤں گی کہ سارہ عبدالرحمٰن بہت سچی، کھری اور مضبوط لڑکی ہے۔" کرن کی آنکھوں میں بھرپور چیلنج کی چمک دکھائی دے رہی تھی۔

سارہ کو ایک دم جلال آ گیا تھا اور اس نے اس چیلنج کو قبول کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ آج کے دور کی سمجھ دار، باشعور اور پُراعتماد لڑکی تھی، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں جذباتیت بھی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس نے اپنی جلد بازی اور غصے کی بدولت ایک غلط فیصلہ کر لیا تھا۔

❁

"تعجب ہے، لوگ میت پر روتے ہیں۔ جس کا جسم مردہ ہو چکا، بے حس، بے جان۔ اور اس پر نہیں روتے جس کا دل مردہ ہو جائے۔ اللہ کی یاد سے غافل رہنے والا مردہ ہی تو ہے۔ زنگ آلود، کھردرا، بے رنگ، بے کار لوہے جیسا دل....... اور یہی دل کی موت ہی تو تشویش ناک ہے۔ ورنہ جسم اور روح کی جدائی کا معاملہ تو سب کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ موت کوئی تکلیف یا پریشانی کا باعث نہیں۔ موت اللہ کی طرف سے مومن کے لئے تحفہ ہے۔ جنہوں نے قلم پکڑے ہیں، وہ کبھی غلط تو نہیں لکھتے۔"

بابا صاحب کی آواز بیٹھک سے باہر تک آ رہی تھی اور درکنون کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

'اس تحفے سے اللہ مجھے کیوں نہیں نوازتا؟....... وہ تو جانتا ہے، میرے اندر اب جینے کی تمنا نہیں رہی۔ پھر مجھے مزید آزمائش میں کیوں ڈال رکھا ہے؟ میں ان آتی جاتی بوجھل، پشیمان اور ندامتوں کے بوجھ سے بھاری سانسوں سے آزادی چاہتی ہوں۔ میری ان تھکی تھکی غم زدہ، نم آنکھوں کو گہری پُرسکون نیند اور طویل نیند کی آرزو ہے۔ مجھے گہری نیند سونا ہے۔ ان آنکھوں میں رتجگوں کے عذاب اُترے ہیں، صحراؤں کی ریت اڑ رہی ہے، اس قدر چبھن ہیں، اتنی اذیت ہے۔ یہ وجود اب مٹی کا ڈھیر بن جانا چاہتا ہے۔ مجھے مٹی کی سوندھی باس اور گیلی گیلی پُرنم خوشبو اپنی طرف بلا رہی ہے۔ مگر بیچ میں

نہ جانے روح اور جسم کا تعلق ٹوٹنے میں کتنا فاصلہ اور وقت درکار ہے۔

میں نے اندھیروں سے اُجالوں تک کا کٹھن، طویل اور صبر آزما سفر طے کرلیا ہے۔ میں آج ایسے ہی بے خوف اور نڈر ہوں جیسے روشنی اور میٹھی، ٹھنڈی دودھیا چاندنی میں ہوتی ہوں۔ کیونکہ اب میں جان گئی ہوں، پہچان گئی ہوں اور اس حقیقت کو پالیا ہے میں نے کہ میرا پروردگار خاموشیوں میں، تنہائیوں میں، ظلمتوں کے بھیانک سائے میں بھی میرے ساتھ ہے۔ اس دل نے اب ظاہری اور نفسانی لذتوں سے منہ موڑ لیا ہے۔ اس مردہ دل میں ایک نئی روح نے جنم لیا ہے۔ مردہ دلوں کے لئے تصوف مشکل ترین ہوتا ہے۔ اس لئے کہ تصوف روح کی غذا ہے، جس سے نفس باطل شرمندہ ہوتا ہے۔ دل زندہ ہوتا ہے اور روح باطن کی آنکھ سے دیکھنے والی بن جاتی ہے۔ تصوف سے انسان اللہ کا برگزیدہ بن جاتا ہے۔ نفسانی لذتیں، زہر بھرے پیالے کے مانند لگتی ہیں۔"

وہ زیرلب بڑبڑاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس نے بھی تصوف کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ دیا تھا۔

❀

"کہاں جانے کی تیاری ہے؟" وہ ابھی ابھی آفس سے آیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی، ریڈ سوٹ میں ملبوس بنی سنوری سی عنوہ کو دیکھ کر زیان نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ سے مطلب؟" بال سلجھاتے ہوئے اس نے آئینے میں نظر آتے زیان کے عکس کو دیکھ کر کہا اور دوبارہ سے اپنے سنہری لچھے دار چمکیلے بالوں میں برش چلانے لگی بھرپور ناراضگی کے طور پر زیان کی طرف پشت بھی کر لی گئی تھی۔

زیان کے لبوں کی تراش میں ایک خوب صورت مسکراہٹ چمک اٹھی۔ وہ پاؤں دبیز کارپٹ پر دھیرے دھیرے چلتا ہوا عنوہ کے بالکل قریب آن پہنچا اور پھر کے نازک شانوں پر ہاتھوں سے دباؤ ڈالتے ہوئے قدرے آگے کی طرف یوں جھکا نازک سی عنوہ اس کے پورے وجود میں گویا چھپ سی گئی تھی۔ اس نے بانہوں کی سی بنا کر اسے اپنے حصار میں جکڑ لیا تھا۔ عنوہ نے مچل کر حصار توڑنا چاہا۔ زیان اس کا ارادہ بھانپ کر بازوؤں کے گھیرے کو مزید تنگ کر کے اسے خوب بھینچا تو وہ کے اظہار کے طور پر خوامخواہ چلانے لگی۔

"چھوڑیں مجھے........ ورنہ مار ڈالوں گی۔"

"تو مار ڈالو۔" زیان نے اپنا چہرہ اس کے گال سے رگڑا تو وہ تنتنا اٹھی۔

"مجھے چھونے کی ضرورت نہیں۔" عنوہ پھنکاری۔

"کیوں غصے سے بل کھا رہی ہو؟" اس نے ایک اور بھرپور شرارت کر ڈالی تھی۔

عنوہ کو رونا آ گیا۔

'یعنی میری خفگی، ناراضی کوئی معنی نہیں رکھتی۔' وہ دکھی دل کے ساتھ سوچ رہی تھی۔

"ارے، ارے........ یہ کیا؟........ بن بادل کے برسات........ عنوہ جان! جانم! کیا ہوا ہے؟" اپنے سینے پر آنسوؤں کی نمی اور دو شفاف قطرے ہاتھوں پر گرتے محسوس کر کے وہ چونکا، ٹھٹکا اور پھر عنوہ کو اپنی طرف گھما ڈالا۔

"کیوں رو رہی ہو؟" زیان پریشان سا ہو گیا تھا۔ عنوہ کچھ نہیں بولی تھی، بس خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

"بولتی کیوں نہیں ہو؟........ کوئی تکلیف ہے؟ درد ہے؟........ بی پی تو لو نہیں؟" وہ تفکر کے عالم میں اسے جھنجوڑ کر سختی سے بولا تھا مگر عنوہ نے رونے کا شغل جاری رکھا بلکہ اتنی توجہ پا کر مزید آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

"بتاتی کیوں نہیں ہو؟........ کیا جان لو گی؟" وہ کس قدر پریشان لگ رہا تھا۔ عنوہ کو دل ہی دل میں حد درجہ خوشی محسوس ہوئی۔

'اچھا ہے........ کچھ دیر ہوتے رہیں پریشان۔ مجھے اتنا انتظار کروایا ہے۔ اب میں بھی تھوڑی دیر تک یوں ہی ستاؤں گی۔'

"تمہاری ممی کا تو فون نہیں آیا؟" اب وہ رونے کی وجہ تک پہنچنا چاہ رہا تھا۔

عنوہ خاموشی سے سوں سوں کرتی رہی۔ زیان نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ آنکھیں رونے کی وجہ سے اور بھی شفاف اور گلابی مائل ہو گئی تھیں۔ ننھی سی ناک سرخ کر لی تھی اس نے رگڑ رگڑ کر۔ زیان نے اس کے شانوں سے ہاتھ ہٹائے اور پھر بلند آواز میں مس نینی کو بلانے لگا۔ عنوہ ایک دم گڑبڑا سی گئی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں مس نینی کانپتی، لرزتی بیڈ روم میں داخل ہوئی۔

"کیوں رو رہی ہے یہ؟........ کیا کوئی گھر میں آیا تھا؟ یا پھر کسی کا فون آیا ہے؟" مس نینی کی بے وجہ ہی درگت بننے والی تھی۔ عنوہ فوراً ہی سنبھل گئی۔ آنسو سرعت سے پونچھے اور مس نینی سے مخاطب ہوئی۔

"آپ جائیے، مس نینی! میں ٹھیک ہوں۔ انہیں تو بس وہم ہو جاتا ہے۔" اس نے

بے ربط انداز میں کہا تھا۔ مس نینی نے اجازت طلب نظروں سے زیان کی طرف دیکھا اور پھر جانے کا سگنل پا کر باہر نکل گئی۔ عنوہ اطمینان سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

"اب بتاؤ، کیوں مگرمچھ کے آنسو چھم چھم برسائے ہیں؟"

"کیا مطلب؟" عنوہ چلائی اور پھر کلاک پر نگاہ پڑی تو اس کا پارہ مزید چڑھ گیا۔

"شرم نہیں آتی دیر سے گھر آتے ہوئے؟ صبح ایک سو بیس مرتبہ یاددہانی کروائی تھی کہ شام کو جلدی تشریف لے آئیے گا۔ ایک فرینڈ کے ولیمے میں شرکت کرنی ہے۔ مگر آپ......"

"اوہ، سوری یار!" زیان نے سر پر ہاتھ مار کر اپنے بھلکڑ پن کو کوسا اور پھر عنوہ کی طرف بغور دیکھنے لگا۔

"اب جلدی سے تیار ہو جایئے۔ رمیز اور ثمن نے دو مرتبہ فون بھی کیا ہے۔" وارڈروب سے اس کے کپڑے نکالتے ہوئے بولی تھی۔ اب مزید ناراضی میں ضائع کرنے سے بہتر تھا، خود بخود ہی صلح کر لی جائے۔

"ایسا ہے عنوہ! کہ تم اکیلی ہی چلی جاؤ۔ آج ایک ہنگامی میٹنگ کی وجہ سے دن مصروفیت رہی ہے۔ سچی، بہت تھک چکا ہوں۔ بہت نیند آ رہی ہے۔" زیان ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور جوتوں سمیت بیڈ پر ڈھے گیا۔

"تم ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔ تمہاری خفگی کی وجہ سے اجازت دے رہا ورنہ دل تو نہیں چاہ رہا تمہیں اس وقت بھیجنے کو۔ گھر میں رہتیں۔ کوئی ہماری خدمت کر کے ثواب کماتیں۔"

"تو آپ نہیں جائیں گے۔" عنوہ نے مایوسی سے کہا اور دوبارہ سے وارڈ کھول کر کپڑے ہینگ کرنے لگی۔

"سوری جانم! غصہ مت کرنا......اچھے موڈ کے ساتھ ولیمے کی دعوت اُڑا کر" وہ تکیہ منہ پر رکھ چکا تھا۔

عنوہ نے بے دلی سے لائٹس آف کیں اور دھیرے سے دروازہ بند کر کے گئی۔ کوریڈور کے آخری سرے پر مس نینی کھڑی تھی۔ عنوہ ایک لمحے کے لئے کے قریب رکی اور بولی۔

"صاحب کھانا نہیں کھائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد ان کے کمرے میں ٹھنڈا دود دیجئے گا۔"

"اوکے میم!" اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔

عنوہ تیز تیز چلتی پورچ تک آئی۔ ڈرائیور پہلے سے ہی گاڑی نکالے منتظر کھڑا تھا، اسے آتا دیکھ کر بیک ڈور کھولنے لگا۔

ولیمے کی ارینج منٹ مغل اعظم میں تھی۔

ولیمے کی دعوت چونکہ وسیع پیمانے پر تھی، اسی لئے دونوں ہال کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ عنوہ کو ایک چیز بہت پسند آئی تھی۔ مردوں اور خواتین کا انتظام الگ الگ کیا گیا تھا۔ ثمن اسے دیکھتے ہی لپک کر آ گئی۔ آج تو اس اول جلول حلیے والی ثمن کی سج دھج بھی دیکھنے کے قابل تھی۔

"عنوہ آپی! اتنی دیر سے آئی ہیں آپ، اور وہ بھی اکیلی......آپ کے اُن کو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔"

"زیان بہت بزی تھے۔" اس نے شرمندگی سے کہا۔

"ننانوے فیصد عورتوں کی طرح جھوٹ مت بولیے۔ وہ مصروف تھے، انہیں کام تھا۔ بے چارے تھکے ہوئے تھے۔" ثمن کھلکھلائی تو عنوہ جھینپ سی گئی۔

"آیئے، میں آپ کو اپنی پیاری سی مامی سے ملواتی ہوں۔" ثمن اس کا ہاتھ تھامے اسٹیج کی طرف لے گئی، جہاں پیاری سی کامنی سی تیکھے نقوش اور گورے رنگ والی سجی سنوری سی شرمائی لجائی دلہن لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی۔

"پیچھے ہٹو بھئی، ہمیں بھی دیکھنے دو۔" ثمن نے جھنجلا کر ایک دو لڑکیوں کو ٹہوکے دیئے اور پھر زروہ کے قریب پہنچ کر بولی۔

"مامی! ان سے ملیے، یہ عنوہ آپی ہیں۔ ماما کی فرینڈ۔ اب ہماری بھی پکی فرینڈ بن گئی ہیں۔"

"بیسٹ وشز فار اے لانگ ہیپی میرڈ لائف۔" عنوہ نے اپنا ملائم ہاتھ اس کے نازک گداز حنائی ہاتھ کی طرف بڑھا کر نرمی سے دبایا اور بہت خلوص سے نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔ وہ زروہ کے برابر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ رمیز کی چوائس ہیں یا پھر اس کے گھر والوں کی؟" کافی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔

"یہ عمدہ چوائس ہماری نانو کی ہے۔ پھر باقی سب کی بھی پسندیدگی شامل ہو گئی تھی۔" ثمن نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ صوفے کے پیچھے کھڑی تھی۔

اسی پل دو خوب صورت لڑکیاں ایک ساتھ اسٹیج پر آئی تھیں۔ ان میں سے ایک بہت غور سے عنوہ کی طرف دیکھا۔ شاید پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ دراصل وہ سے زروہ آپی کے ساتھ محوِ کلام اس لڑکی کو نظروں کے حصار میں لئے ہوئے تھی۔

'کہاں دیکھا ہے میں نے انہیں؟' سدیہ مسلسل سوچ رہی تھی۔ تنگ آ کر اس ذہن پر زور ڈالنا ہی چھوڑ دیا۔

''یہ زروہ مامی کی بہنیں ہیں۔'' ثمن نے ایک مرتبہ پھر ان کے کان میں سرگوشی کی

''ہیلو...... السلام علیکم!'' دونوں نے بیک زبان مختلف الفاظ ادا کئے۔ عنوہ دلچسپی سے سارہ اور سدیہ کو دیکھا، پھر ثمن نے ان سب سے عنوہ کا تعارف کروایا۔ کی امی، بہنیں، شگفتہ آنٹی، زرین اور اپنی تمام فرینڈز سے۔

''ارے...... یہ تو احمق ہے۔ تم کیوں اس کے ساتھ گھسٹتی جا رہی ہو؟''

مووی بن رہی تھی، اسی لئے رمیز کو بھی بلوایا گیا تھا۔ جوں ہی وہ اسٹیج سے اُترا عنوہ کو کی سہیلیوں کے جھرمٹ میں دیکھ کر چکرا گیا۔ وہ گھبرائی، بوکھلائی ان کے تا تا سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ رمیز نے ان کے قریب آ کر اچھا خاصا انہیں ڈپٹ کہا تھا اور ساتھ اسے بھی گھر کا۔

''تم بس مروّت میں ہی ماری جانا عنوہ! میں تو سوچ رہا تھا کہ تم بدل گئی ہو، تو بالکل پونی ٹیل جھلانے والی عنوہ ہو۔ ویسی ہی با مروّت اور گھبرائی بوکھلائی سی۔ ٹکا کر دو تین جواب دو۔ خود بخود منہ بند ہو جائیں گے۔''

''رمیز! یہ مجھے ماڈلنگ کے مشورے دے رہی ہیں۔ اگر زیان یہاں ہوتا تو مشورے دینے والیوں کی خیر نہیں تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے رمیز کو بتایا اور شادی مبارک باد دی۔

''تمہارے زیان صاحب نہیں آئے؟''

''ایکچوئلی ایک ایمرجنسی میٹنگ کی وجہ سے وہ آفس سے لیٹ آئے تھے۔ چونکہ ہوئے تھے، اسی لئے میں نے زور نہیں دیا۔ تمہاری شادی کی پہلی دعوت ہماری طرف گی۔ کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ تمہیں ضرور آنا ہوگا، زروہ کو لے کر۔'' اس نے زروہ رمیز دونوں کو خلوص سے انوائٹ کیا تھا۔ زروہ نے مسکرا کر ہامی بھری تھی۔ یعنی اس کی مسکراہٹ سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس کی دعوت قبول کر چکی ہے۔

''اللہ حافظ آنٹی!'' وہ رمیز اور زروہ کو وش کرنے اور گفٹ اور کیش دینے کے

شگفتہ بیگم کی طرف بڑھ آئی۔

''جا رہی ہو بیٹے؟''

''جی آنٹی! کافی ٹائم ہو گیا ہے۔ ساڑھے بارہ تو بج چکے ہیں۔ پوری زندگی میں پہلا لیٹ نائٹ فنکشن اٹینڈ کیا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا تو شگفتہ بیگم کے برابر بیٹھی فاخرہ بھی مسکرا دی تھیں۔

''بچی! باوا کے ساتھ آئی ہو یا بھائی کے ساتھ؟'' خالہ قمری، پان کی گلوری چپکے سے منہ میں رکھے قریب آ گئی تھیں۔

''میں ڈرائیور کے ساتھ آئی ہوں۔''

''اتنی رات ہو گئی ہے۔ زیور گہنا پہن رکھا ہے۔ احتیاط سے جانا...... اور ہاں، آیت الکرسی کا وِرد بھی کرتی رہنا پورے سفر کے دوران۔'' انہوں نے عادتاً سمجھایا تو عنوہ کو اس غیر عورت کی اپنے لئے فکرمندی بہت اچھی لگی تھی۔ اور جب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تو اچانک کچھ فلیش ہوا۔

''آیت الکرسی کا ورد کرتی رہنا۔''

عنوہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان چند الفاظ نے اسے گویا اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ سحرزدہ سی انہی الفاظ میں کھوئی رہی۔

''کیا بہت طاقت ہے ان لفظوں میں؟'' اس نے حیرانی سے سوچا اور آیت الکرسی کو ذہن میں دہرانے لگی۔

مگر بہت بچپن میں قاری صاحب سے لیا گیا سبق حافظے سے نکل گیا تھا۔ مگر عنوہ کو ان چند لمحوں میں گویا جستجو بے تاب کر رہی تھی۔ ان لفظوں کو اپنی زبان سے ادا کرنے کے لئے وہ بے حد بے چین تھی۔ اسے گھر جا کر کچھ کتابوں کا مطالعہ کرنے کی جلدی تھی۔

اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے قدم بے ساختہ نسوانی قہقہے اور گمبیر مردانہ ہنسی کی آواز سن کر ٹھٹک گئے تھے۔

''زیان۔'' اس کے لبوں سے اک سرد آواز نکلی۔

''ساتھ کون ہے؟'' وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگنے لگی۔ شدید غصے کے عالم میں اس نے سٹنگ روم کے آبنوسی دروازے کی ناب گھمائی اور ہلکا سا دروازے کو پش کیا۔ سامنے کاؤچ پر نیم دراز بے حیائی کا نمونہ ماریہ جلوہ افروز تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر رکھے صوفے پر زیان بیٹھا تھا۔ عین وسط میں رکھی گلاس ٹیبل پر شغل کے تمام لوازمات ترتیب سے رکھے تھے۔

عنوہ کے اندر آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے خوب سانس کھینچ کر اس بدبو کو محسوس کیا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بُو کس چیز کی ہے۔ یوں بھی اس انتہائی غلیظ بدبو سے اس کی بچپن سے ہی آشنائی تھی۔ اس کی ماں کا یہ فیورٹ ڈرنک تھا۔

عنوہ کو اس پل نہ جانے کیا ہوا۔ منہ پر ہاتھ رکھے، سسکیاں روکتی وہ بھاگتی ہوئی اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ضبط کی تمام تر طنابیں چھوٹ گئی تھیں۔ وہ بیڈ پر اوندھی لیٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

نہ جانے کتنے پل، کتنے لمحے اور کتنے گھنٹے بیت گئے تھے، جب کلک کی آواز دروازہ کھلا اور کوئی سست قدموں سے چلتا ہوا اس کے برابر ڈھے گیا۔

عنوہ نے شدت گریہ سے سرخ آنکھیں کھول کر اپنے قریب لیٹے زیان کی دیکھا جو نہ جانے کیا کیا بڑبڑا رہا تھا۔ ان تین مہینوں میں پہلی مرتبہ عنوہ نے اسے مدہوشی کی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ زیان نے پینا پلانا چھوڑ دیا ہے اس کے اکثر اندازے غلط ہی ثابت ہوتے تھے۔

''ماریہ نو سالوں سے بھڑکتی آگ کو پھر سے دہکا گئی ہے۔'' زیان نے نفرت سے اونچی آواز میں کہا اور پوری قوت سے شرٹ کو اس طرح کھینچا کہ تمام بٹن ٹوٹ کر جا بجا بکھر گئے تھے۔ پھٹی ہوئی شرٹ کا گولا بنا کر اس نے کارپٹ کی طرف اچھال دیا تھا۔

عنوہ سمجھ رہی تھی کہ اسے بہت چڑھ گئی ہے۔ مگر زیان پورے ہوش و حواس قائم رکھے ہوئے تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھا اور بغیر لڑکھڑائے روم فریج سے ایک لیٹر کی پیپسی کی بوتل نکال کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ صرف تین منٹ میں اس نے پوری بوتل خالی کر کے اچھال دی تھی اور خود صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے پوری سرخ انگارہ آنکھیں کھولے عنوہ کی طرف دیکھنے لگا، جو حق دق سی مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''عنوہ! تم گھبرا رہی ہو........؟'' وہ ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ زیان سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ وہ یقیناً بہت خوف زدہ سی دکھائی دے رہی تھی۔

''تمہیں مجھ سے ڈر لگ رہا ہے؟'' زیان دھیرے سے مسکرایا۔ نہ جانے کیوں عنوہ یہ مسکراہٹ زخمی سی لگی تھی، گویا بہت ہی مشکل مرحلے سے گزر کر محض کسی دوسرے کو نے کی غرض سے مسکرا دینا۔

''تم جانتی ہو 'خندہ مینا' کے کیا معنی ہیں؟'' اب وہ بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اس کے سیاہ بالوں کی جڑوں میں سے اچھی خاصی ٹھنڈ کے باوجود پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس کی سفید صحت مند گردن پر بھی پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

''تم کہاں جانتی ہو گی؟'' وہ ہولے سے مسکرایا۔ ویسی ہی اذیت ناک، زخمی سی مسکراہٹ۔

''ایسی باتیں اس ماریہ کو پتہ ہوتی ہیں یا پھر دریہ کو معلوم تھا۔ تم جانتی ہو عنوہ! دریہ کو مینا کی آواز بہت پسند تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ پیگ پر پیگ چڑھاتی تھی۔ میں چیختا رہ جاتا تھا، مگر وہ پیئے جاتی تھی۔ اسے شیشے کے گلاس میں شراب انڈیلتے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے، وہ بہت پسند تھی۔ صرف اس آواز کو سننے کے لئے وہ پیگ پر پیگ بنائے جاتی۔ نہ جانے کیا کشش تھی اس آواز میں........ اسے مجھ سے زیادہ شراب کی آواز سے محبت تھی۔'' وہ گردن سے پھسلتے پسینے کے قطروں کو ہاتھوں کی پشت سے پونچھتا کہہ رہا تھا۔ عنوہ کی اُلجھنوں میں ایک اور اُلجھن کا اضافہ ہو چکا تھا۔

''دریہ۔'' وہ زیرلب بڑبڑائی۔

"نہ جانے کتنی پرتیں ہیں تمہاری زبان! اتنے دبیز پردوں میں تمہاری ذات چھپی ہے۔" اس نے اذیت سے اپنے نچلے لب کو دانتوں سے چبایا یہاں تک کہ ایک ننھی سی خون کی بوند ٹپک پڑی تھی۔

"نہ جانے میں کیوں اس کو یاد کر رہا ہوں۔ میری زبان پر اس ناپاک غلیظ دریہ کا نام آیا بھی کیسے؟" اب وہ حیرانی سے خود کو مخاطب کر کے دو چار گالیوں سے نواز رہا تھا۔

"بڑی بے شرم اور بے غیرت عورت تھی۔ میری روح کا ناسور۔ میری زندگی کا عذاب۔ پہلے میری محبتوں کا محور تھی، پھر نفرتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا اور اب میں نے اس نفرت کے پودے کو بھی جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ اچھا کیا ہے نا عنوہ! اب دیکھو نا، محبت ہو یا نفرت، انسانوں سے کی جاتی ہے۔ مگر میں تو سرے سے اسے انسانوں کی لسٹ سے خارج کر چکا ہوں۔ بلکہ وہ تو عورت بھی نہیں........ ایک خونخوار بلی تھی۔ جس نے میری زندگی کے نو سالوں کا رس چوس لیا ہے۔ اگر تم نہ ملتیں عنوہ! تو میں سانسوں کے اس سلسلے کو ہی ختم کر ڈالتا۔"

اب وہ اٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے عنوہ کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر چہرے پر دونوں ہاتھ رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

زیان اپنی دھن میں مگن کہہ رہا تھا۔

"وہ زہریلی ناگن تھی۔ کوبرے جتنا زہر تھا اس میں۔ میں نے ہاتھ لگایا اور نیل نیل ہو گیا۔ گندی عورت۔" وہ تنفر سے پھنکارا اور پھر اس کی طرف رخ کر لیا۔

"مگر تم ایسی نہیں ہو۔ سب سے مختلف ہو، سب سے الگ۔ بہت خالص، شفاف بہت ہی پاکیزہ، مقدس۔ تمہیں خاص طور پر اللہ نے میرے لئے بنایا ہے۔ تم گو موتی، لعل یا نیلم ہو۔ جی چاہتا ہے، اک خوشبو سے بھری ڈبیا میں بند کر کے تمہیں دل کے نہاں خانوں میں چھپا لوں۔ تم جو ہی ہو یا روبل........ یا پھر گل مان ہو پھول کی جان........ کسی پہاڑ کے عین وسط سے نکلنے والی آبشار، پانی کی صاف چادر ہو۔ ٹھنڈا میٹھا، گھنٹیاں بجاتا جھرنا ہو۔ میری روح کا اطمینان ہو۔ میرے دہکتے کو تمہاری قربت کی ٹھنڈک نے گلزار کر دیا ہے عنوہ!........ میں تمہیں پا کر بہت ہوں۔ مجھے لگتا ہے، میں نے سارے جہان کی خوشیاں سمیٹ لی ہیں۔ میں سچ ہوں۔ تم کیوں رو رہی ہو عنوہ؟"

وہ لرز رہی تھی، کانپ رہی تھی۔ اس کے آنسو ایک تواتر سے بہہ رہے تھے۔

چونک گیا تھا۔ اور پھر نیند سے بوجھل، بمشکل آنکھیں کھولے اسے دیکھنے لگا۔

"تمہارے آنسو تو بہت قیمتی ہیں عنوہ!" وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔ "رانیہ روئے، دریہ بھی روئے۔ دنیا کی ساری عورتیں دھاڑیں مار مار کر روئیں۔ مگر عنوہ! تم کبھی بھی نہ رونا۔ مجھے عورت کے آنسو وحشت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اور تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔ جب تم روتی ہو تو میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ میرا دل پریشان ہو جاتا ہے۔" زیان نے اس کے بھیگے گلابی چہرے کو ہاتھ سے چھو کر کہا۔

اس نے تنفر سے زیان کے ہاتھ جھٹکے اور خود کھسک کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زیان کا منہ کسی مضبوط شے سے باندھ دے۔ یہاں تک کہ اس کی آواز نہ نکلے۔

"تمہیں سمیل آ رہی ہے نا........ اس کی سمیل ہوتی ہی بری ہے۔ مجھے بھی اب اچھی نہیں لگتی۔ مگر اس نے نہ جانے کون کون سے زخموں سے کھرنڈ اتار ڈالے ہیں کہ مجبوراً غم بھلانے کے لئے مجھے تھوڑی سی پینا پڑی ہے۔ یہ آخری مرتبہ پی ہے، اب کبھی منہ نہیں لگاؤں گا۔ میں جانتا ہوں، تمہیں ڈرنک کرنے والے لوگ برے لگتے ہیں۔ میں تمہاری نظروں میں صرف اچھا رہنا چاہتا ہوں۔ مگر دیکھو نا عنوہ! تمہاری ممی بھی تو چین ڈرنکر ہیں۔ وہ بھی غم بھلانے کے لئے پیتی ہیں۔

تم تیئس سال اپنی ماں کے ساتھ رہی ہو اور تمہیں پتہ بھی نہیں کہ تمہاری ماں بھی بہت روگی تھی۔ انہیں بھی محبت کی چاہ تھی۔ وہ بھی دریہ جیسی ہیں۔ بے حیا اور بدبخت۔ ان کے ماتھے پر بھی ندامت کے داغ ہیں۔ جنہیں وہ شراب کے نشے میں دھت رہ کر دھونا چاہتی ہیں، بھلانا چاہتی ہیں۔ انہیں ضمیر کے کوڑے چین نہیں لینے دیتے۔ تمہیں پتہ ہے، تمہاری ماں کو کس سے محبت تھی؟" وہ آنکھیں مسل کر نیند کو بھگانا چاہ رہا تھا۔

اب کے عنوہ چونکی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کے دل میں خواہش جاگی کہ وہ بولتا رہے۔ شاید کچھ راز، کچھ بھید کھلنے والے تھے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"تمہارے باپ سے۔ ہاشم فریدی سے۔" وہ بہت زور سے ہنسا تھا۔ "تمہاری ماں کو ہاشم فریدی سے اس وقت محبت ہوئی جب وہ امبرین کو اس کی خواہش کے مطابق طلاق دے کر ہمیشہ کے لئے کہیں چلا گیا تھا۔ سننے میں آیا تھا، ہاشم فریدی نے خودکشی کر لی تھی۔"

وہ خاموش ہوا تو عنوہ کو لگا، اس کے دل کی دھڑکنیں بھی رکنے لگی ہیں۔

"بولو زیان! ورنہ میرا دل رک جائے گا۔" وہ چلا کر بولی تھی۔

زیان نے اس کی بڑبڑاہٹ نما التجا کو نہیں سنا تھا۔ اب وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم اٹھائے خود پر اسپرے کر رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ بیڈ پر آ بیٹھا۔

"اب تو سمیل نہیں آ رہی؟" وہ بہت معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ عنوہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"تمہیں اپنی ممی سے بھی سمیل آتی ہوگی۔ وہ تو بہت ڈرنک کرتی ہیں۔ اسموکنگ بھی کرتی ہیں۔" اس نے کنپٹیاں دبانا شروع کیں تو عنوہ نے میکانکی انداز میں قدرے اس کے قریب کھسک کر اپنے نرم ہاتھوں سے زیان کے سر کو دبانا شروع کر دیا۔

"تمہاری ممی کے سارے گناہ معاف۔ انہوں نے تمہیں میرے حوالے کر کے مجھ پر عظیم احسان کیا ہے۔ عورت کی وفا اور محبت پر یقین سا آنے لگا ہے۔" اپنی پیشانی پر عنوہ کے ہاتھ کا مہربان لمس محسوس کر کے اسے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہونے لگا تھا۔

"دریہ اور تمہاری ممی میں ذرہ بھر فرق نہیں۔" اس کی ذہنی رو پھر سے بھٹک گئی تھی۔

عنوہ کا رواں رواں کان بن گیا تھا۔ اس نے سرگوشی نما آواز میں پوچھا۔

"دریہ کون تھی زیان؟"

"ہے ایک بھولی بسری یاد۔ عورت کے نام پر دھبہ تھی۔" اس نے حقارت سے کہا اور آنکھیں موند لیں۔

"تمہاری ممی ایک چین ڈرنکر ہے۔ شرابی عورت۔ ایسی غلیظ کردار کی عورتوں کی کون عزت کرتا ہے؟ وہ جو تمہارا باپ تھا نا، غیرت کے مارے دنیا سے پردہ پوش ہو گیا۔ عجیب بات ہے نا، دریہ تمہاری ماں جیسی اور میں تمہارے باپ جیسا۔"

عنوہ کو یوں محسوس ہوا تھا کہ زیان کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔ حالانکہ اس کی آواز میں ذرّہ برابر آنسوؤں کی آمیزش یا لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔

"میرے تمہارے بہت سے رشتے بنتے ہیں عنوہ! اسی لئے میں نے سوچا، تمہیں امبرین جیسی عورت کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے۔ اس نے تو یزدانی کے ساتھ تمہارے رشتے کی بات کر لی تھی۔ مجھے بروقت خبر پہنچی تو میں نے امبرین کو باتوں میں اُلجھا کر شیشے میں اتار لیا۔ مجھے بہت سالوں بعد پتہ چلا تھا کہ میرے تمہارے ساتھ دہرے تعلق ہیں۔ امبرین بھی جانتی تھی۔ بس تم بے خبر ہو۔ کتنی معصوم ہو تم........ کتنی شفاف آنکھیں ہیں تمہاری۔ کتنے نرم ملائم ہاتھ ہیں تمہارے، گویا رُوئی کے گالے۔ مجھے تم ایک مقدس

راز کی طرح معلوم ہوتی ہو۔ میں نے تمہیں بہت چاہا ہے عنوہ! یوں لگتا ہے، مجھے صرف تم ہی سے محبت تھی۔ تم ہی سے محبت ہے۔ باقی سب سراب تھے، وہم تھے۔ تم ہی صرف حقیقت ہو۔ میری زندگی کا سب سے بڑا سچ۔" اب اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ عنوہ کے زانو پر سر رکھے گہری نیند سو رہا تھا۔

"صبح بخیر۔"

وہ عنوہ کو واش روم، سٹنگ روم، ڈائننگ ہال ہر جگہ تلاش کرنے کے بعد کچن کی طرف آیا تو وہیں کرسی پر اسے بیٹھے دیکھ کر مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ سجائے سوچوں کے سمندر میں ڈوبی بہت افسردہ سی بیٹھی تھی۔ زیان کو فریش اور مسکراتا کھلکھلاتا دیکھ کر حیران سی ہوئی۔ غیر ارادی نگاہ کلاک کی طرف اٹھی تھی۔ دن کے دو بج رہے تھے۔

"مس نینی! بریک فاسٹ ملے گا؟" وہ الماری میں چاول اور دالوں کے جار ترتیب سے رکھتی مس نینی سے مخاطب ہوا تھا۔

"یس سر! مگر اب تو لنچ بھی ریڈی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی صرف اناناس کا جوس دے دو۔"

زیان سر ہلاتا اسے مکمل نظر انداز کرتا واپس بیڈ روم میں جا چکا تھا۔

مس نینی نے پندرہ منٹ میں جوس تیار کیا اور عنوہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میم! آپ لے کر جائیں گی؟"

'مجھے کوئی شوق نہیں خدمتیں کرنے کا۔' اس نے دل میں سوچا اور بظاہر مسکرا کر کہا۔

"آپ ہی لے جائیں۔ میں ذرا لان میں جا رہی ہوں۔"

وہ لان میں کچھ دیر بے مقصد ٹہلتی رہی اور مسلسل زیان کی ان تمام باتوں کو سوچتی رہی جو اس نے مدہوشی میں کہہ دی تھیں۔

"جو کچھ زیان نے ممی کے بارے میں کہا ہے، یقیناً سچ ہوگا۔" وہ تھک کر نرم و ملائم گھاس پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

'یہ دریہ کون ہے؟' اچانک خیال آنے پر وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"شاید رانیہ کو اس کے بارے میں پتہ ہو؟ مگر وہ بھلا مجھے کیوں بتائے گی؟ یہ لڑکی بھی ایک معمہ لگتی ہے۔"

اس کی نگاہیں اوپر کو اُٹھیں۔ سفید ریلنگ کے پیچھے ایک چہرے نے جھلک دکھائی تھی۔ یقیناً رانیہ اسے دیکھ کر پھر سے گوشہ نشین ہو چکی ہوگی۔

''اس لڑکی کا سارا دن کمرے میں بند رہ کر دل نہیں گھبراتا۔'' وہ بے ساختہ رانیہ کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے رانیہ سے بے حد ہمدرد محسوس ہوتی تھی۔

وہ لاؤنج سے ہوتی ہوئی کچن کے قریب آ رکی۔

'کوئی ڈش ٹرائی کر کے دیکھتی ہوں۔ مگر بناؤں گی کیا؟ مجھے تو کچھ پکانا آتا نہیں۔' اس نے کھانا بنانے کا ارادہ ترک کیا، بیڈ روم میں جانے کا سوچا۔ مگر زیان کی موجودگی کی وجہ سے وہ تذبذب کا شکار تھی۔ پھر کچھ سوچ کر وہ اندر داخل ہو گئی۔

''آئیے جناب! آپ کا ہی انتظار ہو رہا تھا۔'' بڑے ہی خوشگوار لہجے میں کہا گیا تھا۔ عنوہ کو سخت غصہ آیا۔

''آپ کے ترکش میں جتنے بھی تیر ہیں، سب ایک ہی دفعہ اتار دیجئے، میرے ناتواں دل میں...... کیوں قسطوں میں مارنا چاہتے ہیں؟'' اس کی آنکھوں سے دھواں سا نکلنے لگا تھا۔ وہ بیڈ روم پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر پھیلاوا سمیٹنے لگی۔ زیان گھر میں موجود ہو تو پھر کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نظر نہیں آ سکتی تھی۔

زیان چونک سا گیا۔ اس کے لہجے میں چھپے طنز کو وہ با آسانی سمجھ چکا تھا۔ وہ یقیناً گزری رات کا حوالہ دے رہی تھی۔

'میں نے نہ جانے کیا کیا بکواس کی ہوگی۔ دھت تیرے کی، زیان خبیث! سنبھل جا۔ اب خیر نہیں۔ موڈ تو کافی بہتر لگتا ہے، مگر طعنے تشنے سہنے کی تیاری کر لینی چاہئے' اس نے سوچتے ہوئے سر جھٹکا اور گلا کھنکارتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ کون سے تیروں کا ذکر فرما رہی ہیں؟''

''میری ممی، رانیہ اور اپنی زندگی کے جتنے ابہام ہیں، ایک ہی دفعہ واضح کر دیں تمام حقیقتوں سے پردہ اٹھا دیں، تاکہ جو میرے اندر اضطراب اور بے چینی ہے، اسے کنارہ ملے۔'' اس نے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ایش ٹرے ڈسٹ بن میں اُلٹی ٹیبل کو اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔

''یہ کون سے بے ہودہ کام کر رہی ہو؟'' زیان نے ناگواری سے ٹوکا۔ عنوہ سے میز صاف کرتی رہی، پھر ہاتھ دھونے واش روم میں چلی گئی۔ واپس آئی تو زیان

گہری سوچوں میں گم پایا۔

''اس کلموہی، واہیات ماریہ کے آنے سے آپ کی تمام تر تھکاوٹ دور ہو گئی تھی اور میں نے اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا تو سخت نیند کا بہانہ بنا کر مجھے ٹال دیا تھا اور میرے جانے کے بعد اس لومڑی کو گھر بلوا کر شغل فرمانے لگے۔''

عنوہ نے گہرے کاٹ دار لہجے میں کہا تو زیان کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔

''میں نے اس کلموہی، واہیات ماریہ کو نہیں بلوایا تھا بلکہ وہ خود ہی آفس کی کوئی فائل لے کر آئی تھی۔ اُلٹا میرا بھیجا کھاتی رہی۔ منحوس نے ایسا دل جلایا ہے کہ ابھی تک دھواں نکل رہا ہے۔ رو رہا ہوں اس وقت کو جب اس کے ساتھ پارٹنر شپ کا فیصلہ کیا تھا۔ حسام کے سمجھانے کے باوجود۔''

''آئندہ اس گھر میں شراب، شباب کی کوئی محفل سجائی تو ہر شے کو آگ لگا دوں گی۔'' عنوہ نے وارننگ دینے والے انداز میں سختی سے کہا تو زیان نے اس کا بازو پکڑ کر قریب بٹھایا اور بولا۔

''میں لعنت بھیجتا ہوں شباب، شراب پر۔ اور تم بھی ایک دفعہ جانے دو، اب صرف اتنا بتا دو، نشے میں کچھ اُلٹا سیدھا تو نہیں بول دیا تھا میں نے؟''

''آپ میری ممی، پاپا کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟...... پلیز زیان! مجھ سے کچھ مت چھپائیے گا۔ میں رات بھر جاگتی رہی ہوں۔ آپ نے میرے پاپا کا ذکر کر کے میرے اندر کب سے کنڈلی ماری حسرتوں کو جگا دیا ہے۔ والدین کا ساتھ، ان کا شفقت بھرا سایہ کتنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک محبت بھرا ماحول اور پیرنٹس کی سچی توجہ و محبت کیا معنی رکھتی ہے، یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ ایک ٹوٹے خاندان کے بچے کی شخصیت بہت سے حصوں میں بٹی ہوتی ہے۔ اور ماں، جس کے دم سے گھر بنتا ہے، اگر اس کی زندگی کے شرمناک پہلو آپ کی زندگی کے ساتھی کو معلوم ہوں تو پل پل ایک نہ ختم ہونے والی اذیت رگوں میں اُترتی محسوس ہوتی ہے۔ آپ شاید میرے احساسات تک نہیں پہنچ سکتے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں خودکشی کر لوں۔''

اس نے ایک دم زیان کے شانے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ زیان نے بوکھلا کر اسے بہت نرمی اور محبت سے اپنی بانہوں میں سمیٹا۔

''لعنت ہو تم پر زیان خبیث! نہ جانے کیا کیا بکتے رہے ہو۔'' اس نے خود کو لعن طعن کرتے ہوئے عنوہ کے آنسو پونچھے۔

"عنوہ جان! تمہیں اتنا حساس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بھاڑ میں گئیں ممی۔ خبر
جو تم نے آنسو بہائے۔ ایسی ماؤں کو تو شوٹ کر دینا چاہئے۔ اگر تم بہت سی محرومیوں
شکار رہی ہو تو ادھر بھی معاملہ ویسا ہی تھا۔ یوں سمجھو، میں تمہاری ممی کو جانتا تک نہیں
ہمارے پیرنٹس نے ہمیں کچھ بھی نہیں دیا، مگر ہم اپنے بچوں کو بہت کچھ دیں گے۔ اب
اور کتنا انتظار کروانے کے چکر میں ہو؟ سنا دو ہمیں بھی کوئی خوشخبری۔ کان ترس گئے
مگر کسی اچھی خبر کے دور دور تک آثار نظر نہیں آ رہے۔" اس کا انداز بڑا ہی بھرپور گدگدا
والا تھا۔ عنوہ کو ڈھیروں شرم نے آن گھیرا۔ کسی ننھے منے بچے کی قلقاریاں، اُس
معصوم سی مسکان، دودھ میں بھیگے گلابی ہونٹ۔ خوابوں کا اک جہان اس کی آنکھوں میں آبسا تھا۔

❁

ایک ہفتے بعد شگفتہ بیگم کے نہ چاہنے کے باوجود زرین نے زروہ کا ہاتھ کھیر
ڈلوا کر گویا رسم پوری کی اور نیا ارشاد بھی ساتھ ہی جاری کر دیا۔

"اپنی گھر گرہستی خود سنبھالو، بنو! امی سے اب چولہا چوکی نہیں سنبھالا جاتا۔ اور
والیوں کے ہاتھ کا پکا نہ تو امی کو پسند ہے نہ رمیز کو۔"

"جی اچھا آپا......!" اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔ وہ خود بھی فارغ بیٹھنا نہیں کرتی تھی۔ پورے گھر کا جائزہ تو وہ پہلے بھی لے چکی تھی۔ تین منزلوں پر مشتمل کوٹھی جدید اور قدیم کا اچھا خاصا نمونہ تھی۔ باقی گھر کی تو قدرے بہتر حالت تھی۔ صفائی، دھلائی وغیرہ کر دیتی تھی، البتہ کچن میں آ کر اس کا دماغ اچھا خاصا گھوم گیا اس قدر گندگی اور بے ترتیبی۔ ان کا گھر اگرچہ بہت چھوٹا اور معمولی سا تھا، مگر ستھرائی کی وجہ سے سب میں ممتاز نظر آتا تھا۔ اپنے اردگرد کے تمام مکانوں میں زروہ اپنا صاف ستھرا مکان ماں کی سلیقہ مندی کا منہ بولتا ثبوت لگتا تھا۔ یہی نفاست فاخرہ سب بچیوں کو گھٹی میں گویا پلا دی تھی۔ صفائی نصف ایمان ہے۔ اس بات پر ان پورا یقین تھا۔ زروہ کے چہرے پر ایسے تاثرات اُبھرے تھے کہ شگفتہ بیگم قدرے شر سی ہو گئیں۔

"بیٹی! اصل میں زرین کا اکثر بی پی ہائی رہتا ہے اور میں بھی گھٹنوں کے باعث بالکل ناکارہ ہو گئی ہوں۔ اور رہ گئی ثمن تو آج کل کی بچیوں کا تو کچن کے سے ہی جی گھبرانے لگتا ہے......اسی لئے۔"

"امی! پلیز، آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ میں نے کچھ کہا تو نہیں۔ ابھی دیکھئے گا، میں کیسے ہر شے چمکا دوں گی۔" زروہ ان کے شرمندہ انداز پر خود بھی شرمندہ ہو گئی تھی۔ پھر جو اس نے کمر کسی تو شگفتہ بیگم کے منع کرنے کے باوجود کچن کی حالت بدل کر رکھ دی۔ مگر اس کی اپنی حالت پہچاننی مشکل ہو رہی تھی۔

آج ڈنر پر خوب اہتمام کیا تھا اس نے۔ مونگرے گوشت، کچے قیمے کے کباب، چائنیز پلاؤ، میتھی اور پالک کی بھجیا اور میٹھے میں کھوئے کی پڈنگ۔ وصی اور ثمن کی تو گویا عید ہو گئی تھی۔ رمیز نے بھی ستائشی نظروں سے میز کی طرف دیکھا اور زروہ کے مکھڑاپے کو دل ہی دل میں سراہا۔

"مامی! جیو ہزاروں برس۔" وصی نے نعرہ لگایا تھا۔

"ہائے، بددعا تو نہ دو۔" زروہ نے مصنوعی خفگی سے کہا تو ثمن قل قل ہنسنے لگی تھی۔

"مونگرے گوشت، خالہ کے بہت فیورٹ ہیں۔ کیا خیال ہے، انہیں لے نہ آؤں؟" امی نے نانو کی طرف دیکھ کر کہا تو انہوں نے بخوشی اجازت دی اور بولیں۔

"شکر ہے، میرے بچے کو بھی نیکی کا خیال آیا۔"

کچھ دیر بعد خالہ بھی آ گئی تھیں اور ڈنر بہت ہی خوشگوار ماحول میں کیا گیا۔

"رمیز! شکرانے کے نفل پڑھو۔ کیسی نیک صورت، نیک سیرت بیوی ملی ہے۔ عورت گھر بنانے والی ہو تو مرد کے بھاگ جاگ اُٹھتے ہیں۔" خالہ نے نہال ہو کر زروہ کا ماتھا چوما۔

"ایسی نیک صورت، نیک سیرت خاتون میرے لئے بھی ڈھونڈ لیں۔ ابھی سے ہی کوشش کریں گی، تب ہی گوہر مطلوبہ ملے گا نا۔" وصی کی زبان پر کھجلی ہونے لگی تھی۔ خالہ نے اسے محبت بھری دھپ لگائی۔

"تُو فکر نہ کر۔ میری نظر میں ہے ایک لڑکی۔"

"ہائے خالہ! کون ہے وہ؟ بتائیے نا۔" ثمن اور وصی تو پیچھے ہی پڑ گئے تھے۔ زرین ب سے دیکھ رہی تھی مگر خاموش صرف خالہ کی وجہ سے تھی، جن کے سامنے بول کر بے عزتی کروانے کا کوئی شوق نہیں تھا اسے۔ ویسے بھی خالہ کے سامنے کس کی چلتی تھی۔

اگلے دن رمیز آفس جانے لگا تو زروہ نے میکے جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"آج جانا ضروری ہے؟......کل چلی جانا۔"

"میں امی سے بھی اجازت لے چکی ہوں۔" زروہ نے ٹھنک کر کہا۔

"اوکے، ریڈی ہو جاؤ......... تمہیں آفس جاتے ہوئے چھوڑ جاؤں گا اور واپسی پر تیار رہنا۔ ماش کی دال کی طرح اینٹھنے کی ضرورت نہیں۔" رمیز نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا تو زروہ نے خوشی کے عالم میں چادر اوڑھی، پرس پکڑا، سینڈل پہن کر بالکل تیار ہو کر آئینے میں خود کو دیکھا اور رمیز کے پیچھے باہر نکل آئی۔

"اوہو رمیز! مجھے یاد نہیں رہا آپ کو بتانا کہ عنوہ کا فون آیا تھا۔ وہ ہمیں ڈنر پر انوائٹ کر رہی تھی۔" گاڑی میں رمیز کے برابر بیٹھ کر زروہ نے اچانک خیال آنے پر اسے بتایا تھا۔

"ہوں......... چلیں گے کسی دن۔" رمیز نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"عنوہ آپ کی فرینڈ ہے؟"

"مری میں ہم ساتھ تھے۔ اس وقت میں اے لیول کر رہا تھا، جبکہ وہ تو ففتھ اسٹینڈرڈ میں ہوگی شاید۔ پھر میں تو آپا کے ہزبینڈ کی ڈیتھ کے بعد ادھر آ گیا تھا۔ اس کے بعد ہمارا کوئی رابطہ نہیں رہا بیچ کے سالوں میں۔ تمہیں مزے کی بات بتاؤں، شادی سے ایک ہفتہ پہلے میری عنوہ سے اتفاقاً ملاقات ہوئی تھی اور مجھے ابھی تک حیرانی ہے کہ اس نے مجھے پہچان کیسے لیا ہے۔"

"بہت اچھی نیچر کی لڑکی ہے۔" زروہ نے اس کی نرم طبیعت کی تعریف کی۔

"بروکن فیملیز کے بچے یا تو اپنے ماحول سے متنفر ہو کر بگڑ جاتے ہیں یا سنور جاتے ہیں۔ عنوہ دوسری طرح کے لوگوں میں شمار ہوتی ہے۔" رمیز نے احتیاط سے موڑ کاٹا اور زروہ کو گاڑی سے اُتر کر گھر تک چھوڑنے آیا۔

"آپ اندر نہیں آئیں گے؟"

"نہیں، ابھی تو میں لیٹ ہو جاؤں گا۔ واپسی پر بیٹھیں گے کچھ دیر کے لئے۔ اوکے، تم اپنا خیال رکھنا اور شام کو تیار رہنا۔"

رمیز واپس چلا گیا تھا اور وہ رمیز کو اس وقت تک دیکھتی رہی تھی جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر چلا نہیں گیا تھا۔

❀

"آغا کے گھر میں نہ جانے کون لڑکی رہنے کے لئے آئی ہے۔" بیگم افراسیاب اخبار میں گم شوہر کو مخاطب کیا تھا۔

"ہوں......... مجھ سے کچھ کہا ہے آپ نے؟" خان افراسیاب نے چونک کر

کے بگڑے تاثرات والے چہرے کی طرف دیکھا۔

"نہیں، دیواروں سے باتیں کر رہی ہوں۔" پلوشہ بیگم جل کر بولی تھیں۔

"آغا کے گھر میں تو اکثر و بیشتر مہمان آتے رہتے ہیں۔ اور پھر اس کے اسکول کی ٹیچرز کا بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔ تم کس کی بات کر رہی ہو؟" انہوں نے لاپروائی سے اخبار سمیٹ کر چشمہ بھی اتار کر میز پر رکھا۔

"میں اس لڑکی درمکنون کی بات کر رہی ہوں۔" پلوشہ بیگم کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔ جوان بیٹیوں کی ماؤں کو اکثر ایسے خدشے لاحق رہتے ہیں۔ خصوصاً جب کوئی اچھا لڑکا بھی بطور داماد کے نظر آ رہا ہو۔ عیشہ کے بھی کان کھڑے ہو گئے تھے۔

"درمکنون۔" وہ زیر لب بڑبڑائے تھے۔ "ہاں۔ آغا ذکر تو کر رہا تھا اس بچی کا۔ بڑی نیک اور بھلی طبیعت کی لڑکی ہے۔"

"میں نے اس کی اچھائیوں کے قصے سننے کے لئے نہیں بات چھیڑی۔" انہوں نے بھنا کر کہا۔ "آپ ذرا ڈھکے چھپے لفظوں میں بات کریں آغا سے اپنی عیشہ کے لئے۔ عبدل مجھے بہت پسند ہے۔ ایسے ہیرے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔"

"عبدل بھائی سے؟" عیشہ ٹھٹک سی گئی تھی۔

❀

اس نے کچن میں داخل ہو کر کوکنگ رینج پر رکھے ککر اور فرائنگ پین کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر تمام لذیذ کھانوں کا جائزہ لیا اور پھر مطمئن سی ہو کر مس نینی کے ساتھ کھانا ٹیبل پر لگانے لگی تھی۔ آج حشام نے ان کے ساتھ ڈنر کرنا تھا۔ مگر فیکٹری میں اچانک کچھ مسئلہ ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے زیان نے اسے فون کر کے آنے سے منع کر دیا تھا اور اسے فیکٹری بھیج دیا تھا۔

"کیا مطلب؟......... حشام بھائی نہیں آئیں گے؟" عنوہ نے زیان کی گفتگو سے اندازہ لگایا۔

"میں نے اسے فیکٹری بھیج دیا ہے۔ چند ورکرز کا آپس میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ شاید ایک دو شدید زخمی بھی ہوئے ہیں۔" زیان نے موبائل آف کر کے چیئر گھسیٹی اور عنوہ کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"پھر تو پولیس کیس بن جائے گا۔" اس نے فکرمندی سے کہا۔

"حشام سنبھال لے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ایسے چھوٹے موٹے مسئلے ہوتے ہی

رہتے ہیں۔" اس نے چائنیز فش پلاؤ کی ڈش اپنی طرف کھسکائی۔ معمول کے مطابق اس
نے پہلے عنوہ کی پلیٹ میں چاول ڈالے۔ وہ اسی طرح وقتاً فوقتاً اس کی پلیٹ میں کچھ نہ
کچھ رکھتا رہتا تھا۔ بقول زیان کے وہ کھانے پینے کے معاملے میں حد درجہ لاپرواتھی۔
"آج حسام تم سے ایک ضروری بات کرنے کے لئے آنا چاہ رہا تھا، مگر لگتا ہے
بے چارے کی قسمت ٹھنڈی ہے۔" زیان نے پلیٹ پر جھکی عنوہ کی طرف دیکھ کر کہا تو
چونکی۔
"کون سی بات؟"
"ایکچوئلی وہ حنا کو پرپوز کرنا چاہتا ہے۔"
"ہائے......سچ؟" عنوہ کھلکھلائی۔
"بالکل سچ۔" زیان نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ یعنی عنوہ کی ایکسائٹ منٹ دیکھ
اسے بات بن جانے کا سگنل مل چکا تھا۔
"تو پھر حسام بھائی اپنے پیرنٹس کو حنا کے گھر بھیجیں گے۔ مگر اس سے پہلے میں
کی رائے لوں گی۔ ابھی کرتی ہوں اسے فون۔" وہ خوشی سے چہک رہی تھی۔
"کتنی سمجھ دار ہوگئی ہو عنوہ! تم میرے ساتھ رہ کر۔" زیان نے اسے چڑایا۔
"کیا میں پہلے احمق تھی؟"
"ہاں......کچھ کچھ۔" وہ مزے سے بولا۔
"آپ حسام بھائی سے کہیں، اپنے ممی پاپا کو حنا کے ابو کے پاس تو بھیجیں۔
معاملات تو ہوتے رہیں گے۔"
"بھئی حسام کی طرف سے تمہیں پرپوزل دینا ہوگا۔" وہ نیپکن سے ہاتھ
اٹھتے ہوئے بولا تھا۔ عنوہ بھی زیان کو اٹھتے دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔
"کھانا تو کھالو۔" زیان نے اسے باہر نکلتے ہوئے ٹوکا۔
"کھا چکی ہوں۔" اس کی بھوک تو ویسے بھی اُڑ چکی تھی۔ حنا اس کی بہت ا
فرینڈ تھی اور حسام جیسا ہینڈسم نوجوان اگر اسے پرپوز کر رہا تھا تو اس کی اکلوتی دو
ہونے کے ناتے عنوہ کا خوش ہونے کا پورا پورا حق بنتا تھا۔
"کھاتی کہاں ہو؟ سونگھتی ہو۔ اتنی کم خوراک تو چڑیا کا بچہ کھاتا ہوگا۔"
"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ مجھے اپنی ڈائٹ کا بھی خیال رکھنا ہے۔ آپ
خیال ہے، گوشت کا پہاڑ بن جاؤں اور آپ کو ایک اور شادی کرنے کا موقع

دوں۔" عنوہ اپنے بیڈ روم میں آکر دھپ سے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
"اچھا، تو اس لئے تم خود کو فٹ رکھنا چاہتی ہو۔" زیان کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔
"تو اور کیا؟" اس نے سادگی سے کہا اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔
"دراصل میں چند دن پہلے رمیز کے گھر گئی تھی، انہیں انوائٹ کرنے کے لئے۔
وہیں رمیز کی ایک خالہ جان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ رمیز کی مسز زروہ کو مشورے دے
رہی تھیں، شوہر کو مٹھی میں کرنے کے۔ میں نے بھی ان کی باتیں ذہن نشین کر لی تھیں۔"
"مثلاً کس قسم کے مشورے؟" زیان نے دلچسپی سے پوچھا۔
"یہی کہ عورت کو اپنے شوہر کے لئے ہر وقت بنی سنوری رہنا چاہئے، ورنہ باہر کی
بھوتنیاں چمٹ جاتی ہیں۔" اس کی آنکھوں کے سامنے ماریہ کا چہرہ آ گیا تھا۔
'بہت ہی بے حیا ہے ماریہ۔ مردوں کو بہکانے کے لئے فضول قسم کی ڈریسنگ کرتی
۔ اور پھر زیان جیسے شاندار بندے کے ساتھ کی خواہش بھی ہوگی یقیناً۔ اسی لئے بن
سنور کر آگے پیچھے پھرتی رہتی ہے۔ مگر میں اس چڑیل کے دام میں زیان کو پھنسنے نہیں
دوں گی۔'
وہ مسلسل سوچتے ہوئے منہ کے زاویے بھی بگاڑ رہی تھی۔ زیان نے کھنکار کر اسے
اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ ایک دم چونک سی گئی۔
"خالہ جان نے تمہیں اور کیا کیا پٹیاں پڑھائی ہیں؟" زیان کے پوچھنے پر وہ جوش
سے بتانے لگی۔
"ان کا نام قمر النساء ہے۔ سب انہیں قمری خالہ کہتے ہیں۔ اتنی پیاری اور میٹھی
ل کرتی ہیں۔ پتہ ہے زیان! انہوں نے اچانک مجھ سے پوچھا کہ میں نماز پڑھتی
ہی مجھے اتنی شرمندگی ہوئی کہ حد نہیں۔ شکر ہے اس وقت میں اور خالہ اکیلی بیٹھی
زروہ اور آنٹی نماز پڑھنے جا چکی تھیں۔ پھر جب میں نے سچ بولا اور خالہ کو بتایا
مجھے نماز نہیں آتی تو انہوں نے میرے سر پر بوسہ دیا، سچ بولنے کے انعام کے طور پر
مجھے نماز پڑھنا سکھائی۔ اپنے پاس سے دو تین اسلامی کتابیں بھی گفٹ دی ہیں۔
ان کی باتوں نے بہت لطف دیا ہے۔ اسی لئے آج میں نے پانچوں نمازیں پڑھی
آج بہت خوش اور مطمئن ہوں اور اس بات پر بہت رنجیدہ بھی کہ میں زندگی کے
ال اس لذت سے محروم رہی ہوں۔ زیان! کیا آپ کو نماز پڑھنا آتی ہے؟ مثلاً
اور سجدے میں کیا پڑھتے ہیں؟" اس نے قمری خالہ کی طرح بالکل اچانک اس پر

گھیرا تنگ کیا تھا۔ زیان جو بغور اس کی باتیں سن رہا تھا، ایک دم گڑبڑا گیا۔

"ہاں........ نہیں تو۔"

"اوہ نو........ چلیں میں آپ کو سکھا دوں گی۔ آپ ایسا کریں، پہلے وضو کر کے آئیں۔ کیا وضو کرنا آتا ہے؟ نہیں آتا ہوگا۔ پہلے وضو کرنا سکھاتی ہوں۔ ذرا بھی مشکل نہیں۔ میں نے تو دو منٹ میں سب ذہن نشین کر لیا تھا۔" وہ جوش کے عالم میں بیڈ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"اٹھیے بھی۔"

"عنوہ! کل سے پڑھیں گے نماز۔" زیان گھبرا کر بولا تھا۔

"مگر آج کیوں نہیں؟" وہ بضد ہوئی تھی۔

"ابھی باہر چلتے ہیں۔ لانگ ڈرائیو کا مزا ہمیشہ رات کو آتا ہے۔" زیان نے لالچ دینا چاہا تھا مگر وہ اس کی باتوں میں نہیں آئی تھی۔

"پہلے نماز پڑھ لیں، پھر باہر چلیں گے۔ میں آپ کو ضرور نماز سکھاؤں گی۔"

"اچھا، ابھی رہنے دو۔ کل فجر کی پڑھ لوں گا۔"

"مگر عشاء کی کیوں نہیں؟" عنوہ کو غصہ آ گیا تھا۔

"میرے خیال میں یہ والی نماز لمبی ہوتی ہے۔" زیان کے عذر نے اسے صدمہ پہنچایا تھا۔

"اور صبح والی میں آپ کی نیند ڈسٹرب ہو گی۔ مجھے پتہ ہے، آپ چار بجے اٹھیں گے۔ میں نے الارم سیٹ کر رکھا ہے۔ کل سے میں تہجد بھی پڑھا کروں گی کہہ رہی تھیں کہ دن کے دونوں کناروں اور کچھ رات کے حصوں میں عبادت چاہیے۔ آپ کو پتہ ہے زیان! نیکیاں، گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔ رات کے تیسر کی عبادت کا اپنا ہی لطف ہے۔ یوں لگتا ہے، تئیس سالوں کی بے چینیاں ختم ہو گئی۔ اللہ کا بھی حکم ہے کہ رات کے تیسرے پہر سے کچھ دیر پہلے اپنے پہلو کو خواب دور کر دینا چاہیے۔ اب اٹھ بھی چکیں۔" اس نے زبردستی زیان کو اٹھا کر واش طرف دھکیلا۔

"میں آؤں؟" عنوہ نے پوچھا۔

"جی نہیں، مجھے وضو کرنا آتا ہے۔" زیان نے پلٹ کر جواب دیا اور پھر کی طرف بڑھ گیا۔

'ہاں، عید کی نماز تو پڑھتے ہوں گے ضرور۔' عنوہ نے اندازہ لگایا اور زیان کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

"تم نے ابھی حنا کو فون بھی کرنا ہے۔" واش روم سے باہر نکل کر زیان نے عنوہ سے کہا۔ مقصد صرف اس کا دھیان بٹانے کا تھا مگر وہ تو مکمل تیاری کر کے بیٹھی تھی۔ جائے نماز بچھا کر اور تسبیح بھی رکھی تھی۔

وہ پوری دلجمعی اور خلوص نیت سے زیان کو نماز کا طریقہ بتا رہی تھی اور وہ بغیر ٹوکے خاموشی سے سمجھ رہا تھا۔

"کتنی پیاری لگ رہی ہو عنوہ! جی چاہ رہا ہے، بانہوں میں بھینچ کر تمہیں پورا گھما ڈالوں۔ مگر اس وقت میں خالص اللہ کے لئے کھڑا ہوں نماز پڑھ کے تم سے نمٹوں گا۔ اب تم آرام سے بیڈ پر جا کر لیٹ جاؤ۔ کیونکہ مجھے نماز پڑھنا آتی ہے اور میں صرف عید کی نہیں، جمعہ کی نماز بھی اکثر پڑھتا ہوں۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے نماز کی نیت کر چکا تھا جبکہ عنوہ کی آنکھیں تحیر سے پھیلتی چلی گئیں۔

جب سے ممی فرانس گئی تھیں، عنوہ ایک مرتبہ بھی گھر نہیں گئی تھی۔ آج نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ اٹھ کر عنوہ ولا میں ویرانیاں اور خالی پن دیکھنے چلی آئی تھی۔

''مکینوں کے بغیر گھر کھنڈر ہوتے ہیں۔'' اس نے آزردگی سے سوچا۔ یہ وہ گھر تھا جسے ممی نے فروخت کر دیا تھا۔ جس کا خریدار زیان عیش تھا۔ اور اس نے صرف عنوہ کی اس گھر سے جذباتی وابستگی کی وجہ سے نہ صرف اسے خریدا بلکہ عنوہ کی ملکیت میں بھی دے دیا تھا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر لان کے وسط میں کھڑی رہتی۔ زینو بابا کسی کونے سے نکل کر سامنے آگئے تھے۔

''ارے، بابا! آپ ابھی تک یہاں ہیں؟'' عنوہ نے حیرت سے پوچھا۔ اس کے خیال میں ممی تمام ملازمین کو فارغ کر گئی تھیں۔

''جی بیٹا!'' انہوں نے حلاوت سے جواب دیا اور بولے۔

''اندر چلیں نا۔ یہاں تو بہت ٹھنڈ ہے۔''

''نہیں بابا! اندر تو بہت گھٹن ہوگی۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں، صحت کیسی ہے؟ اور آپ کا پوتا تو اب ٹھیک ہے نا؟''

''صحت تو اب دن بہ دن بگڑتی جاتی ہے۔ اور بچہ بھی اب کچھ بہتر ہی ہے۔ زیان صاحب نے بڑے اچھے ہسپتال میں کمال کو داخل کروایا ہے۔ دن میں تین تین ڈاکٹر چیک کرنے کے لئے آتے ہیں۔ ورنہ سرکاری ہسپتال میں تو کوئی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جائے، کسی کو کوئی پروا نہیں ہوتی۔ سرکاری ہسپتالوں کے ڈاکٹروں کو تنخواہ سے غرض ہے۔'' زینو بابا نے رنجیدگی سے کہا۔

''زینو بابا! آپ کو تنخواہ کون دیتا ہے؟'' اچانک خیال آنے پر عنوہ نے پوچھا تو بابا محبت اور عقیدت سے بتانے لگے۔

''زیان صاحب مجھے تنخواہ دیتے ہیں۔ حالانکہ اب تو میں بالکل فارغ ہوتا

مجھے خوف تھا، بڑی بیگم کے جانے کے بعد مجھے نوکری سے فارغ نہ کر دیا جائے مگر زیان صاحب نے کسی کو گھر سے نہیں نکالا۔ بلکہ سب کو تنخواہیں دیتے ہیں۔ میری طرح چوکیدار اور مالی بھی ویلے روٹیاں توڑتے ہیں۔ اور جب میں شاہ قدوس کی حویلی بابا صاحب کے پاس جاتا ہوں تو وہ بھی بڑی امداد کرتے ہیں۔ زیان صاحب کی طرح بڑے سخی ہیں وہ۔''

''بابا صاحب کون؟'' عنوہ چونکی۔

''میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا ان بزرگ ہستی کا۔ اللہ لوک ہیں جی۔ بڑے ہی نیک اور برگزیدہ۔''

''آں، ہاں...... یاد آیا۔ آپ نے کہا تھا، مجھے بھی لے کر جائیں گے ان کے پاس۔'' عنوہ نے جوش کے عالم میں کہا تو زینو بابا خوشی سے سر ہلانے لگے۔

''آپ جب کہیں گی، میں آپ کو لے چلوں گا۔''

''زینو بابا! اب میں چلتی ہوں۔ پھر آؤں گی۔'' وہ مسکراتے ہوئے واپس گاڑی تک آئی۔ آج وہ زیان کی سوک لے کر آئی تھی۔ گھر جانے کے بجائے اس نے سوچا، حنا سے ہی مل لیا جائے۔ مگر اس سے پہلے وہ کے ایف سی چلی آئی تھی۔ حنا کے لئے برگر پیک کروا کر جوں ہی وہ پلٹی، اس کی نگاہ رمیز اور زروہ پر پڑی۔ انہوں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ عنوہ مسکراتے ہوئے ان کے قریب آئی۔

''تم ہمیں جوائن کر سکتی ہو۔'' زروہ نے پُرجوش انداز میں اس سے ہاتھ ملا کر کہا۔

''نو، تھینکس۔ ابھی میں جلدی میں ہوں۔ گھر آؤں گی۔ خالہ جان سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ اور ویسے بھی مجھے کباب میں ہڈی بننا پسند نہیں۔'' اس نے شریر لہجے میں کہتے ہوئے سر جھٹکا۔ زروہ نے بہت پسندیدہ نظروں سے اسے دیکھا سرخ ہلیالا سا ریشمی اسکارف اور بڑا سا سوٹ کے ہم رنگ دوپٹہ لپیٹے وہ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

''تم اکیلی آئی ہو؟'' رمیز نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

''کیوں، پوری بٹالین کو ساتھ لانا چاہئے تھا؟'' وہ شرارتاً مسکرائی۔

''تمہارے صاحب کیا بہت زیادہ مصروف ہوتے ہیں؟ جب بھی دیکھو، اکیلی دندناتی رہتی ہو۔ تمہیں خالہ نے نہیں بتایا کہ خواتین کو اکیلے باہر نہیں نکلنا چاہئے۔'' رمیز کے انداز میں بھی بھرپور شرارت تھی۔ اس کے ساتھ زروہ بھی مسکرانے لگی۔

"مجھے تو لگتا ہے تم اکیس توپوں کی سلامی کے بغیر نہیں آؤ گے۔" عنوہ نے بے ساختہ اس کے نہ آنے کا شکوہ کیا تو وہ فوراً معذرت کرنے لگا۔

"ابھی نئی نئی لاہور میں پوسٹنگ کروائی ہے۔ حکامِ بالا کو اچھی رپورٹ دینے کی وجہ سے مصروفیت حد سے زیادہ ہے۔ ان شاء اللہ کچھ دن تک لگائیں گے چکر۔"

"اوکے، چلتی ہوں میں۔ آپ لوگوں کا کافی ٹائم ضائع کرنے پر معذرت۔" جاتے جاتے وہ زروہ کی طرف دیکھ کر شرارتی انداز میں مسکراتی گلاس ڈور دھکیل کر پارکنگ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس بات سے بے نیاز کہ دو گہری سیاہ آنکھوں نے اس کا گاڑی تک پیچھا کیا تھا۔

حنا کے ابو فارن سروس میں تھے۔ آج کل ریٹائرڈ لائف انجوائے کر رہے تھے۔ اور جب سے ان کی بہن نے منگنی توڑنے کا اعلان کیا تھا، اس دن سے ہی وہ بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ اور اب عنوہ اس کے لئے ایک بہترین پرپوزل لے کر آئی تو انہیں گویا زندگی کی نوید مل گئی تھی۔ وہ پھر سے گویا جی اٹھے تھے۔

حنا کو خبر ہوئی تو اس نے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔

"مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔ میں ابو کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔"

"عمر کے ہجر میں جوگ لینے کا ارادہ ہے؟" عنوہ نے اسے چڑایا تو وہ تپ اٹھی۔

"بھاڑ میں جائے عمر۔ مجھے تو اس کا نام بھی بھول گیا تھا۔ خوامخواہ دل سڑانے کے لئے یاد کروادیا ہے۔"

"یہ بتاؤ، حشام بھائی تمہیں کیسے لگتے ہیں؟ صرف اچھے، برے یا بہت اچھے؟"

"نہ اچھے نہ برے اور نہ ہی بہت اچھے۔" حنا بھی اسی کے انداز میں بولی۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" اس نے بدمزا سا ہو کر کہا۔

"تم نے دیکھا تو تھا اس دن پارٹی میں حشام بھائی کو۔"

"ہر کسی کی شرافت اس کے ماتھے پر تو لکھی ہوتی ہے۔" حنا نے گویا چڑ کر جواب دیا تھا۔

"حشام بھائی بہت اچھے ہیں۔ زیان کے سب دوستوں سے مختلف ہیں۔"

"اچھے ہی ہوں گے۔ تم یہ لو۔" حنا نے ڈرائی فروٹ کی ٹرے اسے تھمائی اور خود کے لئے چائے بنانے لگی۔ اس نے وال نٹ اور ڈیٹس کے علاوہ باقی خشک میوہ جات

کچن کی سلیب پر رکھ کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔ حنا کو ہنسی آ گئی۔ جانتی تھی کہ اسے ڈرائی فروٹس کچھ زیادہ پسند نہیں ہیں۔

"مکہ سے انکل لائے تھے کھجوریں۔ بہت عمدہ باغ کی ہیں۔ بہت ہی لذیذ اور خوشبودار۔" حنا نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا تھا۔

"تم سوچ کر جواب دینا۔ قسمت بار بار مہربان نہیں ہوتی۔" اس نے سنجیدگی سے اخروٹ کھاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"میں لنچ کی تیاری کرنے لگی ہوں۔ کھانا کھا کر جانا۔" وہ سر ہلاتے بولی تو عنوہ کو یاد آیا۔

"نہیں یار! میں نے جلدی گھر پہنچنا ہے۔ رانیہ کو رات سے فیور تھا۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گی۔"

"تمہاری ہمدردیاں کہیں گلے نہ پڑ جائیں۔" حنا نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ بیمار ہے۔ تکلیف میں ہے۔ ہمدردی کی مستحق ہے۔ ایک انسان ہونے کے ناتے میں اتنی بے حسی نہیں برت سکتی۔" اس کا انداز دوٹوک تھا۔ چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ آنکھوں میں پہلے کی طرح اضطراب کے سائے ہلکورے نہیں لے رہے تھے۔

"تم میں کچھ نیاپن محسوس ہو رہا ہے۔" حنا کہے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرادی۔

"یوں سمجھ لو، زندگی کا اصل مقصد معلوم ہو گیا ہے۔" عنوہ نے چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بتایا۔

"تم نے ابو سے بات کر لی ہے؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"کون سی بات؟" عنوہ نے جان بوجھ کر بے نیازی سے کہا۔

"یہی، حشام کے پرپوزل کی۔"

"کون سا حشام؟" اس نے حنا کو چھیڑا تو وہ بری طرح جھینپ گئی۔

"بکو نہیں، سیدھی طرح بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟" وہ اب بھی باز نہیں آئی تھی۔

"تم نے، یعنی عنوہ زیان عبیث نے ابو سے بات کی ہے حشام کے پروپوزل کی۔"

نے بہت ہی تحمل سے اپنی بات دہرائی تو عنوہ ہنس ہنس کر دہری ہو گئی۔

"ہمیں گھی ٹیڑھی انگلیوں سے نکالنا آتا ہے۔" اس نے فخریہ کہا تو حنا اپنی بے

ساختگی پر شرمندہ ہوگئی۔

''انکل نے یہ خوشی حسام بھائی کے پرپوزل کو قبولیت کی سند بخش دی ہے۔'' عنوہ نے اسے مزید ستانے کا ارادہ ترک کر کے سنجیدگی سے بتایا تھا۔

''ویسے انہوں نے مجھے تمہاری رائے جاننے کے لئے بھی کہا تھا۔ اب میں انہیں جاتے ہوئے خوشخبری سنا کر جاؤں گی کہ بنو دلہنیا بننے کے لئے دل و جان سے راضی ہے۔'' اس نے شرارت سے حنا کی ناک دبائی تو وہ بری طرح شرما کر خوامخواہ بال سنوارنے لگی تھی۔

حنا اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے عنوہ کو اس زور کا چکر آیا تھا کہ وہ اگر فرنٹ ڈور پر ہاتھ نہ رکھتی تو یقیناً اس نے پورے قد سے ڈھے جانا تھا۔ ساتھ میں اس زور سے ابکائی بھی آئی کہ اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ حنا بھی گھبرا کر تقریباً بھاگتے ہوئے اس تک آئی۔

''عنوہ! تم ٹھیک ہو؟'' حنا نے بوکھلا کر اسے دونوں ہاتھوں سے تھاما۔ ''آؤ اندر چلتے ہیں۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔'' وہ بے حد گھبرا گئی۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ شاید ان ڈی جیشن یا فوڈ پوائزن کی شکایت ہے۔ رات کو میں نے کچھ الٹا سیدھا کھا لیا ہوگا۔'' عنوہ نے قدرے سنبھل کر ٹشو سے منہ صاف کیا اور گاڑی کی طرف بڑھی۔

''میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گی۔ پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ آؤ تم بیٹھو۔'' حنا نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ مجبوراً عنوہ کو دوسری طرف اس کے برابر بیٹھنا پڑا۔

''زیان بھائی کے فیملی ڈاکٹر کے پاس جاؤ گی؟''

''ہاں، ڈاکٹر خرم کے کلینک چلتے ہیں۔'' اس نے کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا تھا۔

کلینک میں کافی رش تھا۔ عنوہ نے زیان کا کارڈ اندر بھجوایا تو فوراً ہی اسے بلوا لیا گیا۔

''خیریت تو ہے بھابی! مجھے بلوا لیا ہوتا۔ آپ نے کیوں زحمت کی؟'' ڈاکٹر خرم نے شائستگی سے اس کے سلام کا جواب دے کر کہا۔ عنوہ دل ہی دل میں اس وی آئی ٹریٹ منٹ پر حیران ہوئی۔

'زیان کا حوالہ کتنا مضبوط ہے۔' اس نے بے اختیار سوچا۔

ڈاکٹر خرم نے سرسری سا چیک اپ کرنے کے بعد اپنی ساتھی ڈاکٹر مریم سے

بات کی۔ ڈاکٹر مریم نے سر ہلا کر عنوہ کو ایک دوسرے روم میں کچھ ٹیسٹ کروانے کی غرض سے بھیج دیا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب وہ رپورٹس لے کر باہر آئی تو حنا کو اپنا بے چینی سے منتظر پایا۔

''کیا ہوا ہے؟ اتنی دیر لگا دی تھی۔'' حنا نے بے تابی سے کہا۔

''ہوا تو کچھ نہیں، مگر ہو جائے گا۔'' اس کے لبوں پر بڑی ہی پیاری میٹھی سی مسکان چمک رہی تھی۔

''کیا مطلب؟'' حنا چونکی۔

''کیسے بتاؤں؟'' اس نے شرما کر کہا تو حنا گویا سارا معاملہ سمجھ گئی۔

''اب پھوٹ بھی چکو، کہ میں خالہ بننے والی ہوں۔'' حنا نے بے ساختہ اسے خود سے لپٹا کر بڑے ہی محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

❁
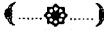
''تم کے ایف سی میں کس سے ملنے گئی تھیں؟'' اس نے ہنستے مسکراتے اور بے حد خوشی کے عالم میں گنگناتے ہوئے بیڈ روم میں قدم رکھا تو زیان کی سرد سی آواز نے اس کے پیروں کو گویا جکڑ لیا تھا۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔'' ویسا ہی پتھریلا اور سرد سا انداز۔ عنوہ کی ساری خوشی ملیامیٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی رپورٹس ٹیبل پر رکھیں اور خود قدرے نڈھال سی صوفے پر ڈھے گئی۔

''میں حنا کے لئے برگر پیک کروا کر جوں ہی پلٹی تو رمیز پر نظر پڑی۔ سو میں نے سوچا ان سے بھی علیک سلیک کر لی جائے۔ میجر رمیز وہ ہی ہے جس کے ولیمے پر میں گئی تھی۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا، اسی لئے مجھے رکنا پڑا۔ کتنا برا لگتا کہ میں یوں اجنبیوں کی طرح گزر جاتی۔ انہیں تو میں ڈنر پر انوائٹ بھی کر چکی ہوں۔ مگر آپ یوں کیوں غصے سے مجھے گھور رہے ہیں؟ آپ کی آنکھیں کیوں اس قدر ریڈ ہیں؟ کیا آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟'' وہ ایک دم روہانسی ہو کر بے ربط بولے جا رہی تھی۔

''بھاڑ میں گیا شک۔ مجھے یہ بتاؤ، رمیز کے ساتھ لڑکی کون تھی؟'' زیان کے لہجے میں بے حد سنجیدگی تھی یوں کہ عنوہ کی ریڑھ کی ہڈی سنسنانے لگی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا زیان اپنے حواس میں نہیں ہے۔

''اب بتا بھی چکو۔ ورنہ مار ڈالوں گا سب کو۔'' وہ وحشت زدہ سا بول رہا تھا۔

عنوہ ایک دم ٹھٹک گئی۔ پہلے بھی وہ ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر یوں ہی اپ سیٹ گیا تھا۔

"آخر معاملہ کیا ہے؟" اس نے حیرانی سے سوچا اور بولی۔

"وہ زروہ تھی۔ رمیز کی مسز۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ اس کی بیوی تھی؟" نہ جانے زیان کیسی تصدیق چاہ رہا تھا۔ عنوہ نے زور وشور سے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں نے ان کا ولیمہ اٹینڈ کیا ہے اور اکثر ان کے گھر جاتی رہتی ہوں۔"

"اب آئندہ تم ان لوگوں سے میل جول نہیں رکھو گی۔" زیان کی آنکھوں سے آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی تھی۔ اس کا برہم، آتش فشاں جیسا مزاج بہتر ہو رہا تھا اس کے ماتھے کی پھڑکتی رگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اب زیان کا موڈ ٹھیک ہے اور غصہ ختم ہو چکا ہے۔

"مگر کیوں؟" عنوہ کو یہ پابندی سخت زہر لگی۔

"ہر بات کی گہرائی میں نہیں جاتے۔" اب وہ اطمینان سے فریج کھولے کولا ڈرنک نکال رہا تھا۔

"آپ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔ میں نے آنکھیں بند نہیں کر رکھیں۔ آپ سے کیا کچھ چھپانا چاہتے تھے؟ ایک معمہ اوپر رہتا ہے، دو پزل یہ ہیں۔ اس دن فا اسٹار ہوٹل میں بھی نہ جانے کون تھی، جسے دیکھ کر آپ کا پارہ چڑھ گیا تھا۔" اس نے سے چیخ کر کہا۔

"بس، میں نے کہہ دیا ہے کہ تم آئندہ رمیز کی فیملی سے نہیں ملو گی۔" زیان نے ٹوک انداز میں کہا اور پیپسی کا ٹن خالی کر کے دیوار سے دے مارا۔ اسے عنوہ کا انداز زہر لگ رہا تھا۔

"رانیہ سے نہ ملوں، زروہ سے بھی نہ ملوں۔ کچھ پوچھوں بھی نہ، کچھ جاننے کوشش بھی نہ کروں تو پھر میں کروں کیا؟" اس نے غصے سے بھنا کر کہا۔

"کرنے کے اور بھی بہتیرے کام ہیں۔ کھوجی بننے کی ضرورت نہیں۔ کلب کر لو۔ کسی این جی او کی ممبر شپ لے دیتا ہوں۔ ویسے بھی تمہیں ہمدردیوں کا بخار رہتا ہے۔ سب سے اچھا کام تو گھر سنوارنے کا ہے، بچے پیدا کرنے کا ہے۔ اگر بارے میں سوچو۔ کوئی پلاننگ کرو۔ چھوٹا سا ننھا منا سا بے بی اب آ جانا چاہئے۔

بچے بہت اچھے لگتے ہیں عنوہ! مگر زندہ بچے، جیتے جاگتے، ہنستے مسکراتے۔ اگر اولاد مر جائے تو بہت دکھ ہوتا ہے نا۔"

زیان کو یوں محسوس ہوا تھا، بالکل اس کے قریب چھوٹا سا گلابی بچہ بہت شدت سے رویا تھا اور آخری ہچکی لے کر دم توڑ گیا۔ اس کا دل گویا چکی کے پاٹوں میں کسی نے مسل ڈالا تھا۔ ایک دم اسے نہ جانے کیا ہوا تھا۔ وہ ٹیبل کو ٹھوکر مارتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکلتا چلا گیا تھا جبکہ عنوہ ششدر سی ریورلس پکڑے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

بے مقصد لاہور کی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ مینٹلی اپ سیٹ تھا۔ اب اس ڈولتی ناؤ کو کنارے لگ جانا چاہئے۔ اپنی زندگی کی الجھنوں اور ابہام کو وہ خود بھی ختم کرنا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے لائر حسن سے رابطہ کیا۔ وہ اس کا دوست بھی تھا۔ حسن نے موبائل پر اسے بتایا کہ وہ فارغ ہے۔ اسی لئے اس نے گاڑی کا رخ حسن کے چیمبر کی طرف موڑ لیا تھا۔ حسن اسے دیکھ کر اپنی سیٹ سے اٹھا اور بہت تپاک سے ملا۔

"کہاں غائب تھے؟ اتنے دنوں بعد شکل دکھائی ہے۔"

"وہی مصروفیت کا ازلی رونا........ ابھی تو حشام کا ساتھ ہے، تبھی کچھ فرصت کے لمحات میسر آ جاتے ہیں۔" زیان پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

"اوپر سے بیویاں بھی دو دو۔" حسن نے ٹکڑا لگایا تو زیان بھی سنبھل کر سیدھا ہو گیا تھا۔

"اسی سلسلے میں آیا ہوں۔" اس نے تمہید باندھی۔

"کھل کر بتاؤ۔ میں سمجھا نہیں؟" اس نے الجھن بھری نظروں سے زیان کی طرف دیکھا۔

"پیپرز تیار کروانے ہیں۔" زیان نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیسے پیپرز؟" حسن چونک سا گیا۔

"ڈائیورس کے پیپرز تیار کر دو۔"

"مگر کیوں؟..... کسے طلاق دینا چاہتے ہو؟" حسن نے الجھ کر کہا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔ ایسے فیصلے جذباتیت میں نہیں کئے جاتے۔"

"میں بہت سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ نو سال کم نہیں ہوتے۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تم پیپرز ریڈی کر دو، میں سائن کر دوں گا۔"

"مگر........" حسن نے کچھ کہنا چاہا۔

"نو، اگر مگر........ جو کہا ہے، اتنا ہی کرو۔ مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

"پھر بھی ایک مرتبہ اور سوچ لو۔ اتنا بڑا فیصلہ لمحوں میں نہیں کرتے۔"

"تمہیں کیا پتہ کہ یہ فیصلہ لمحوں پر نہیں، سالوں پر مشتمل ہے۔ بہت خود کو جلایا ہے۔ انتقام کی آگ نے بہت بے اطمینان رکھا ہے۔ اب مجھے بھی سکون چاہئے۔ اور یہ اسی صورت ممکن ہے کہ میں رانیہ کو طلاق دے دوں۔ نہ وہ مجھے نظر آئے گی، نہ ہی اس سے وابستہ یادیں لہولہان کریں گی۔ اور پھر یہ اس پر ظلم ہرگز نہیں۔ اس بے چاری کو بھی اس نام نہاد بندھن کے بوجھ سے آزادی مل جائے گی۔ ہم سب نے اپنے اپنے حصے کی سزا بھگت لی ہے۔ ویسے بھی اب بجھی راکھ کو کریدنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم طلاق کے پیپر تیار کر کے بھجوا دینا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا تو حسن چیخ اٹھا۔

"نہ چائے، نہ ٹھنڈا۔ ہمیشہ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہو۔"

"پھر کبھی سہی۔ ابھی جا کر میں نے ایک خاتون کی منتیں کرنی ہیں، جو میرے شدید ردِعمل پر اُلجھی اور روٹھی ہوئی انتظار کر رہی ہوگی۔" وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ حسن بھی بریف کیس اٹھا کر ہنستا ہوا اس کے ساتھ باہر نکلا۔

"ڈراپ کر دوں؟" زیان نے آفر کی۔

"نہیں، میرا ڈرائیور آ گیا ہوگا۔ مجھے ڈراپ کرنے کے چکر میں تم مزید لیٹ ہو جاؤ گے۔ اور ابھی تو تم نے منتیں کرنے کا پیپر ورک بھی کرنا ہوگا۔ الفاظ بھی ترتیب دینے ہوں گے۔ ڈائیلاگز سوچنے میں وقت لگے گا۔ میں حیران ہوں کہ زیان عبیث بھی اب کسی کی منتیں کرنے کے لئے کانشس ہو سکتا ہے۔ یہ دن بھی دیکھنے تھے میں نے۔ اچھے بھلوں کے کس بل نکل گئے، پھر ہم جیسے مسکین شوہروں کی بات ہی کیا ہے۔ ہماری بیگم بھی ماتھے پر بل ڈالے انتظار فرما رہی ہوں گی۔ مجھے بھی گھر جا کر صفائیاں پیش کرنی ہوں گی کہ میں کسی حسین کے ساتھ نہیں بلکہ تمہارے ساتھ تھا۔ پھر نصف بہتر صاحبہ نے تمہیں فون کھڑکا کر تصدیق کرنے کے بعد مجھ غریب، مسکین کو کھانا پیش کرنا ہے۔ ہائے، ہم جیسے مظلوم شوہر۔"

جب تک حسن کی گاڑی نہیں آ گئی تھی، وہ اسی طرح دہائیاں دیتا رہا تھا۔ زیان مسکراتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ گھر آیا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ عنوہ بیڈ پر کمبل تانے سو رہی تھی یا پھر

سونے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

"عنوہ جان!" زیان نے بڑے دلار سے پکارا۔

'اونہہ، عنوہ جان کی جان ہی جلاتے رہیے گا۔' عنوہ نے جل کر سوچا اور آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

"سونے کا ڈرامہ کس خوشی میں کر رہی ہو؟ جگا تو میں نے تمہیں لینا ہے، چاہے زبردستی ہی سہی۔" زیان نے اٹھ کر کمبل اس کے منہ پر سے کھینچا تو وہ کسمسانے لگی۔

"اُٹھ بھی چکو۔" اس نے نرمی سے عنوہ کے گال تھپتھپائے تو اسے مزید سونے کا ناٹک کرنا مشکل لگا۔

'جب تک میں نے آنکھیں نہ کھولیں، یہ اسی طرح مجھے ستاتے رہیں گے۔ جانتے بھی ہیں میں جاگ رہی ہوں اور ناراض بھی ہوں، مگر........'

"یہ ٹھنڈا پانی تمہارے اوپر گرنے ہی والا ہے۔" زیان کی دھمکی نے عنوہ کو سچ مچ لڑبڑا دیا تھا۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں اور بغور زیان کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور وہ قریب کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ہو گئی نیند پوری؟" بڑی ہمدردی سے پوچھا گیا تھا۔ عنوہ کو بلا کا غصہ آیا مگر ضبط کر گئی۔

"کہاں کی خاک چھان کر آئے ہیں؟"

"دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں آوارہ گردی کر کے آیا ہوں۔" زیان کے انداز اکثر عنوہ کو شرمندہ کر دیتے تھے۔

"یہی سمجھ لیں۔" اسے بھی مبہم گفتگو کرنا آ گئی تھی۔

"میں حسن کی طرف گیا تھا۔" زیان صوفے پر بیٹھ کر شوز اتارتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟"

"ایک تو تم سوال بہت کرتی ہو۔" زیان نے ٹائی کا گولا بنا کر عنوہ کی طرف اچھالا پھر اچانک یاد آنے پر سیدھا ہوا۔

"تم نے حنا کے فادر سے بات کی تھی؟"

"ہاں، مگر حسام بھائی کے پیرنٹس........"

"اُف........ کہاں سے وہ پیرنٹس امپورٹ کرے؟........ بھئی اگر اس کے والدین تے تو میں تم جیسی احمق کو کیوں کہتا؟ ڈائریکٹ رشتہ نہ بھجوا دیتے؟" زیان نے خفگی

سے کہا تو وہ تپ اٹھی۔

''مجھے کیا خبر کہ ان کے پرنٹس حیات نہیں ہیں۔ اور مجھے احمق کہنے کی ضرور نہیں۔ میں خود کو بہت عقل مند سمجھتی ہوں۔'' عنوہ نے فخر سے کہا۔

''اے عقل مند، دانش مند خاتون! آپ گئی تھیں حنا کے گھر؟........ بات کی نے اس کے والد محترم سے؟ کیا کہتے ہیں حسّام کے ہونے والے سسر صاحب کہ حنا کو اپنی فرزندی میں لینے کی خواہش ہے کہ نہیں؟''

''میں نے انکل سے بھی بات کر لی تھی اور حنا سے بھی۔ پھر جب میں گھر آنے لگی تو مجھے زور کا چکر آیا اور پھر وومٹنگ شروع ہو گئی۔ میں نے سمجھا مجھے فوڈ پوائزن ہو گیا ہے۔ مگر حنا زبردستی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اور پتہ ہے ڈاکٹر نے کیا کہا؟''

مزید بتاتے ہوئے ڈھیروں شرم نے آن گھیرا تھا۔ اس نے تمام تر خفگی بھلائے رپورٹس زیان کی طرف بڑھا دی تھیں اور وہ ایسے دیکھ رہا تھا، گویا بہت ہی غیر متوقع حیرت انگیز اور انوکھا واقعہ رونما ہوا ہے۔ جب بات سمجھ میں آئی تو اس نے عنوہ کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جگر جگر روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ ایک عجیب کیفیت کے زیر اثر اس کی طرف بڑھا تھا۔

ادھر سے گزرتے بابا صاحب کی نگاہ درمکنون کے چہرے پر پڑی تو وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ ان کے گہرے سانولے ملیح چہرے پر تحیر تھا۔ وہ اس کے چہرے پر کچھ کھوج رہے تھے۔ کچھ ایسا جو برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ جسے حاصل کرنے کے لئے دل کا خالص ہونا ضروری ہے۔ جس کے لئے طویل صبر آزما انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جو کسی معمولی انسان کو عطا نہیں کیا جاتا۔ جسے اللہ اپنے پیارے بندوں کے دلوں میں ڈال کر ان کے رخ اپنی طرف موڑ لیتا ہے۔

یہ عشق کا راز تھا۔ یہ معرفت کے جام تھے۔ یہ چھپا ہوا بھید تھا، جو درمکنون نے پالیا تھا۔ اس نے ہجر سے وصال تک، وجود سے ذات تک، محبّ سے محبوب تک، ذلت سے عزت تک، زوال سے عروج تک کا سفر طے کر لیا تھا۔ اس پر بخشش و کرم اور رحمتِ بے کراں کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے حقیقی تصوف، شریعت کی پابندی، احکامِ الٰہی کی پیروی سے حاصل کر لیا تھا۔ اپنے نفس کو دنیاوی لذتوں سے پاک کر کے اس نے وہ چیز حاصل کر لی تھی، جسے عام انسانی آنکھ دیکھ نہیں سکتی تھی۔

نم آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں سے اب وہ عبدالباری سے کہہ رہے تھے۔

''باری بچے! درمکنون دنیاوی اور نفسانی محبتوں سے بہت آگے تک نکل چکی ہے۔ اب اسے کسی چاہت، الفت اور محبت کی چاہ نہیں کہ اس نے حقیقی عشق کا لطف پا لیا ہے۔''

درمیانہ سا قد........ سانولا رنگ، معمولی نقوش اور سادہ لباس والے بابا صاحب کا دل نہیں، ایک سمندر تھا........ محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر جس میں محبت و نفرت کے، حزن و ملال کے ذرّات بھی جمع تھے۔ بابا صاحب، جن کے عشق میں اس بستی کا ہر فرد مبتلا تھا۔ لوگ عقیدت کی حد تک انہیں چاہتے تھے۔ کچھ لوگ محبت کے لئے ان کے

پاس آتے تھے، کچھ لوگ ضرورت کے لئے جنہوں نے دنیا کو اپنے دل سے نکال
تھا۔ وہ مخلوق کی غم خواری کرتے رہے تھے، یاں تک کہ ان کے دل سے تمام رنج او
ایسے دھل گئے گویا کبھی تھے ہی نہیں۔ انہوں نے اہلِ زمین پر رحم کیا تو آسمان وا
نے ان کے لئے رحمت کے دراز ے کھول دیئے تھے۔ اس دل میں اب کوئی حسرت
نہیں تھی۔ بس ایک تمنا کے علاوہ ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ یہ تمنا ان کی زیست
حاصل تھی۔ کبھی کبھی رات کے کسی پہر وہ خوف زدہ ہو کر اٹھ بیٹھتے تھے اور پھر پوری
رات ان کی روتے اور گڑگڑاتے گزر جاتی۔ انہوں نے اپنے دل کے ٹکڑے کو
موجوں کے حوالے کر دیا تھا۔

"یا اللہ! اس کی حفاظت فرمانا۔ یا اللہ! اسے محفوظ رکھنا۔" وہ سجدے میں سر رکھے
پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

❀

"مامی جی......!"

وصی کچن کے دروازے میں کھڑا بڑی معصومیت سے، دھیمی آواز میں پکار رہا تھا
آٹا گوندھتی زروہ نے ذرا سا رخ پھیر کر وصی کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

"کیا بات ہے وصی؟"

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" وہ جھجک کر تھوڑا سا آگے ہوا۔

"ہاں بھئی، بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟" زروہ نے مصروف سے انداز میں آٹا
میں رکھا اور برنر آن کیا۔

"آپ ناراض تو نہیں ہوں گی؟"

"یہ تو بات کی نوعیت کے بعد فیصلہ کیا جائے گا، آیا ناراض ہونا چاہیے یا نہیں۔"
زروہ نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا تو وہ قدرے گھبرا گیا۔

"نہیں، پھر رہنے دیں۔"

"ارے، اب تو ضرور بتانا پڑے گا۔" زروہ نے اصرار کیا تو وصی کچھ دیر
ہوئے بولا۔

"میں آپ کی خفگی افورڈ نہیں کر سکتا۔"

"یعنی معاملہ گمبھیر ہے۔" زروہ نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

"خیر اتنا بھی نہیں ہے۔ اگر سمجھا جائے تو۔" وصی کے فلسفیانہ انداز پر زروہ

پلٹی۔

"پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟ اب بتا بھی چکو۔"

"میں نے آپ کو بتانا تھا کہ کوئل آج کل لان میں بہت کوکتی ہے۔"

"وصی کے بچے......!" زروہ نے کفگیر پکڑ کر لہرایا تو وہ ہنسنے لگا اور بولا۔

"اگر آپ کا تعاون حاصل رہا تو ان شاء اللہ بچے بھی جلد ہوں گے۔"

"بس فضول بولتے رہنا۔ کام کی بات نہ کرنا۔" وہ سر جھٹک کر چھلکے بنانے لگی تھی۔

"کام کی بات کی طرف ہی دھیرے دھیرے بڑھ رہا ہوں۔" وصی کا انداز ہنوز
وہی تھا۔ یعنی غیر سنجیدہ۔

"اگر آپ نے میکے جانا ہو تو میں ڈرائیوری کے لئے حاضر ہوں۔"

"کیا یہی کہنے کے لئے خوف زدہ تھے اور......" زروہ کی بے تحاشا ہنسی نے بات
مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

"نہیں، کچھ اور بھی کہنا ہے۔" وصی نے خفگی سے کہا۔

"ہاں اور بھی اونگیاں بونگیاں مار لو۔" وہ ہنسی دباتے ہوئے بولی۔

"آپ سارا دن اکیلی کام میں لگی رہتی ہیں۔ مجھے آپ پر بہت ترس آتا ہے۔"

"تو میں اپنی خوشی سے کام کرتی ہوں۔ مجھے کوئی مجبور نہیں کرتا۔" زروہ نے سنجیدگی
سے کہا۔

"آپ میری بات سمجھ کیوں نہیں رہیں؟" وصی جھنجلایا۔

"تو سمجھا دو نا۔" اس نے مسکراہٹ دبائی۔

"کسی کو ہیلپ کے لئے لے آئیں۔"

"اپنے بونگے مشورے پاس ہی رکھو۔" زروہ نے خفگی سے کہا۔ "کام والی تو آتی
ہے۔ اور کسے لے آؤں؟ اور کہاں سے لاؤں؟"

"اپنے گھر سے۔" وصی نے بے ساختہ کہہ کر زبان دانتوں تلے دبا لی تھی۔ زروہ
ایک دم پلٹ کر وصی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

"سوری مامی! اگر آپ کو برا لگا ہے تو مجھے معاف کر دیں۔"

"تم نے ایسا کیوں کہا؟ اپنی امی کو جانتے ہو نا۔ پتہ نہیں مجھے کیسے برداشت کرتی
ہیں۔ انہوں نے طوفان اٹھا دینا ہے۔" زروہ حد درجہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

"وہ میرا ہیڈک ہے۔ ماما میرے ساتھ ہیں۔ صرف آپ کی رضامندی چاہیے۔"

وہ بہت سنجیدہ اور مضبوط لہجے میں کہہ رہا تھا۔ زروہ چونکی۔

''کیا رمیز بھی جانتے ہیں؟ تم نے بات کی ہوگی رمیز سے۔''

''مامی! آپ امی کی فکر نہ کریں۔ وہ زبان کی کرخت ہیں مگر میری خوشی سے بڑھ کر انہیں کچھ بھی عزیز نہیں۔'' وصی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تو زروہ نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی۔

''تمہاری خوشی کیا ہے؟''

''سنیہ۔'' زروہ کے پکارنے کے باوجود وہ دھیرے سے بڑبڑایا اور پھر بھاگ گیا تھا۔

زروہ نے باقی کا کام بہت ذہنی کشمکش کے عالم میں نمٹایا تھا۔ رات کو رمیز کافی لیٹ آیا تو زروہ کو جاگتے پا کر قدرے حیران ہوا۔

''ابھی تک جاگ رہی ہو؟''

''ہوں........ آپ کا انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''مگر میں نے تو تمہیں فون کر دیا تھا کہ آج میں دیر سے آؤں گا۔ تم سو جاتیں۔''

رمیز نے نرمی سے کہتے ہوئے بریف کیس میز پر رکھا اور خود ڈریسنگ روم میں چلا گیا کچھ دیر بعد وہ یونیفارم چینج کر کے نائٹ سوٹ پہنے باہر آیا تو زروہ کو گہری سوچوں میں گم دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''کوئی مسئلہ ہے؟........ کہیں آپا نے تو کچھ نہیں کہہ دیا؟'' رمیز آپا کے تیز مزاج سے واقف تھا، اسی لئے قدرے فکرمند سا ہو گیا۔

''زروہ! کیا بات ہے؟ یہ مراقبہ کس خوشی میں؟'' وہ اس کے برابر لیٹتے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف موڑ کر نرمی سے بولا۔

''آپ سے وصی نے سنیہ کے متعلق کوئی بات کی ہے؟'' زروہ نے بغیر تمہید بات شروع کی تو رمیز نے اک اطمینان بھری سانس خارج کی۔

''ہوں........ وہ سنیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''مگر ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے اور سنیہ بھی۔ اور پھر سب سے مشکل ترین مرحلہ آپا ہیں۔ ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔ وصی سے کہیں، سنیہ کے خیال کو دل سے نکال دے۔'' زروہ نے جھرجھری لے کر کہا۔

''وہ سنیہ کو پسند کرتا ہے۔ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور ابھی صرف منگنی کریں گے اور زرین آپا کو سمجھانا میرا کام ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ میں ہوں نا۔'' رمیز تو گویا

معاملہ طے کئے صرف اسے انفارم کر رہا تھا۔

''آپا کے طنز کون برداشت کرے گا؟'' زروہ نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''ارے کچھ نہیں کہیں گی آپا۔ وصی ان کا بیٹا ہے، اس کے لئے آپا کے دل میں بہت گنجائش ہے۔ اور اس کی بیوی کے لئے بھی ضرور ہوگی۔'' رمیز نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ وصی، آپا کا اکلوتا بیٹا ہے۔ ان کی امیدوں کا واحد مرکز۔ وہ اس کے لئے کوئی اپر کلاس سے لڑکی لائیں گی۔'' زروہ نے اپنے خدشات کو زبان دی تو رمیز نے ناراضی سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم کیوں اسٹیٹس کانشس ہو رہی ہو؟''

''آپا کی بات کر رہی ہوں۔'' زروہ جھنجلائی۔

''ابھی تو فی الحال اپنی کوئی بات کرو۔ آپا سے بھی نمٹ لوں گا۔'' رمیز نے ٹیبل لیمپ آف کر کے زروہ کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ وہ جھینپ کر تکیے میں منہ چھپا گئی۔

پرل کانٹی نینٹل کے تھرڈ فلور سے بذریعہ لفٹ وہ سیکنڈ فلور تک آیا۔ اسے (جاپان) سے آئے مسٹر وانگ اور ین سین سے ملنا تھا۔ یہ اس کی پہلی جاپانی وفد ملاقات تھی۔ حشام ہی انہیں ایئرپورٹ سے لے کر آیا تھا۔

جاپانی ڈیلی گیشن نے پہلا سیمینار کراچی میں اٹینڈ کیا تھا۔ زیان اور حشام نے شرکت کی تھی مگر بطور خاص زیان ان سے مل نہیں سکا تھا۔ وہ ''ون سیون'' نمبر جوں ہی کوریڈور سے ہوتا ہوا ترتیب سے نمبرز دیکھتا ون سیون کے بند دروازے نمبر پڑھ کر غیر ارادی مڑا تو ایک روئی روئی نسوانی آواز سن کر چونک کر ادھر اُدھر د لگا۔ کوریڈور کے آخری سرے پر ایک وحشت زدہ لڑکی تقریباً بھاگتے ہوئے اس قریب سے گزرنے کے چکر میں بری طرح ٹکرا گئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک نوجوان لپکتا ہوا آن پہنچا تھا۔ وہ لڑکی اس قدر خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی تھی کہ اس سنسا سوئے ہوئے محل میں ایک انسانی وجود کو دیکھ کر اور غیبی امداد سمجھ کر خوف کے مارے کے پورے وجود کے پیچھے چھپ کر بھنچی آواز میں چلائی۔

''مجھے اس بھیڑیے سے بچالو...... اللہ کے واسطے مجھے بچالو۔''

زیان کو چند لمحے ہی لگے ہوں گے پوری صورتِ حال کو سمجھنے میں۔ دوسرے ہی وہ سامنے موجود نوجوان سے الجھ پڑا تھا۔

''کیا ہو رہا تھا یہاں؟'' زیان نے سرد آواز میں پوچھا۔

''یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ درمیان میں مت آئیں۔'' اس نے اپنے چمکتا پسینہ پونچھ کر کہا۔

''ہمارا کوئی ذاتی معاملہ نہیں...... یہ جھوٹا، بے غیرت مجھے دھوکے سے لایا زیان نے اپنے پیچھے کھڑی لڑکی کے چلانے کی آواز سن کر مڑ کر دیکھا تو

گویا پرل کانٹی نینٹل کی پوری عمارت اس کے وجود پر ڈھے گئی ہے۔

''سارہ......'' اس کے ساکت لبوں سے اک شعلہ نما آواز نکلی تھی۔ دوسرے ہی پل نہ جانے کتنے ہی بھرپور تھپڑ اس کے رخساروں پر زیان نے مارے تھے۔ اس کی آنکھوں سے گویا خون چھلک رہا تھا اور منہ سے گالیوں کا ایک طوفان اُمڈ آیا تھا۔ نبیل صورتِ حال کو بگڑتے دیکھ کر جان بچانے کی غرض سے بولا۔

''یہ میری بیوی ہے۔''

''جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے مجھے دھوکے سے یہاں بلوایا تھا اور......'' سارہ کے باقی الفاظ منہ میں ہی دبے رہ گئے تھے۔ زیان اسے چھوڑ کر نبیل کی طرف پھنکارتا ہوا بڑھا تھا۔ لاتوں اور گھونسوں سے نبیل کو مار مار کر لہولہان کر دیا تھا۔ نبیل کو بالوں سے پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے دو تین مرتبہ اس کا سر دیوار پر مار کر وہ زخمی شیر کی طرح پلٹا تھا۔ ہوٹل کی انتظامیہ بھی الرٹ ہو گئی تھی۔ نبیل کی حالت تشویش ناک تھی۔ اس کے سر سے بھل بھل خون کے فوارے ابل رہے تھے اور شاید وہ بے ہوش بھی ہو چکا تھا۔

''سر! پرابلم کیا ہوئی؟'' منیجر نے منمنا کر پوچھنا چاہا تھا۔ زیان اسے بھی دھکیل کر سارہ کا ہاتھ سختی سے پکڑے کھینچتا ہوا سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ وسیع و عریض ہال میں موجود کئی لوگوں نے تحیر سے انہیں اپنے قریب سے گزرتے دیکھا تھا۔

پارکنگ میں آ کر زیان نے فرنٹ ڈور کھولا اور پہلے اسے دھکا دے کر بٹھایا، پھر گھوم کر دوسری طرف سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ جتنی اسپیڈ سے اس نے گاڑی پارکنگ سے نکالی تھی، سارہ کا دل جو پہلے ہی سینہ توڑ کر باہر آنے کو بے تاب تھا، اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ ہونٹ بھینچے، ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتا خاموشی سے گاڑی بھگائے جا رہا تھا اور سارہ مسلسل سر جھکائے آنسو بہاتی اس وقت کو کوس رہی تھی، جب اس نے کرن کے سامنے نبیل کا منہ توڑ دینے کا چیلنج قبول کیا تھا۔ سارہ نے اپنے قول کے مطابق نبیل کی آفر کو اس کے منہ پر مارا تھا اور تفاخر سے اسے اس کی اوقات یاد دلائی تھی مگر وہ بھی ایک نمبر کا خبیث تھا۔ پوری پلاننگ کر کے اس نے سارہ کو بلوایا تھا۔ اس دوران کرن کو بہانے سے واش روم میں بھیج کر اسے دھمکاتا ہوا اوپر لے آیا تھا۔ اور اگر زیان نہ ہوتا تو اس بھیڑیے نے نہ جانے کیا حشر کرنا تھا۔ وہ مسلسل روتے ہوئے سوچ رہی تھی اور کانپ رہی تھی۔

سارہ کو اس پل اپنے اعتماد اور بولڈنیس سے نفرت محسوس ہوئی تھی جو اسے اندھی کھائی

میں گرانے کو تیار تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا، سعیہ اسے دیکھ کر روئے جا رہی ہے۔ سارہ کو اپنی چھوٹی بہن کی باتیں یاد آ رہی تھیں اور دل اتھاہ گہرائی میں ڈوب رہا تھا۔

''عورت کے پاس ایک ایسی آنکھ کا ہونا ضروری ہے جو مقابل کے اندر تک اتر جائے۔'' سارہ کے سینے میں گویا کسی نے نیزے کی انی گھونپ دی تھی۔ وہ درد کی شدت سے کراہی۔

'تم نے سچ کہا تھا سعیہ!' اس نے گاڑی کی پشت سے سر پٹخا اور بلند آواز میں رونے لگی۔

اس کے پاس نہ وہ آنکھ تھی جو مقابل کے اندر تک اُتر جاتی، نہ وہ قوت تھی جو اچھے اور برے میں تمیز کرتی، نہ اس نے باطن میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ کتنا گھمنڈ تھا اسے کہ وہ آج کے دور کی باشعور اور بولڈ لڑکی ہے۔ اگر نبیل اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جاتا تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہ سکتی تھی۔ اور پھر اس کی بیمار ماما یہ صدمہ کبھی بھی برداشت نہ کر سکتی۔

'میری بہنوں کو کون سا خوف لاحق تھا۔ کیا یہی، جس نے آج مجھے ذلتوں کے گڑھے میں اتار دینا تھا؟'

''بند کرو یہ ڈرامہ۔'' زیان نے چلّا کر کہا تو اس کی سوچوں کو بھی بریک لگ گئے مگر آنسو ایک تواتر سے جاری تھے۔

''میرا کوئی قصور نہیں زیان بھائی!........ وہ مجھے تنگ کر رہا تھا۔ اور میں اسے بتا آئی تھی کہ میری امی کی تربیت بہت مضبوط ہے۔ میں کسی شیطان کے بہکاوے میں آنے والی۔''

''تم وہاں لینے کیا گئی تھیں؟ میں نے پہلے بھی تمہیں فائیو اسٹار میں دیکھا تھا۔ وقت بھی یہی تمہارے ساتھ تھا۔'' زیان نے ایک نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

''جیسی ماں ویسی بیٹی۔'' اس کے لبوں سے زہر میں بجھے الفاظ نکلے تو سارہ اٹھی۔

''مجھے گالیاں دے لیں۔ مار لیں۔ بلکہ جان سے ہی مار دیں۔ مگر میری ماں مت دیں۔''

''بتاؤ، کیوں گئی تھیں تم اس کے ساتھ؟'' زیان نے چلّا کر کہا۔

''میری دوست کرن کی سالگرہ تھی۔ وہی مجھے زبردستی لے کر گئی تھی۔ نبیل

کزن ہے۔'' اس نے روتے ہوئے بتایا تو زیان نے لب بھینچ لئے۔

''آپ نے مجھے پہچانا کیسے زیان بھائی؟'' سارہ نے سسکتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ زیان نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ اس گھر کے تمام مکین آج تک اس کے حافظے میں اوّل روز کی طرح محفوظ ہیں۔ اس کے دوست کہتے تھے کہ اگر زیان کسی شخص سے ایک مرتبہ مل لے اور پھر چالیس سال بعد دوبارہ اس شخص سے زیان کی ملاقات ہو تو وہ بغیر کسی تردّد کے اسے نہ صرف پہچان لے گا بلکہ پہلی ملاقات کا پورا حال بھی سنا ڈالے گا۔ اس نے نہ صرف سارہ بلکہ زروہ کو بھی پہچان لیا تھا اور اسے مبین اور مہک کے چہرے بھی یاد تھے۔ اور فاخرہ کو تو کبھی وہ بھولا ہی نہیں تھا۔ اس کی زندگی کے ناسور۔

''زیان بھائی! آپ امی کو کچھ نہ بتایئے گا۔ وہ صدمے سے مر جائیں گی۔'' اس نے بھنچی آواز میں روتے ہوئے التجا کی تھی۔ زیان کچھ نہیں بولا تھا، بس خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

''افسوس اس بات کا ہے کہ اس گھر کی لڑکیاں اتنی آزاد خیال کیسے ہو گئی ہیں؟ تمہاری ماں نے اپنے اصول بدل لئے ہیں؟'' اس کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ سارہ اذیت سے لب کچلتی رہی۔

''جیسی ماں ویسی بیٹی۔''

سارہ کو یوں لگا، گویا زیان نے اس کے منہ پر تیزاب پھینک دیا ہے۔ اسے خالہ نوری کی ایک ایک بات یاد آئی۔

''اولاد کے پاپ، ماں کے کھاتے میں لکھے جاتے ہیں۔ قصور بچوں کا ہو، مجرم ماں ٹھہرائی جاتی ہے۔ کمبخت نے جنا جو ہوتا ہے۔ اری ماں کب چاہے ہے بچہ بگڑ جاوے؟''

''میری نیک، فرشتہ صفت، بھلی مانس ماں بے جرم کے معتوب ٹھہرائی جائے گی۔'' اس نے بھبک بھبک کر روتے ہوئے کہا۔

ماں اور خود اپنا زیان کی نظروں سے گر جانے کا غم اسے کھائے جا رہا تھا۔ گاڑی اب اندرون شہر لاہور کی غلیظ اور تاریک گلیوں میں داخل ہو رہی تھی۔

سارہ نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور سرعت سے آنسو چادر کے پلّو سے رگڑ رگڑ پونچھے۔ زیان نے ایک مرتبہ بھی اس سے گھر کا پتہ نہیں پوچھا تھا۔

''تو کیا زیان بھائی کچھ بھی نہیں بھولے؟ نہ یہ گلیاں، نہ یہ سبز چوبارے والا ہمارا

ٹوٹا پھوٹا مکان اور نہ ہی ہماری ماں سے کی جانے والی نفرت۔'' وہ ڈوبتے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی۔

گاڑی ایک جھٹکے سے اشرف کی دکان کے قریب رکی۔ گلی میں جابجا کوڑے کے ڈھیر، گٹر کا بدبودار غلیظ پانی، ننگے کمزور اور میلے کچیلے بچے، کواڑوں سے جھانکتی عورتیں اور بالکل عین مکان کے سامنے بے سروسامانی کی حالت میں کھڑی اس کی ماں۔ روتی بلکتی سدیہ اور مہک اور پوری گلی میں نوحہ کناں ان کا بدرنگ، ٹوٹا پھوٹا سا سامان بکھرا پڑا تھا اور اس کا نڈھال بھائی لڑکھڑاتے قدموں سے سامان کا ڈھیر لگا رہا تھا اور گالیاں بکتا رؤف چاچا۔

''تو کیا اس ذلیل نے مکان خالی کروالیا ہے؟'' اس نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا

''آؤ آؤ، تم بھی دیکھ لو، میری منگ کو آگے بیاہنے کا انجام۔ میں شہر سے گیا تھا دنیا سے نہیں۔ تیری ماں نے چار دنوں میں مکاری کے ساتھ اسے بیاہ دیا۔ اب دھکے کھانا گلیوں اور بازاروں میں۔ یہ تیرا بیمار بھائی تو کچھ کرنے جوگا نہیں۔ بدبخت عورت اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ اتنا سستا مکان اسی لئے کرائے پر دے رکھا تھا، سسرال سمجھ کر قدر کی تھی مگر تم لوگ عزت کے قابل ہی کہاں تھے؟ بیس سالوں سے [illegible] رکھا تھا۔'' وہ کفر بکتا چیخ چلا رہا تھا اور گلی میں تماشا دیکھتی عورتوں کا بھی اضافہ ہو رہا تھا، ان عورتوں نے حیرانی سے چمکتی گاڑی میں سے نکلتی سارہ اور اس کے پیچھے آتے [illegible] خوش پوش نوجوان مرد کو دیکھا تھا۔ سارہ کی نظریں اپنی ماں کے رنگ بدلتے، زرد [illegible] کھلے چہرے پر تھیں جو ایک ٹک زیان عبیث کو دیکھے جا رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا نگاہوں کے راستے دل میں اتار رہی ہیں اس وجیہہ چہرے کو۔ ان حسین سحر طراز کو جن میں آج بھی نفرت تھی۔ حقارت تھی۔

آج نو سال بعد وہ پھر انہی راستوں پر کھڑا تھا۔ یہ وہی گلیاں تھیں۔ ویسے ہی تھے۔ وہی مکان تھا۔ اسی چوبارے کی سبز کھڑکی میں جھانکتا اس کا چہرہ، جس سے عبیث نے بے پناہ محبت کی تھی۔ اور پھر بے شمار نفرت بھی۔ نہ اس محبت کی کوئی اس نفرت کا کوئی شمار تھا۔

''زیان! میرا بچہ......میری جان!'' فاخرہ کے خشک لب پھڑپھڑائے۔ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھیں۔ یوں کہ زیان اور ان کے درمیان چند قدم گیا تھا۔

''جب چار دیواری کمزور ہو تو چور نقب لگانے آ جاتے ہیں۔ مجھے تیرے مضبوط سہارے کی آج ضرورت ہے۔ دیکھ، میرا سر ننگا ہو رہا ہے۔ اسے اپنی بدنصیب ماں کی التجا سمجھ لے زیان! آج میرے اس یقین کو جھٹلا دے کہ عبیث جیسے پتھر کی اولاد ہے۔''

''میں آپ کے اس یقین پر مہر لگا کر جا رہا ہوں کہ میں اسی عبیث فریدی کا پتھر دل بیٹا ہوں۔ میرے باپ کے بارے میں اور کچھ مت کہیے گا۔ میرا باپ بدکار تھا، گناہگار تھا۔ مگر آپ کی طرح منافق نہیں تھا، بے درد نہیں تھا۔ اس نے مجھے محبت نہیں دی تو آپ کی طرح دھتکارا بھی نہیں تھا۔ آج جو کچھ میں ہوں، اپنے باپ کی وجہ سے ہوں۔ مجھے بھی اس وقت ان بانہوں کی گرمی کی ضرورت تھی۔ اس وجود کے سہارے کی ضرورت تھی۔ مگر اب نہیں۔ مجھے جینے کے تمام ڈھنگ معلوم ہو گئے ہیں۔ جس طرح آپ نے مجھے دھتکارا تھا، اسی طرح میں آپ کو یہ باور کروا کر جا رہا ہوں کہ گزرے برسوں کے دوران یہ نفرت مزید نشوونما پاتی رہی ہے۔ نفرت کا پودا جڑ پکڑ گیا ہے۔ یہ نفرت میری آخری سانسوں تک برقرار رہے گی۔ نہ آپ کو زیان کی اس وقت ضرورت تھی اور نہ زیان کو اب آپ کی چاہ ہے۔ نفرتوں کے اس سلسلے کو قبر تک میرے ساتھ جانا ہے۔ آپ کی بیٹی کو باحفاظت آپ تک پہنچا دیا ہے، اسے میرا احسان سمجھیے گا۔''

وہ آخری حقارت بھری نگاہ ان پر ڈالتا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا دُور بہت دُور نکلتا چلا گیا تھا۔ اپنی ماں کے دل سے بھی دور۔

''میں نے آخری مرتبہ تجھے رو دیا زیان! اب تیرے نام کا آنسو میری آنکھ میں نہیں اترے گا۔'' انہوں نے مبین کا بازو تھاما اور زیرلب بڑبڑائیں۔

''اماں! پتھروں سے سر نہیں پھوڑتے۔ اس سے میری رانیہ کا تو پوچھ لیا ہوتا۔ وہ تو ہماری یاد میں تڑپتی ہو گی۔'' مبین نے تھکے تھکے لہجے میں کہتے ہوئے تینوں بہنوں کو ساتھ لگا لیا۔

''بھائی! اب ہمیں یہاں نہیں رہنا۔'' مہک نے مبین سے لپٹ کر کہا۔

یہ لٹا پٹا قافلہ انجانی منزل کی طرف چل پڑا تھا۔ نڈھال وجود اور غم زدہ دل لئے وہ ان گندی گلیوں سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

❁

زرین تک وصی کے ارادوں کی بھنک پہنچ چکی تھی۔ رمیز نے کل رات ہی اس سے بات کی تھی۔ جی تو چاہ رہا تھا، رمیز کو کھری کھری سنا دے مگر بھائی۔ اگرچہ وہ چھوٹا ہی

تھا مگر کچھ معاملوں میں زرین اس سے دبتی بھی تھی۔

وہ صبح سے وصی کا انتظار کر رہی تھی، مگر اسے بھی شاید ماں کے ارادوں کی خبر ہوگئی تھی۔ اس لئے جل دے کر نکل گیا تھا۔ مگر اب زرین اس کا انتظار کرتے ہوئے خوب بھنا رہی تھی۔ جوں ہی وصی کی بائیک کی آواز آئی وہ پہلے سے ہی اُٹھ کر اس کے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔

وصی گنگناتا کمرے میں داخل ہوا اور ماں کو دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے تمام طوطے ہوا میں پرواز کر گئے۔

"کیا ماما نے امی کو بتا دیا ہے؟........ یا اللہ خیر۔" اس نے بے ترتیب دھڑکنوں ڈپٹا اور فلمی اسٹائل میں زرین کے پاؤں چھو کر گنگنایا۔

"میری پیاری امی جان!

میرے سارے امتحان

تیرے ہی دم سے آسان ہوئے۔"

"آج پھر سے لیٹ آئے ہو؟" زرین نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا اور پیروں سے اس کے ہاتھ ہٹائے۔

"شادی کر دیں۔ رمیز ماما کی طرح جلدی جلدی گھر آ جایا کروں گا۔" اس خوشامدی مسکان لبوں پر سجا کر کہا۔ آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"بہت اتاولے ہو رہے ہو شادی کے لئے۔" زرین تو آگ بگولا ہو کر رہ گئی تھی 'یہ آج کل کے بچے۔ نہ شرم ہے نہ حیا' اس نے تلخی سے سوچا اور وصی کو گھورنے لگی، جو بہت معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

"شادی کے لئے نہیں، منگنی کے لئے اتاؤلا اور باؤلا ہو رہا ہوں۔"

"تمہارے لئے نومیہ کی بھانجی میں نے دیکھ رکھی ہے۔ اِن شاء اللہ جلد ہی منگنی کر دوں گی۔" زرین نے لہجہ بدل کر وصی کو پچکارنے کے انداز میں کہا تھا۔

"نومیہ مامی کی بھانجی؟........ قطعاً نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ اس سے شادی کرنے سے بہتر ہے میں خودکشی کر لوں........ میرے نویز ماما کی جو حالت کر رکھی ہے خالہ جان نے، ویسی ہی درگت میری بھی بنا کر رکھ دیں گی۔ نویز ماما کی طرح میں اپنی سدھ بدھ بھول جاؤں گا۔" وصی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"مجھ سے خود نویز نے بات کی تھی۔ اکلوتی بہن ہے بیٹا۔ اچھی خاصی

مالک۔" زرین نے اسے لالچ دینا چاہا۔

"معذرت کے ساتھ امی! ویسی ہی سطحی سوچ۔ وہ بھی میرے بارے میں اور پھر بینا بی بی، اکلوتی مجھے لے اُڑے گی۔ گھر داماد بنائیں گے۔ خود نومیہ مامی بھی ایک دن کہہ رہی تھیں۔" وصی نے ماں کو خوف زدہ کرنا چاہا تھا۔ زرین کو قطعاً اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔

"جھوٹ مت بولو۔"

"سچ کہہ رہا ہوں امی! انہوں نے بینا کے شوہر کو گھر داماد بنانا ہے۔ وہ قربانی کا بکرا میں بنوں یا کوئی اور........ ان لوگوں کے بہی خطرناک ارادے ہیں۔" وصی نے پُرزور لہجے میں ماں کے گھٹنوں پر دباؤ ڈال کر کہا۔

"مگر نویز نے میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں کی۔" زرین نے حیرت سے کہتے ہوئے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"میری واحد پونجی، ایسے ہی اٹھا کر دے دوں؟"

"امی! مجھے کسی ڈیکوریشن پیس کو گھر نہیں لانا۔ زروہ مامی جیسی لڑکی ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ میں شادی نہیں کروں گا۔" اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ زرین بھنا کر رہ گئی۔

"زروہ کی بہن کا بھوت جو سر پر سوار ہے۔ مگر وصی! تم جو مرضی کہہ لو، بینا نہ سہی، کوئی اور دیکھ لوں گی۔ مگر سدیہ میری بہو ہرگز نہیں بنے گی۔"

"مگر کیوں؟........ کیا وجہ؟" وصی نے غصے سے کہا۔

"امی! پلیز یوں مت کہیں۔ ماما کے حوالے سے وہ سب ہمارے لئے قابل احترام ہیں۔ اور یہ خالص میری خواہش ہے۔ اس میں سدیہ کا کیا قصور؟" اس نے نرمی سے ماں کے ہاتھ تھامے اور مزید بولا۔

"امی! زروہ مامی بہت اچھی ہیں۔ یہ صرف میں ہی نہیں کہہ رہا، نانو بھی کہتی ہیں۔ ماما اور ثمن بھی ان کی گرویدہ ہیں، ان کی اچھی عادتوں کی وجہ سے۔ وہ سب کا احساس کرتی ہیں۔ سب کا خیال رکھتی ہیں۔ کم از کم وہ نومیہ اور ثنا مامی جیسی بالکل نہیں۔ اور اندر سے تو آپ بھی ان کی اچھائیوں کو تسلیم کرتی ہیں مگر زبان سے اظہار نہیں کرتیں۔ ہماری نانو کا انتخاب بیسٹ ہے۔ اب دیکھیں نا، مامی اتنے دنوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔ آپ جو مرضی کہہ لیں، انہوں نے کبھی پلٹ کر آپ کو جواب نہیں دیا۔ ورنہ جب نویز ماما لوگ ادھر رہتے تھے تو ہر وقت ایک سرد جنگ دن رات سب کو ذہنی اذیت میں

جتلا رکھتی تھی۔'' وصی نے چوٹ ٹھیک جگہ لگتی دیکھ کر گلا کھنکارا اور ماں کے ہاتھ دباتے ہوئے کہنے لگا۔

''امی جان! میں آپ پر کچھ باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ نویز اور نوید ماما اس وقت الگ ہو گئے تھے جب ہم دونوں بہت چھوٹے تھے اور رمیز ماما بھی اپنے پیروں پر نہیں کھڑے ہوئے تھے۔ آپ جانتی ہیں، نانو کی تمام تر قربانیوں کو نویز ماما بھی تسلیم کرتے ہیں مگر انہوں نے اپنا گھر بچانے کی خاطر نانو کو چھوڑ دیا تھا اور یہ صرف آپ کی وجہ سے ہوا تھا۔ آپ اور شنا مامی کی ہمہ وقت لڑائیوں کی وجہ سے ماما لوگوں نے نانو سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اب وہ لوگ نانو کو اپنے گھر لے کر جانا چاہتے ہیں مگر نانو نہیں مانتیں۔ صرف اس لئے کہ آپ کا دل نہ دکھے۔ نانو صرف آپ کی خاطر زردہ مامی جیسی لڑکی ڈھونڈ کر لائی ہیں تاکہ ہم سب مل جل کر رہیں۔ امی! آپ زردہ مامی کی نہیں درپردہ نانو کے انتخاب کی نفی کرتی ہیں۔ نانو کو بہت تکلیف ہوتی ہے جب آپ مامی سے تلخ کلامی کرتی ہیں۔ مگر انہوں نے کبھی آپ کو نہیں جتایا۔''

وصی خاموش ہوا تو زرین بے چین سی ہو گئی اور حیرت سے سوچنے لگی کہ یہ وصی کس قدر باریک بینی سے تجزیہ کرتا رہا ہے۔

''امی! ایک بات اور میں آپ کو بتانا چاہوں گا کہ آج میں جتنے بھی آپ کے سامنے دعوے کروں، انہیں سچ نہ مانیے گا۔ اگر میری بیوی بھی آپ کی بھابیوں جیسی ہوئی تو مجھے بھی گھر بچانے کی خاطر آپ کو چھوڑنا پڑے گا۔ اگر بینا بیگم جیسی کوئی آ گئی تو جب آپ کو نانو کی طرح گھٹیا کا درد ہوا تو کسی نے تخت پر بٹھا کر خدمت نہیں کرنی احساس نہیں کرنا۔ نہ ہی پھر آپ بیٹھ کر حکم چلا پائیں گی۔''

وصی نے بات کے اختتام پر شرارتی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر کہا تو زرین گم سوچوں میں ڈوبی بغیر کچھ کہے گم سم سی اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اور وصی ہرّا کا نعرہ لگا کے واش روم میں گھس گیا تھا۔

وہ معمول کے مطابق چیک اپ کروا کے جوں ہی کلینک سے باہر آئی تو آسمان نے موٹی موٹی بوندیں برسانا شروع کر دی تھیں۔ گھر سے نکلتے وقت تو بارش کا یوں ٹوٹ ٹوٹ کر برسنے کا کوئی ارادہ نہیں لگتا تھا۔ مگر اب لمحوں میں جل تھل ہو گئی تھی۔

اس نے احتیاط سے گاڑی اسٹارٹ کی اور موبائل پر حنا کا نمبر پریس کیا۔ وہ لوگ ابھی تک ہسپتال میں تھے۔ رات کو انکل کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے حنا نے ان کو ایڈمٹ کروا دیا تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ حنا نے کال ریسیو کی۔

''انکل کی طبیعت کیسی ہے........؟'' عنوہ نے چھوٹتے ہی پوچھا تو اس کی بھیگی آواز سنائی دی۔

''اب پہلے سے بہتر ہیں۔''

''کب تک ڈسچارج کریں گے انکل کو؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ابھی کچھ بتایا نہیں ڈاکٹرز نے۔ زیان بھائی اور حشام آئے تھے۔'' حنا نے بتایا تو تنس اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے وہ شرارتاً بولی۔

''زیان تو بھائی ہوئے۔ حشام کو کس خوشی میں بھائی نہیں بنایا؟''

''حشام کو تم بھائی بنا لو۔'' حنا نے اس کی شرارت سمجھ کر کہا۔

''اوہو........ مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا ہے۔'' عنوہ نے اسے چھیڑا تو وہ چڑتے ہوئے بولی۔

''مینڈکی کسے کہا ہے؟''

''تمہیں۔''

''زیان بھائی کے ساتھ رہتے ہوئے تم بہت تیز ہو گئی ہو۔ پہلے ایسی نہیں تھیں۔ بولنا بھی نہیں آتا تھا۔ ادھر تمہارے صاحب صبح اپنے دوست کے ہمراہ آئے تھے۔ ابو کی

طبیعت پوچھ کر ان کے سامنے ہی پتہ ہے کیا فرمانے لگے؟" حنا خجل سی ہو کر اسے سب
بتاتے ہوئے رکی تو عنوہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا فرمایا تھا زیان نے؟"

"بس کچھ نہ پوچھو۔" حنا کو ڈھیروں شرم نے آن گھیرا۔

"بول بھی چکو۔" اس نے مصنوعی غصے سے حنا کو جھاڑا تو وہ جلدی سے بولی۔

"ابو کے سامنے ہی کہنے لگے۔ تم دونوں کوریڈور میں جا کر گفت وشنید کر لو۔
پھر ابو کو بطورِ خاص مخاطب کر کے موصوف نے بتایا کہ انکل! یہ آپ کی عیادت
نہیں، حنا سے کچھ بات کرنے آیا ہے۔ باقی آپ خود سمجھ دار ہیں۔ جہاں ابو
چارے خجل ہو کر مسکرائے، وہیں حشام کا رنگ بھی اُڑ گیا۔ اور میرے بارے میں تو
پوچھنا بھی مت۔ جی چاہ رہا تھا، زمین پھٹے یا پھر جادو کی چھڑی سے میں غائب
جاؤں۔ سچ، بہت ہی منہ پھٹ ہیں تمہارے شوہر نامدار۔"

"اللہ توبہ!......زیان بھی حد ہی کرتے ہیں۔" عنوہ کی ہنسی چھوٹ گئی تھی اور
طرف حنا نے بھنا کر یہ کہتے ہوئے فون بند کیا۔

"تم سے ہمدردی کی توقع نہیں کرنی چاہئے تھی۔"

عنوہ نے ہنسنے کی وجہ سے آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کیا اور موبائل ڈیش
پھینک کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ گھر آئی تو مس نیمی نے بتایا۔

"میم! آپ کے خانساماں زینو کا فون آیا تھا۔ ان کے پوتے کی طبیعت
ہے۔"

"اوہو......میں نے انہیں کچھ پیسے دینے تھے۔ زیان تو اس وقت دفتر ہوں
فون کر کے پوچھتی ہوں۔" وہ سوچتے ہوئے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی تھی۔
سیکرٹری نے کال ریسیو کی تھی۔

"زیان سے بات کروائیں۔"

"میڈم! آپ کچھ دیر بعد فون کیجئے گا۔ سر میٹنگ روم میں موجود ہیں
کال اس وقت ریسیو نہیں کریں گے۔" سیکرٹری نے شائستگی سے کہا تو وہ سرعت

"آپ انہیں بتائیں، عنوہ کا فون ہے۔"

"سوری میڈم! سر غصہ کریں گے۔"

"مس سیکرٹری! آپ انہیں بتائیے کہ مسز زیان بات کر رہی ہیں۔"

کر کہا تو سیکرٹری گھبرا اٹھی۔

"آپ پہلے بتا دیتیں، آپ سر کی مسز ہیں۔ میں ابھی بات کرواتی ہوں۔"

"کیا بات ہے عنوہ! تم ٹھیک تو ہو؟......کیوں فون کیا ہے؟" کچھ دیر بعد زیان
کی آواز ایئرپیس سے اُبھری تھی۔ وہ تیز تیز بول رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ طبیعت بھی فرسٹ کلاس ہے۔ ابھی ڈاکٹر کے پاس سے ہو کر آ
رہی ہوں۔" عنوہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اس کے فون کرنے کی وجہ سے پریشان ہو گیا ہے۔
کیونکہ آج سے پہلے اس نے کبھی زیان کو آفس فون جو نہیں کیا تھا۔

"مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔" اس نے اپنے فون کرنے کی وجہ بیان کی تو
زیان نے خفگی سے کہا۔

"میری جان نکال کر رکھ دی ہے۔ پہلا خیال یہ آیا تھا کہ تم کہیں بیمار نہ ہو گئی ہو۔
تمہاری طبیعت بھی تو ایسی ہو رہی ہے آج کل۔ میرا تمام اندرونی نظام ہلا کر رکھ دیا ہے
تم نے۔ ابھی تک ہارٹ بیٹ نارمل نہیں ہو رہی۔ کمال کرتی ہو یار! پہلے بھی بتایا تھا اگر
پیسوں کی ضرورت ہو تو بلا جھجک سیف میں سے نکال لینا۔"

"میں کیا اتنی خاص ہوں آپ کے لئے؟" اس نے بڑے شوخ انداز میں پوچھا
تھا۔

"اس دلبرانہ انداز پر بے ہوش نہ ہو جاؤں میں۔ یوں مت کہو، ایسا نہ ہو کہ میں
تمام فائلیں بھاڑ میں جھونک کر بھاگتا ہوا گھر آ جاؤں اور پھر دروازہ......ارے یار!
آگے کچھ نہیں بولنا......مت گھورو مجھے۔"

"ہیں......انہیں کیا ہوا ہے؟" عنوہ نے حیرت سے سوچا۔ دوسری طرف زیان
کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً اس کے ساتھ آفس میں کوئی اور بھی موجود تھا۔ عنوہ
کے رخسار تپنے لگے۔

"ایک تو زیان بھی دائیں بائیں دیکھے بغیر شروع ہو جاتے ہیں۔"

"سوری عنوہ! گھر آ کر بات ہو گی۔ یہ حشام خبیث شرم سے دہرا ہو رہا ہے۔ اس
کی گھوریوں کی مجھ میں تاب نہیں ہے۔ او کے، اپنا خیال رکھنا اور لنچ بھی ٹھیک طرح سے
لے لینا، میری جان پر احسان کرتے ہوئے۔"

عنوہ فون کریڈل پر رکھ کر بالوں میں ہاتھ چلاتی مسکراتے ہوئے اپنے بیڈروم کی
طرف بڑھ گئی تھی۔ سیف کی چابی دراز میں سے نکال کر اس نے لاک کھولا۔

"اُف، اتنے نوٹ......." عنوہ نے جھرجھری لے کر ترتیب سے رکھی نوٹوں کی اونچی ڈھیری کو دیکھ کر سوچا۔ ڈالر، فرانک، بولیوانو....... پونڈز اور نہ جانے کون کون سے ملکوں کی کرنسی اکٹھی کر رکھی تھی۔

"ایک وقت ایسا آیا تھا، جب مجھ پر دولت اکٹھی کرنے کی دھن سوار ہوگئی تھی۔ یہ سب میری محنتوں اور جنون کا حاصل ہے۔ ان میں بلیک منی کا کچھ حصہ نہیں۔" ایک مرتبہ زیان نے نہ جانے کس دھن میں اسے بتایا تھا۔ ورنہ اسے تو اپنے ماضی کے بارے میں بات کرنا سخت ناپسند تھا۔

عنوہ نے صرف بیس ہزار روپے نکال کر لاکر بند کرنا چاہا مگر اس بڑے سے سیف میں موجود ایک اور سیف کو دیکھ کر قدرے ٹھٹک گئی۔ پہلے بھی سوچا کہ زیان کی کچھ ضروری چیزیں یا کرنسی وغیرہ ہی ہوگی مگر پھر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ہاتھ میں پکڑی چابیوں کے گچھے میں سے سب سے چھوٹی گولڈن کلر کی چابی سے لاک کھولا تو کلک کی آواز کے ساتھ چھوٹا سا دراز خود بخود باہر نکل آیا تھا۔ عنوہ نے اشتیاق سے دراز میں جھانکا۔ تین چار فائلیں۔ ایک موٹی سی چین جس کے عجیب سے انسانی شکل والے لاکٹ میں Durya لکھا تھا۔

اس نے فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر بے زاری سے دراز میں پٹخنے لگی تو نچلی فائل سے اک تصویر جھانکنے لگی تھی۔ عنوہ نے کھینچ کر تصویر کو نکالا اور ہاتھ میں پکڑ کر بغور دیکھنے لگی۔ اس کے دل کی رفتار معمول سے ہٹ کر تھی۔

ایک ہنستی مسکراتی لڑکی کی بہت دلکش تصویر تھی۔ خصوصاً آنکھیں بہت خوب صورت تھیں اور نچلے ہونٹ کے پاس بھورا سا تل بہت جاندار لگ رہا تھا۔ گویا اس تل میں اس کے پورے چہرے کی خوب صورتی تھی۔ عنوہ نے تصویر کو ہر اینگل سے دیکھا تھا۔ تصویر کی بیک سائیڈ پر واضح لفظوں میں لکھا تھا۔

"Durya my love"

عنوہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے دراز بند کیا اور تصویر اٹھا کر باہر چلی آئی۔ مس نینی نے حیرت سے بھاگ کر سیڑھیاں چڑھتی عنوہ کو دیکھا تھا اور پھر خود بھی دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پیچھے آ گئی۔

"رانیہ! میں تم سے کچھ پوچھنے آئی ہوں۔ پلیز سچ سچ بتانا۔ کیا زیان کی زندگی میں ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی عورت تھی؟"

مس نینی کو زور کا چکر آیا تھا۔ اس نے حیرت سے بت بنی رانیہ کی طرف دیکھا تھا جو ساکت وصامت اس طرح کھڑی تھی، گویا کبھی دوسرا سانس لے گی ہی نہیں۔ رانیہ کے چہرے کی رنگت پہلے زرد اور پھر سفید پڑ گئی۔

بہت پہلے عنوہ کی چھٹی حس نے جو ہنٹس اسے دیئے تھے، وہ سب بے بنیاد نہیں تھے۔ زیان کی وہ باتیں جو اس نے عالم مدہوشی میں کی تھیں۔ ان کی کڑی اسی نام سے کہیں نہ کہیں ضرور ملتی تھی۔

"گندی عورت۔" زیان کا آتشیں انداز ذہن کے پردۂ اسکرین پر لہرایا تو وہ خود کڑی سے کڑی ملانے لگی۔

"بے حیا اور بے غیرت عورت تھی، میری روح کا ناسور، میری زندگی کا عذاب۔" عنوہ کی رگیں تن سی گئیں۔

"دریہ، مائی لو۔" تصویر کے پیچھے چمکتے الفاظ۔

"دریہ تمہاری ماں جیسی....... میں تمہارے باپ جیسا۔"

وہ پھر سے اُلجھنے لگی۔ آخر یہ کچھ بتاتی کیوں نہیں؟....... زیان اسے مار تو نہیں دے گا۔ یہ کیوں اتنی خوف زدہ ہے؟ کیا کوئی عورت اپنے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت دے سکتی ہے؟ اور شوہر بھی ایسا جس نے کبھی اس کا نام لینا گوارا نہیں کیا۔ جو اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں۔ رانیہ کے پتھر جود میں حرکت ہوئی اور وہ لرزتے قدموں سے چلتی ہوئی صوفے پر ڈھے گئی۔ اس کی سانسیں دھونکنی کے مانند چل رہی تھیں۔

عنوہ بے تابی سے اس کے قریب گھٹنوں کے بل کارپٹ پر بیٹھ کر التجائیہ بولی۔

"رانیہ! پلیز مجھ سے کچھ مت چھپانا۔ مجھے یقین ہے تم جانتی ہوگی کہ یہ تصویر والی لڑکی کون ہے؟" اس نے دوپٹے میں چھپائی دریہ کی تصویر رانیہ کے سامنے کی تو وہ وحشت کے عالم میں چلّانے لگی۔

"میں نہیں جانتی، یہ کون بلا ہے۔ ناسور ہے یہ۔ دیمک ہے جس نے مجھے چاٹ لیا۔ لاؤ، میں اسے پھاڑ دوں۔ آگ کے حوالے کر دوں۔ اس نے مجھے جلایا ہے، میں اسے جلا دوں۔" وہ بلند آواز میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔

"کیا تعلق ہے اس لڑکی کا زیان سے؟" اس نے سختی سے رانیہ کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"مجھے نہیں پتہ۔" رانیہ نے تنفر سے کہا۔

"تم سب جانتی ہو، بس مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔"

"یہی سمجھ لو۔" اس کا انداز مبہم تھا۔

"دریہ کا زیان سے کیا رشتہ ہے؟" عنوہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کرختگی سے پوچھا تو وہ نظریں چرا کر چلائی۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ ہزار مرتبہ بھی یہی کہوں گی۔ چاہے تم جو مرضی کر لو۔ کسی چھینی سے میرا سر پھاڑ دو۔ کوئی خنجر میرے سینے میں اتار دو۔ کسی بھالے سے دل چیر دو۔ کسی موچنے سے آنکھیں نوچ لو یا کسی کدال سے زمین کھود کر مجھے زندہ اس میں دفن کر دو۔ میں یہی کہوں گی کہ مجھے کچھ نہیں پتہ۔"

"زیان تمہارا شوہر ہے اور تم اس کا ماضی نہیں جانتیں۔ نو سالوں سے اس کے ساتھ ہو۔" عنوہ نے حیرت سے کہا تو وہ چبھتے لہجے میں چنگھاڑی۔

"وہ میرا نہیں صرف تمہارا شوہر ہے۔" رانیہ نے چبا چبا کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔

"اس کے نکاح میں ہو۔ کیوں؟ کس لئے؟ طلاق کیوں نہیں لیتیں اس سے؟ چھوڑ کیوں نہیں دیتیں اسے؟" اس نے زہریلے انداز میں کہا۔

"اپنے حصے کا عذاب بھگت رہی ہوں۔" رانیہ غصے کے عالم میں شاید پھٹ پڑتی مگر جوں ہی مس نینی پر نظر پڑی وہ خوف زدہ ہو کر خاموش ہو گئی۔ عنوہ نے بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا اور پھر گہری سانس کھینچ کر غصے سے پلٹی۔

"کیا لینے آئی ہیں یہاں؟ ہماری کوئی حیثیت نہیں اس گھر میں۔ اپنی مرضی سے کچھ بول بھی نہیں سکتے۔ ہمیں سانس بھی آپ سے پوچھ کر لینا چاہئے؟"

"میم! پلیز آپ نیچے چلئے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ بی پی لو ہو جائے گا۔ صاحب کو پتہ چلا تو وہ طوفان کھڑا کر دیں گے۔" مس نینی پر اس کے چیخنے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"آپ جا سکتی ہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"میم! غصہ مت کریں۔ رانیہ بی بی آپ کو کچھ نہیں بتا سکتیں۔ آپ نے جو پوچھنا ہے، صاحب سے پوچھیے۔ ہم میں سے کوئی بھی زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ رانیہ بی بی، نہ میں۔" مس نینی نے معنی خیزی سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھمائیں۔

"آپ اس تصویر کو جانتی ہیں؟" نتائج کی پروا کئے بغیر عنوہ نے ہاتھ میں پکڑی تصویر مس نینی کی آنکھوں کے سامنے لہرائی تو وہ ایک پل کے لئے ششدر رہ گئی تھی۔

"یہ تصویر آپ کو کہاں سے ملی؟"

"میری بات کا جواب دیں۔" عنوہ زچ ہو کر چلا اٹھی۔ مس نینی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں اور پھر بغیر کچھ کہے تیزی کے ساتھ سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ یقیناً زیان کو باخبر کرنے گئی تھی۔ مگر عنوہ پر تو سب کچھ جان لینے کا بھوت سوار تھا۔ مس نینی کے ٹلتے ہی اس نے تشکر بھرا سانس خارج کیا۔

"دریہ کو نہ سہی، زروہ کو تو جانتی ہو گی؟" اس نے بہت سوچ سمجھ کر رانیہ کو گھیرا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ چونک اٹھی۔

"تم ملی ہو ان سے؟" رانیہ کے لبوں سے سرگوشی نما آواز نکلی۔

"ہاں۔"

"کب؟ کس جگہ؟ کیسے جانتی ہو تم انہیں؟" اس نے بے قراری سے کہا۔

"جیسے تم دریہ کو جانتی ہو اور مجھے بتانا نہیں چاہتیں، بالکل اسی طرح میں زروہ کو جانتی ہوں اور تمہیں کبھی نہیں بتاؤں گی۔" عنوہ جان بوجھ کر مبہم سا مسکرائی تو رانیہ بے چین ہو گئی۔ اس کی بے چینی آنکھوں سے ہویدا تھی۔ کچھ ماضی کے پردوں پر لہراتی یادیں اس کی نگاہوں میں کرچیاں چبھونے لگی تھیں۔

"مبین........" اس کے لبوں سے اک نوحہ نما آہ برآمد ہوئی اور دوسرے ہی پل وہ دوڑتے ہوئے دروازہ لاک کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ نہ جانے کون سے زخموں سے ٹانکے ادھڑ گئے تھے۔

"مبین۔" عنوہ زیر لب بڑبڑائی۔

"یہ مبین کون ہے؟" اس نے جھنجلا کر سوچا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیڈ پر ڈھے گئی۔

"لو جی، ایک اور نئی کہانی۔" اس نے تھک کر سوچا۔

"میں تو پاگل ہو جاؤں گی اس الجھے ریشم کو سلجھاتے سلجھاتے۔" عنوہ نے پیروں کی انگلیاں دباتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ اسی پل ماریہ دندناتے ہوئے بغیر ناک کئے اس کے بیڈ روم میں چلی آئی۔ عنوہ تو اس بدتہذیبی پر سلگ کر رہ گئی تھیں۔ اس نے تمام مینرز بھلا کے یک دم چلا کر کہا۔

"کسی کے بیڈ روم میں انٹر ہونے سے پہلے ناک کر لینا چاہئے۔"

"اس وقت تو زیان آفس میں ہوتا ہے۔ اسی لئے میں......" ماریہ نے معنی
سے اونچا سا قہقہہ لگایا تو اس نے تیکھے انداز میں طنزیہ کہا۔
"اسی لئے آپ منہ اٹھا کر بغیر ناک کئے اندر گھس آئی ہیں۔"
"تم تو اچھا خاصا بول لیتی ہو۔ اس دن پارٹی میں تو بھیگی بلی بن کر بیٹھی تھیں"
ماریہ نے شرمندہ ہونا کہاں سیکھا تھا۔
"مگر اس بلی کے تو پنجے بھی تیز ہیں اور دانت بھی۔" وہ بلاوجہ ہی ہنس ہنس کر
پوٹ ہو رہی تھی۔ عنوہ نے ناگواری سے اسے دیکھا اور بولی۔
"تم ذرا احتیاط سے رہنا۔ کہیں تم میرے ہدف کا نشانہ نہ بن جانا۔"
"میں سمجھی نہیں۔" ماریہ نے آنکھوں میں آئی نمی کو ٹشو کے ساتھ نزاکت
صاف کیا۔
"بلی کے پنجے تیز ہوں تو وہ حملہ بھی کر سکتی ہے۔" اس نے مبہم انداز میں مسکرا کر
"کچھ کچھ مشکل پسند بھی ہو۔ آخر ایک مشکل ترین مہم جو اور پتھر کے آدمی کا،
ہے، جس کے اعصاب اس قدر مضبوط ہیں کہ کوئی حادثہ اس پر اثر نہیں کر سکتا۔
ڈارکیسٹ آورز (بدترین وقت) میں فولاد کی دیوار بن جاتا ہے۔ ورنہ زیان کی جگہ
اور ہوتا تو ضرور سوسائیڈ کر لیتا۔" ماریہ اسے غائبانہ سراہتے ہوئے بولی تھی۔
"کون سا بدترین وقت؟ میرا نہیں خیال کہ زیان کی زندگی میں ایسا کوئی وقت
ہوگا۔" اس نے چونک کر کہا۔
"اونہہ...... تم کتنا جانتی ہو اسے؟" ماریہ نے بھنویں اچکا کر ناقابل فہم انداز
اسے دیکھا۔
"اور تم بتاؤ، کتنا جانتی ہو زیان کو؟" وہ کچھ ٹھٹک کر حیرت زدہ سی بولی تھی۔
ماریہ کچھ نہ کچھ ضرور دریہ کے بارے میں جانتی ہوگی۔ بلکہ رانیہ کے متعلق
اس کے ذہن میں کچھ اسپارک ہوا تھا۔
"بچپن سے جانتی ہوں زیان کو۔ امریکہ میں بھی ہم ساتھ تھے۔"
اسی پل ماریہ کا سیل فون بج اٹھا تھا۔ وہ فون پر مصروف ہوگئی۔ عنوہ اسے بے زا
سے سن رہی تھی۔
"کب آئے پاکستان؟...... اوہو، یہاں لاہور میں ہو۔ کیوں نہیں، آج شا
ملیں گے۔ تم ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہو؟ زیان کو نہیں بتایا ہوگا، ورنہ وہ تمہیں کبھی

ہوٹل میں رکنے نہ دیتا۔ بہت ڈفر ہو تم املاک! کہاں سے آئے ہو؟ اچھا اچھا، عمرہ کرنے
گئے تھے۔ ابھی تک مولوی ہو...... میں نے سمجھا، کچھ بدل گئے ہو گے۔ ہاں، میں اس
وقت زیان کے بیڈ روم میں موجود ہوں۔" ماریہ نے ایک آنکھ دبا کر بہت گھٹیا سا اشارہ
کیا تھا۔ وہ خفت سے سرخ پڑ گئی۔
"ارے یار! ہماری ایسی قسمت کہاں؟...... زیان نہیں گھاس ڈالنے والا۔" ماریہ
کھلکھلائی۔ سیل فون سے کان ہٹایا اور اسے ہولڈ کرنے کا کہہ کر عنوہ کو بتانے لگی۔
"زیان کا اور میرا بیسٹ فرینڈ ہے، املاک۔ ہم اسے ملا کہتے ہیں۔"
'تو میں کیا کروں؟' عنوہ نے جل کر سوچا۔ ماریہ پھر سے فون پر مصروف ہوگئی تھی۔
"تمہارے لئے بھی ایک گڈ نیوز ہے۔ زیان شادی کر چکا ہے۔" یہ خبر کچھ حاسدانہ
انداز میں دوسری طرف پہنچائی گئی تھی۔ عنوہ چونک سی گئی۔
دوسری طرف املاک اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔
"تم سچ کہہ رہی ہو؟"
"مجھے کیا ضرورت ہے اتنا خوفناک جھوٹ بولنے کی؟" ماریہ نے ناگواری سے
کہا۔
"تمہارے لہجے سے حسد کی بو سونگھ کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ زیان کی بیوی کم از کم
تم نہیں ہو سکتیں۔ پھر اس کے بیڈ روم میں کس خوشی میں موجود ہو؟" املاک نے خوش
دلی سے طنز کا تیر پھینکا تھا۔ ماریہ جل بلا سی گئی۔
"ہم فرینڈز بھی تو ہیں۔"
"فرینڈز صرف ڈرائنگ روم اور لاؤنج تک محدود ہوتے ہیں۔ بیڈ روم میں بیوی
ٹ کرتی ہے۔" املاک نے اپنے طنز کی وضاحت مزید طنزیہ انداز میں کی تھی۔
"جو تمہیں نہیں چاہتا، اس کے پیچھے کیوں ہلکان ہو رہی ہو؟ جو تمہیں چاہتا ہے، اس
کی طرف توجہ دو۔"
"اور مجھے کون چاہتا ہے؟" اس کے انداز میں حد درجہ رکھائی تھی۔ عنوہ پوری توجہ
سے ماریہ کی طرف متوجہ تھی۔
"تم خوب اچھی طرح جانتی ہو۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا تھا۔
"بہت دعائیں کی تھیں خانہ کعبہ کی چھاؤں میں بیٹھ کر، اللہ تمہیں ہدایت دے۔ مگر
تم ابھی تک بے ہدایتی پھر رہی ہو۔ سنبھل جاؤ ماریہ! اور اس حقیقت کو تسلیم کر لو کہ نہ کل

نہ آج اور نہ ہی آئندہ فیوچر میں زیان تمہارا ہوگا۔ تو پھر زندگی کے اتنے قیمتی سال کیوں ضائع کر رہی ہو؟''

''اتنی دُور سے اپنا پیسہ اور وقت برباد کر کے مجھے لیکچر دینے آئے ہو؟'' ماریہ نے تنگ کر کہا تو املاک دھیمے سے ہنس دیا۔

''میں اسلام آباد کی ایک یونیورسٹی میں بطور لیکچرار تعینات ہوا ہوں۔ مگر اس سے بھی پہلے میں زیان سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکچرار شپ نے تو بہانہ فراہم کر دیا ہے۔ میں تو صرف زیان کو اس سود و زیاں کی بھیانک کھائی سے نکالنے آیا تھا۔ اسے صرف اتنا بتانے کہ اس کی ذات کو اندھیروں کے سپرد کرنے والے خود بھی بے اطمینان ہیں۔ ان میں سے ایک فریق تو اپنی ہیروں کی کان، جاہ و جلال، شان و شوکت کو چھوڑ کر ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہو گیا تھا جبکہ دوسرا فریق خود کو کھو کر کچھ نہ کچھ تو پا گیا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ میں سمجھی نہیں۔'' ماریہ ایک دم بے حد سنجیدہ لہجے میں بولی تھی۔ عنوہ نے اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتے اضطراب کو حیرانی سے دیکھا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرایا۔

''کچھ نہیں...... اب تو بالکل بھی نہیں۔ اگر زیان نے مشکل سے ہی سہی، اپنی زندگی کو ایک دفعہ پھر سنوارنا چاہا ہے تو ہمیں اور تمہیں کوئی حق نہیں اس کے زخموں سے کھرنڈ اتار دیں۔'' املاک نے گہری سنجیدگی سے کہا تو ماریہ بے چین سی ہو گئی۔

''تم دریہ کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے؟'' ماریہ نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو عنوہ کو یوں محسوس ہوا کہ گویا وہ سانس لینا ہی بھول گئی ہے۔

بہت دنوں سے زردہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ زرین اس سے کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر کہہ نہیں پا رہیں۔ زردہ نے سوچا وہ خود ہی ان کی مشکل آسان کر دے۔ مگر صبح سے ہی وہ گھن چکر بنی ہوئی تھی۔ پہلے رمیز کو آفس بھیجا، پھر کچن کا پھیلاوا سمیٹنے لگی۔ جب رمیز نے آفس سے فون کر کے اپنے کسی دوست کی فیملی کی آمد کا بتایا۔ یعنی ڈنر پر اہتمام لازمی کرنا تھا۔ کوئی کرنل صاحب اپنی نئی نویلی بیوی کے ہمراہ آ رہے تھے۔ کچن میں تین تین ڈشز سے نبرد آزما زردہ نے کوئی چوتھی مرتبہ زرین کو پلٹتے دیکھا تو پکار بیٹھی۔

''آپا! کچھ چاہیے؟''

''نن...... نہیں تو۔'' زرین نے پھیکے سے انداز میں کہا تو زردہ چونکی۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی اور قدرے جھجکتے ہوئے اس کے قریب آ گئی۔

''زردہ! میں نے جو تمہیں ہفتہ بھر پہلے برا بھلا کہا ہے، اس کی معذرت چاہتی ہوں۔ تمہاری خاموشی اور آنسوؤں نے مجھے احساسِ گناہ میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس حالت میں تمہیں ذہنی اذیت سے دوچار کیا ہے میں نے...... پلیز مجھے معاف کر دو۔ دراصل میں نے بہت کم عمری میں ہی ایسے تکلیف دہ حالات کا سامنا کیا ہے کہ میرے اندر تک تلخی اُتر آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی اتنی اچھی ماں سے بھی بدکلامی کر جاتی ہوں جنہوں نے ہمیں صرف جنم نہیں دیا لیکن پیدا کرنے والی ماں سے بھی زیادہ محبت دی ہے۔ دراصل شادی کے بعد......''

زرین بھرّائی آواز سے سب کچھ کہتی چلی گئی تھی جبکہ زردہ نے آپا کو ساتھ لگا کر خود بھی آنسو بہانا شروع کر دیئے تھے۔ آپا کے دکھ اس کے دل پر دستک دے رہے تھے اور

دور کھڑی شگفتہ بیگم کو اپنے انتخاب پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ انہیں لگا کہ تمام تر زرین کی تلخ کلامیوں اور رمیز سے زروہ کی شادی کے دوران اس کی جھڑپوں کا انعام مل گیا ہے۔

اور ادھر زروہ، آپا کو مطمئن کرنے کے بعد آنسو صاف کرتی پچھلے ہفتے ان کے ساتھ لڑائی میں اپنی خاموش جنگ کو شاباش دے رہی تھی۔ بعض دفعہ خاموشی ہمیں وہ کچھ دے دیتی ہے جو ہم زبان سے مانگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

رمیز کی محبت، ساس کی توجہ اور اہمیت کے باوجود اس کے دل میں ایک چبھن سی تھی۔ آپا اسے ناپسند کرتی ہیں یہ بات اسے بے اطمینان رکھتی تھی۔ مگر آج وہ پورے دل کے ساتھ خوش ہو رہی تھی۔ آج اس کے بنائے کھانے پر، ڈریسنگ پر اور چھوٹی موٹی گھریلو باتوں پر آپا نے کوئی تنقید نہیں کی تھی۔ رمیز گھر کے خوشگوار ماحول اور آپا کو ہنستے دیکھ کر حیران ہوا اور پھر زروہ کے کان میں سرگوشیانہ بولا۔

”لگتا ہے آپ نے میدان مار ہی لیا ہے۔“

اور زروہ سوچ رہی تھی کہ امی کے پڑھائے سبق اصل زندگی کا حسن اور زیور تھے اس نے ان تمام نصیحتوں، ماں کی انمول باتوں کو گرہ سے باندھ کر انہیں اگلی نسل میں منتقل کرنے کے لئے ذہن میں بھی محفوظ کر لیا تھا۔

حسنِ اخلاق، نیکی، بھلائی، رحم دلی، شفقت یہی تو اصل جہیز ہوتا ہے جو ہر ماں کو چاہئے کہ وہ اپنی بیٹی کو دے کر رخصت کرے۔ تھوڑی سی تکلیف کے بعد عمر بھر کا سکھ اس کا نصیب خود بخود بن جائے گا۔

رمیز نے اس گھر میں اس کی پہلی رات کے آغاز میں ہی بہت کچھ باور کروا دیا تھا۔ اسے اپنی بہن اور اس کے بچوں سے قلبی اور جذباتی لگاؤ تھا۔ جبکہ ماں سے والہانہ عقیدت۔ اس نے زروہ سے کہا تھا کہ وہ نومیہ اور ثنا کا رول پلے نہ کرے۔ اگر اس نے ویسا کرنے کی ذرہ بھر بھی کوشش کی تو پھر اس کا ٹھکانہ یہ گھر نہیں ہوگا۔ اور زروہ اس محبت بھری چھاؤں سے نکل کر اپنی ماں کے گھر نہیں جانا چاہتی تھی اور نہ ہی اپنی ماں کو کسی اور عظیم صدمے سے دوچار کرنا چاہتی تھی جن کا دل پہلے ہی اولاد کے دکھوں سے گھائل تھا۔ ایک ہفتہ پہلے زرین نے ایسے ایسے توہین آمیز الفاظ اس کے بارے میں اور سنیہ کے متعلق کہے تھے کہ زروہ کے پورے وجود کے پرخچے اُڑ گئے۔ اس نے اتنی ذلت کا کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔

اگر زرین کے مقابل کوئی اور ہوتی تو شاید رمیز کا ساتھ نہ پا کر کب کی

آشیانے کو کم عقلی کی بنا پر چھوڑ کر جا چکی ہوتی۔ مگر زروہ نے بہت زیادہ ہمت، صبر اور برداشت کا درس اپنی ماں سے وراثت میں لیا تھا۔ اس کی ذات کو جب تک آپا رگیدتی رہیں، وہ کمال ہمت اور ضبط کا دامن تھامے خاموشی سے ان کی لعن طعن سنتی رہی مگر جب بات کردار اور سنیہ کے بے داغ وجود تک پہنچی تو اس سے مزید ہمت کا مظاہرہ نہیں ہو پایا تھا۔ وہ ایک دم صدمے کی شدت سے پھٹ پڑی۔

”آپا! آپ کے الزام بے بنیاد ہیں۔ سنیہ کا اس قصے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ میں اپنی بہن کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

”خوب جانتی ہوں میں ان آوارہ لڑکیوں کے لچھن۔ بو بو بن کر لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ڈھنگ رچاتی ہیں۔ تمہیں اگر خوش قسمتی سے اچھا گھر مل گیا ہے تو ضروری نہیں تمہاری دوسری بہنیں بھی اونچے محلوں کے خواب دیکھنے لگیں۔ پہلے اپنی اوقات دیکھ لو۔ اس گندے محلے اور بوسیدہ مکان میں کون شہزادہ گلفام آئے گا؟ یہ تو میری بھولی ماں کی آنکھوں پر سادگی اور شرافت کی ایسی پٹی بندھی ہے کہ وہ تم لوگوں کا اصل چہرہ دیکھ ہی نہیں سکیں۔ میں جانتی ہوں تم سب کتنی شریف اور کتنے پانی میں ہو۔“

زرین نے تنفر سے کہا اور اپنی دھونکنی کے مانند چلتی سانسوں کو ہموار کرنے لگی۔ وصی کے کمرے میں جانے سے پہلے وہ زروہ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہ رہی تھی، جس کا موقع اسے امی کے کمرے میں جانے کے فوراً بعد میسر آ گیا تھا اور اب وہ زروہ کے زرد متغیر چہرے کو بڑے تفاخر کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔

”آج آپ مجھ پر میری اوقات واضح کر دیجئے۔“

اس نے انتہائی غصے کے عالم میں بھی ادب و احترام سے پلو تہی نہیں کی تھی۔ اس کے لہجے میں نرمی اور حلاوت برقرار تھی۔

”بظاہر تم سب بہت نیک نظر آتی ہو؟“ زرین نے معنی خیزی سے کہا تو وہ ایک دم جلبلا اٹھی۔

”آپ کی مبہم گفتگو کا آخر مقصد کیا ہے؟“

”مقصد بھی واضح کر دیتی ہوں۔“ اس نے جان بوجھ کر زروہ کی بے بسی اور ہلکورے لیتے اضطراب کو دیکھ کر مزا لیا۔

”سنیہ اور وصی کا رشتہ کسی صورت نہیں ہو سکتا۔ ہم لوگ مزید تمہاری ماں کے فریب میں آنے والے نہیں۔ اچھی طرح اپنی بہن کو بھی سمجھا دینا۔“ زرین کا انداز آگ لگانے

والا تھا۔ زروہ کو لگا، وہ پورے قد سے ڈھے گئی ہے۔

''میں خود بھی نہیں چاہتی کہ میری معصوم بہن کو ناقدرے لوگوں کا ساتھ ملے میں وہ حس ہی نہیں پائی جاتی آپا! جو نیک اور بد میں تمیز کر سکے۔''

''ایسی فلسفیانہ گفتگو کر کے تم رمیز کو قائل کیا کرو۔ یقیناً وہ تمہاری لچھے دار میں اُلجھ کر میرے سامنے کھڑا ہو جائے گا۔''

وہ ابھی تک اسی بات پر سلگ رہی تھی کہ رمیز نے آخر کیوں اپنی سالی کا نام کے ساتھ لیا ہے۔ اسے پختہ یقین تھا کہ زروہ نے ہی رمیز سے اپنی بہن کے لئے بات کرنے کو کہا ہے۔ لہٰذا زرین کے تمام غصے کا رخ خود بخود زروہ کی طرف مڑ چکا تھا او زرین کے لفظوں کے تیر اس کے دل میں پیوست ہو رہے تھے۔

''تمہاری بہن سارہ کے بھی رنگ ڈھنگ بدلے بدلے لگ رہے ہیں۔ احتیاط برتنا۔ ورنہ ایک مرتبہ پھر ناکامی کی کالک چہروں کو سیاہ کر دے گی۔'' زرین پھنکار کر کہا۔

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟'' زروہ پھٹ پڑی۔

''تمہاری ایک کزن گھر سے بھاگ گئی تھی نا؟'' زرین نے بڑی معصومیت سے پوچھا تھا۔ زروہ کو یوں لگا گویا ایک پل میں ہی اس کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی ہے۔

''ایک لڑکی کا انتہائی قدم پورے خاندان کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ شکر کرا تمہارا رشتہ اچھی جگہ ہو گیا ہے۔ تم ایک عزت دار خاندان کی بہو ہو۔ ورنہ ایسی لڑکیاں جو اپنے مفاد سوچ کر گھر سے بھاگتی ہیں ان کے پچھلوں کو تمام عمر اُن کی کرنی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔''

آپا اس کے بے داغ وجود پر کیچڑ اچھال کر اور اس دکھتے پس بھرے زخم پر نمک چھڑک کر چلی گئی تھیں جس نے تاحیات یوں ہی تکلیف دیتے رہنا تھا۔ جس پر کسی کا کوئی اثر نہیں ہونا تھا۔ یہ وہ گھاؤ تھا، جسے کسی کی مسیحائی سے بھرنا نہیں تھا، تا زندگی دینا تھا۔ اذیت دینی تھی۔

(......❁......)

'یہ دریہ نہ جانے تھی کون۔ جس کے بارے میں اس کے اردگرد کے تمام جانتے تھے۔ اور ایک وہ ہی بے خبر تھی۔' اسے اپنی ''بے خبری'' پر رہ رہ کر تاؤ آ رہا

کوئی بھی شخص اس راز سے پردہ اٹھانے کو تیار نہیں تھا، جو عنوہ کے نزدیک کوئی ایسی تلخ حقیقت تھی جس کا ذکر کسی کے لبوں سے اس نے ابھی تک نہیں سنا تھا۔ آخر کوئی تو ایسی بات ضرور تھی، جس کی پردہ پوشی کی جا رہی تھی۔

'زیان نے کیوں اپنی زندگی کے ان پہلوؤں کو مجھ سے پوشیدہ رکھا ہے؟ کیا وہ مجھ پر اعتبار نہیں کرتا؟ اسے مجھ پر اعتماد نہیں؟ اسے کون سا خوف لاحق ہے؟ شاید یہی کہ میں اسے چھوڑ نہ دوں؟ یا پھر وہ ایک مرتبہ پھر توڑ پھوڑ کا شکار ہونے سے خوف زدہ ہے؟ اگر میں اسے اپنے اعتماد میں لوں اور وہ مجھ پر بھروسہ کر کے اپنے ماضی کے پوشیدہ رازوں سے پردہ اٹھا دے تو یہ بہتر طریقہ ہے۔ اگر میں کسی اور سے حقیقت معلوم کروں گی تو مجھے بہت دکھ ہو گا۔

مان لو عنوہ! کہ تم زیان کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہو۔ وہی زیان جو تمہاری کرپٹ ماں کا انتخاب ہے۔ وہی زیان جو تم سے عشق کا دعویٰ کرتا ہے اور جو دھیرے دھیرے تمہارے دل کے تمام دریچے کھول کر اس پر قابض ہو چکا ہے۔' اس نے نم آنکھوں کو چپکے سے صاف کیا۔

زیان دو دن پہلے بارباڈوس فلائی کر گیا تھا۔ مہینے میں دو دو تین تین مرتبہ اسے بیرون ملک جانا پڑتا تھا۔ مگر عنوہ سے شادی کے بعد اس نے ملک سے باہر جانا کم کر دیا تھا۔ اب حسام ہی زیادہ تر ابراڈ کے ٹورز اپنے ذمے لے چکا تھا۔

وہ یوں ہی بے ارادہ چلتی ہوئی پہلے لاؤنج میں اور پھر گول زینہ گھوم کر اسٹڈی روم میں آ گئی۔ پہلے اس نے نمازِ ظہر ادا کی اور پھر کمپیوٹر آن کر کے زیان کی میل چیک کرنے لگی۔ زیان نے تو نہیں البتہ ممی نے اسے یعنی عنوہ کو ای میل بھیجی تھی۔ عنوہ حیرت سے آنکھیں پھیلائے کمپیوٹر اسکرین کو کتنے ہی پل دیکھتی رہی تھی۔ گویا یقین کرنا چاہ رہی تھی کہ آیا یہ اس کی ممی کا نام ہی لکھا ہے یا پھر نظر کا دھوکا ہے۔

''میری پیاری بیٹی عنوہ!'' اس کی نگاہیں آغاز میں ہی الجھ گئی تھیں۔ ممی اور عنوہ کو اس طرح مخاطب کریں۔ ایسا دن تو قیامت تک نہیں آ سکتا تھا۔

وہ ماؤں کی اس قسم میں سے تھیں جنہیں اولاد زندگی کا سب سے بڑا جھنجٹ معلوم ہوتی ہے۔ وہ اولاد کو اپنی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی تھیں۔ اسے تیئیس سالوں میں ایک بھی ایسا دن، لمحہ، پل یاد نہیں آ رہا تھا جب ممی نے اسے ''میری پیاری بیٹی'' کہہ کر مخاطب کیا ہو۔

''میں آج تمہیں بہت سے تلخ سچ بتاؤں گی۔ اس آگہی کے عذاب کو تمہارے حوالے کرنا، تمہیں ذہنی اذیت سے دوچار کرنا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر اب حالات کچھ اور ہیں۔ تمہارے جیسی بیٹیوں کو ہمارے جیسے گھرانوں میں پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ میں ایک ایسی بدبخت عورت ہوں، جس کی کوکھ سے عنوہ نے جنم لیا۔ اللہ نے صرف تجھے شکل وصورت میرے جیسی دی ہے، مگر تمہاری تمام تر عادتیں، مزاج اپنے باپ جیسا ہے۔

تمہیں ایسے تو ہر بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں تمہیں آغاز سے بتاتی ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہیں کچھ اور بتا دوں۔ میری انگلیاں اس وقت حرکت نہیں کر سکتیں، اس کے لئے مجھے مس ٹینا کی ہیلپ لینا پڑی ہے۔

میں اس وقت فرانس کے شہر بولیس کے ایک معمولی سے ایریا میں موجود تین کمروں کے فلیٹ میں زندگی کی آخری گنی چنی سانسیں پوری کر رہی ہوں۔ آج سے ڈیڑھ پہلے پیرس سے واپسی پر ''بولیس'' میں واقع سینٹ پیری کے گرجا گھر کے سامنے گزر رہی تھی، جب ایک کار ایکسیڈنٹ میں دونوں ٹانگوں سے محروم ہو کر محتاجی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔ اس کے علاوہ میں ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو چکی ہوں جس کا ذکر تمہارے سامنے کرتے ہوئے میرا سر شرمساری سے جھکا ہوا ہے۔ مگر یہ تو معمولی سی بات ہے۔ آگے انکشافات تمہیں مجھ سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیں گے۔

کینسر کے علاوہ میرے پیٹ کے اوپر عجیب سی ہیئت کا پھوڑا بن گیا تھا۔ میں بداحتیاطی کی وجہ سے پھیلتا چلا گیا۔ جب ڈاکٹرز کو دکھایا تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ ڈاکٹرز کی تشخیص کے مطابق یہ لیپریسی (کوڑھ) کا مرض تھا۔ تمہیں میری بیماری کے متعلق جان کر کراہت محسوس ہو رہی ہو گی...... میرا وجود گندگی کا ڈھیر ہے جس پر جتنا کوڑا پھینکیں اتنی اذیت کم ہو گی۔ کفارہ ادا کرنے کا وقت گزر چکا ہے، اب صرف سزا پانے کے عمل سے گزر رہی ہوں۔

میں اپنی زندگی کے ابتدائی خوشگوار ایام کا بتا رہی تھی۔ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد میں بوریت کا شکار تھی۔ چونکہ ممی پاپا تو تھے نہیں اور کوئی قریبی عزیز بھی نہیں تھا سوائے ایک پھوپھی کے۔ پاپا نے لو میرج کی تھی، جس کے نتیجے میں وہ اپنی فیملی سے کٹ چکے تھے۔ لیکن ان کی ڈیتھ پر میری ایک پھوپھی آئی تھیں۔ ان کے ساتھ نوجوان لڑکا بھی تھا۔ بہت ہی بدصورت..... سانولا سا رنگ، درمیانہ سا قد، اُڑے

سے حواس والا یہ لڑکا جس پر دوسری نگاہ ڈالنے کو جی نہیں مانتا تھا۔ یہ ہاشم فریدی تھا۔ میری پھوپھی شاہ قدوس کا دوسرا بیٹا...... تمہارا حقیقی باپ۔ بہت ہی کم گو، قدرے دبو سا، صوم وصلوٰۃ کا پابند۔ اس وقت ہاشم دو مرتبہ حج کر چکا تھا اور دونوں مرتبہ اپنی ماں کو لے کر خانہ کعبہ کی زیارت کرنے گیا تھا۔

پھوپھی اماں مجھے اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی تھیں مگر میں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ تو شکل سے ہی ملانی لگ رہی تھیں۔ میرا اور ان کا ساتھ ناممکن ہی تھا۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے، جب میرا پھوپھی اماں کے بڑے بیٹے سے تعارف ہوا۔ وہ اپنی ماں کے کہنے پر میرا حال پوچھنے کی غرض سے آیا تھا۔ پھوپھی اماں نے میرے لئے بہت سے تحائف بھیجے تھے۔

وہ عبیث فریدی تھا، جسے دیکھ کر میں پہلی نظر میں ہی دل ہار بیٹھی تھی۔ وہ بہت حسین تھا۔ بہت ہی خوش مزاج۔ ہاشم اور عبیث میں مشرق اور مغرب جتنا فرق تھا۔ پھوپھی اماں ایک بہت بڑے جاگیردار کی بیوی تھیں۔ اسلام آباد سے کچھ ہی آگے ان کا خوب صورت گاؤں تھا، جس سے انہیں عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ ہاشم اور اس کی ماں کی عادتیں اس قدر ملتی تھیں جبکہ عبیث ان سے بہت مختلف تھا۔ دونوں ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ عبیث شہر میں اپنے بزنس کو پھیلانے میں مصروف تھا جبکہ ہاشم کو اپنی آبائی زمینوں سے دلچسپی تھی۔ اس نے زراعت کے حوالے سے تعلیم حاصل کی تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ پھوپھی اماں کو عبیث سے زیادہ ہاشم سے محبت تھی۔ عبیث ان کے نزدیک بگڑا ہوا نوجوان تھا۔

عبیث کی اور میری بے تکلفی ہمیں ایک دوسرے کے بہت قریب لے آئی تھی۔ وہ کوئی غیر نہیں، میری پھوپھی کا بیٹا تھا۔ میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ عبیث بھی دل و جان سے رضامند تھا مگر ایک عجیب مسئلہ یہ تھا کہ عبیث اس شادی کو گھر والوں سے خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ کیوں؟ کس لئے؟ کیا وجہ تھی؟ یہ میں نے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مگر میں اپنے ارمان دل میں دبائے رکھنے والی نہیں تھی۔ میں نے شادی کی شاپنگ کے ساتھ ساتھ دور دور تک اپنے دوستوں اور ممی کے رشتے داروں کو انوائٹ کیا تھا۔ عبیث نے مجھے ایک بھاری بھر کم چیک پکڑا دیا تھا اور میں دل کھول کر شاپنگ کر رہی تھی۔ ممی کے بعد بہت سے کرائسز کی وجہ سے میرے اندر دبی خواہشات کو روزن مل گیا تھا۔ میں بہت خوش تھی۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی صرف چند قدم کے فاصلے

پر تھی اور دوسرا عبیث کی مالی پوزیشن دیکھ کر بھی میں مطمئن تھی۔ یعنی میں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔

ایک بڑے ہال میں ہماری شادی کی ارینج منٹ تھی۔ لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہال میں ہنسی، قہقہوں اور میوزک کے شوز میں کچھ ناگوار آوازیں بھی اُبھری تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد یہ شور میرے کانوں تک آن پہنچا۔

میں ڈریسنگ روم میں موجود تھی اور آوازوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی جب ایک دم دھاڑ سے دروازہ کھلا۔ پھوپھی اماں کو دیکھ کر میرے حواس معطل ہو گئے تھے۔ ان کے پیچھے ہی حسین مگر سادہ سی اُداس آنکھوں والی لڑکی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی انگلی تھامے ایک بچہ بھی تھا۔ اور کچھ ہی دیر بعد منظر بدل گیا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ پھوپھی اماں اس لڑکی سے میرا تعارف کروا رہی تھیں اور میرے سر پر آسمان آن گرا۔

''یہ فاخرہ ہے۔ عبیث کی بیوی۔ اور یہ میرا پوتا، زیان۔'' انہوں نے شعلہ بار نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا کسی نے میرے حلق پر چھری رکھ کر بے دردی سے چلا دی ہے۔ میری چاہتوں کا محل زمین بوس ہو چکا تھا۔

''سارے خاندان والے تھو تھو کر رہے ہیں۔ کالک مل دی اپنے عزت دار باپ کے منہ پر اور گالی بنا دیا اپنی عبادت گزار ماں کو۔ اپنے ساتھ ساتھ تجھے بھی خوار کر کے رکھ دیا ہے اس بے غیرت نے۔ مگر میں تجھے بھری محفل میں رسوا نہیں ہونے دوں گی میری بچی! اس کمینے نے تجھے دھوکے میں رکھا ہوگا یقیناً۔ پتہ نہیں اور کون سے پاپ دیکھنے ہیں میں نے اس کے۔ اللہ اٹھا کیوں نہیں لیتا مجھے۔'' وہ بھبک بھبک کر روتے ہوئے میری پیشانی چوم کر بولی تھیں۔ میں اس وقت جس ذہنی توڑ پھوڑ کا شکار تھی پھوپھی اماں جو کچھ کہہ رہی تھیں مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ عبیث نہ جانے کہاں چلا گیا۔ پھوپھی اماں روتی دھوتی باہر نکل گئی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد منظر پھر سے بدلا۔ دو تین بزرگ اندر داخل ہوئے۔ میرے سر پر چادر ڈال دی گئی۔ مولوی صاحب مجھ سے اجازت اور مرضی معلوم کر رہے تھے۔ پھوپھی اماں مجھے خود سے چمٹائے رو رہی تھیں۔

''یہاں سائن کرو۔'' کسی نے میرے ہاتھ میں قلم پکڑایا۔ میں نے ایجاب وقبول کا

مرحلہ خود فراموشی کے عالم میں طے کیا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے، وجود لرز رہا تھا اور میں بے ہوش ہو چکی تھی۔

جب میں نے ہوش کی دنیا میں قدم رکھا تب میری خوابوں کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ ایک بدصورت شخص کو میری زندگی کا ساتھی بنا دیا گیا۔ یہ حقیقت تسلیم کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے چیخ چیخ کر ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ میرے اندر نفرتوں کے چشمے اُبل پڑے۔

مجھے ہاشم فریدی سے اتنی نفرت تھی کہ میں نے کئی مرتبہ اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میری نفرتوں کے باوجود نہ جانے وہ کس مٹی کا بنا تھا۔ کبھی اس کے ماتھے پر ناگواری کی ایک سلوٹ بھی نمودار نہیں ہوتی تھی۔ وہ میرا خیال رکھنے کی اپنی سی کوشش کرتا تھا۔ جواباً میں اسے دھتکار کر رکھ دیتی۔ مجھے ہاشم سے نفرت تھی۔ اپنی پھوپھی سے نفرت تھی۔ فاخرہ سے نفرت تھی۔ مجھے ہر اس شخص سے نفرت تھی جو مجھے عبیث سے دور کرنے کا سبب بنا۔ میرے دل سے عبیث کا خیال مٹا ہی نہیں تھا کہ میں کسی اور طرف توجہ دیتی۔ میں نے زندگی کے سات قیمتی سال عبیث کی یاد میں جلتے گزار دیئے تھے۔ اور وہ ہاشم میرے پلٹ آنے کی خوش فہمی دل میں لئے نہ جانے کون سے معجزے کے انتظار میں تھا۔

ان سات سالوں میں بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ عبیث نے فاخرہ کو طلاق دے دی تھی۔ پھوپھی اماں کی زندگی میں وہ ایسا قدم اٹھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ فاخرہ ان کی بہت ہی پسندیدہ اور نیک سیرت بہو تھی۔

ایک لوئر مڈل کلاس گھرانے کی فاخرہ سے پھوپھی اماں کو نہ جانے کیوں اتنی اُنسیت تھی۔ عموماً مائیں بیٹوں کو اونچے گھرانوں میں بیاہنے کے خواب دیکھتی ہیں۔ مگر میری پھوپھی اماں اپنے حسین وجمیل بیٹے کے لئے گلی کا گند اٹھا لائی تھیں۔

میرے نزدیک دولت کا پیمانہ بھاری تھا اور شرافت اور نیکی کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ اس دوران ایک اور عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ فاخرہ طلاق کے بعد اپنے بھائی کے گھر جا چکی تھی۔ ایک دن وہ نہ جانے کس سے ہمارے گھر کا ایڈریس لے کر چلی آئی۔ وہ ہاشم سے ملنے کے لئے آئی تھی۔ اس کی گود میں صرف ڈیڑھ ماہ کا بچہ تھا۔ اس نے ہاشم کو بتایا کہ عبدالباری اس کی طلاق کے دو ماہ بعد پیدا ہوا ہے اور یہ کہ وہ عبدالباری کو عبیث کے حوالے نہیں کرنا چاہتی۔

فاخرہ اس لمحے ایک ایسی مجبور، بے بس اور حالات کی ستائی ماں لگ رہی تھی جو اپنے دل کا دوسرا ٹکڑا یوں دوسروں کے سپرد کرتے ہوئے خود پوری خالی ہو چکی تھی۔ وہ اس قدر تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی کہ ہاشم جیسا نرم دل بندہ خود بھی اس کے ساتھ آنسو بہانے لگا۔ اسے اپنے بڑے بھائی کے اس انتہائی قدم نے بہت رنجیدہ کئے رکھا تھا۔ وہ کئی کئی دن گم سم رہا۔ مگر اپنی ازلی بزدلی کی وجہ سے عبیث سے کچھ بھی باز پرس نہ کر سکا۔ حتیٰ کہ وہ عبیث سے اتنی سی بات بھی نہیں کہہ سکا تھا کہ زیان کو اس کی ماں سے کبھی کبھار ملنے دے۔

فاخرہ، عبدالباری کو ہاشم کے حوالے کر کے چلی گئی تھی۔ جاتے ہوئے صرف کہا۔

”ہاشم بھائی! بہت مجبور ماں ہوں۔ اپنے دونوں بچوں کو خود سے دور کر دیا ہے عبیث، زیان کو لے کر ملک سے باہر چلا گیا ہے اور عبدالباری میں آپ کی گود میں ڈال کر جا رہی ہوں۔ میرے مزدور پیشہ بھائی کے پاس میرے لئے روٹی ضرور ہے مگر میرے بچے کو رکھنے کے لئے وہ تیار نہیں۔ ان کی اولاد صرف دو بیٹیاں ہیں۔ کمانے والا اور اتنے کھانے والے۔ وہ باری کو یتیم خانے بھجوانے لگے تھے مگر التجاؤں پر نرم پڑ گئے۔ میں اسے آپ کی اور اللہ کی امان میں دے کر جا رہی ہوں۔ کی شخصیت اپنے جیسی بنائیے گا۔ اسے عبیث فریدی نہ بننے دیجئے گا۔ جب میں ز کے کسی موڑ پر اپنے بیٹے کو دیکھوں تو میرا سر فخر سے بلند ہو جائے۔ زیان اور باری جدائی کی کسک تاحیات ناسور بن کر چاٹتی رہے گی مگر ان حالات میں مجھے دوسرا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر سینے سے لگا لیجئے گا۔ یہ آ کے سگے بھائی کی اولاد بھی ہے۔“

فاخرہ چلی گئی تھی۔ شکستہ قدموں سے۔ یہی شکست تو میں دیکھنا چاہتی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا، میں جھوموں، ناچوں.......خوب اونچے اونچے قہقہے لگاؤں۔ مگر فاخرہ کے چند الفاظ میری تمام خوشی کو ملیامیٹ کر گئے تھے۔

”عبیث ملک سے باہر چلا گیا ہے زیان کو لے کر۔“

یہ حقیقت مجھ سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ پھر جب یقین ہو گیا کہ واقعی وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے تو مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ انہی دنوں میں نے کرنا شروع کر دی تھی۔ مجھے اس دنیا سے نفرت ہو چلی تھی۔

مزید کچھ سال چپکے سے کھسک گئے۔

میں نے دل کو خوش کرنے کے لئے بہت سے بہلاؤں میں خود کو بھی بہلا لیا تھا۔ میں نے کبھی بھی عبیث کو برا بھلا نہیں کہا تھا۔ اس نے میرے ساتھ فریب کیا تھا مگر میں نے اس کے تمام گناہ خود بخود معاف کر دیئے تھے۔ وہ میرا محبوب تھا، میں نے اس کو بے تحاشا چاہا تھا۔ اگر عبیث نہ ہوتا تو میں ہاشم کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ مگر پھر وہی بدصورتی کی پھانس۔

انہی دنوں عبیث کے واپس آنے کی خبر میرے لئے خوشیوں کا پیامبر بن کر آئی تھی۔ مگر اس دفعہ بھی میں تہی داماں رہی۔ وہ کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو چکا تھا۔ میں ایک دفعہ پھر تہی داماں رہ گئی تھی۔

آج سوچتی ہوں تو خود سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت کی احمقانہ جذباتی محبتیں۔ مگر مجھے پھر بھی ہدایت نہیں آئی تھی کیونکہ میں ہدایت پانا ہی نہیں چاہتی تھی۔

میرے ممی پاپا نے مجھے بہت ناز و نعم سے پالا تھا۔ میری ہر خواہش دن کہے پوری کی۔ پاپا اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ہم ساری زندگی سرکاری بنگلوں میں رہے۔ پاپا نے اپنا گھر بنایا ہی نہیں تھا۔ عیش و عشرت میں بچپن اور جوانی گزری۔ کبھی دکھ اور صدمہ چھو کر نہیں گزرا تھا۔ اب جو یہ دل لگانے کی سزا نہ چاہتے ہوئے بھی روگ بنی چاٹ رہی تھی۔ میرے لئے عبیث کا رویہ بہت تکلیف دہ تھا۔ اس نے مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اکثر پارٹیز میں وہ یوں اجنبی بن کر گزر جاتا گویا جانتا ہی نہ ہو۔ میرے لئے یہ صورت حال انتہائی اذیت ناک تھی۔

ان دنوں میں بہت رویا کرتی تھی۔ اس طرح ایک جذباتی لمحے نے مجھے ہاشم کے سامنے پسپا کر دیا اور تم اس کے لبوں کی دعا بن کر ہماری تلخ ترین زندگی کا حصہ بننے آ گئیں۔ میں آج تمہارے سامنے ہر اعتراف کر لینا چاہتی ہوں۔ مجھے تمہاری آمد کی ذرہ بھر خوشی نہیں تھی۔ اور ہاشم کو دیکھ کر میرے اندر آگ بھڑک اٹھتی تھی۔

اگر اس رات پھوپھی اماں اور ہاشم نہ آتے تو میں اس وقت عبیث کے ساتھ ہوتی۔ میرے اندر سے یہ کانٹا کبھی نکلا ہی نہیں تھا۔

وہ عبدالباری اور تم میں مگن تھا۔ تم دونوں میں اس کی جان بند تھی اور میری جان ہاشم کو مسرور دیکھ کر جلتی رہتی تھی۔

پھر ایک دن میں اپنی سوسائٹی کی دیگر ایسی ہی ذہنی طور پر ٹوٹی پھوٹی عورتوں کی

طرح ڈرنک کر کے گھر آئی تو ہاشم کے ضبط کے تمام تر پیمانے چھلک پڑے۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا، مجھے خوب مارا اور میں زخمی شیرنی کی طرح بس دھاڑتی رہی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے خلع لینے کا فیصلہ کر لیا۔

ابھی ہماری علیحدگی نہیں ہوئی تھی۔ یہ اس سے کچھ دن پہلے کی بات تھی جب ملک قاسم کی پارٹی میں کئی پیگ پینے کے بعد میں بالکل نیم بے ہوش ہوگئی تھی اور تمام رات ادھر ہی پڑی رہی اور اپنی نسوانیت کے پندار، اپنی انا کے بت کو پاش پاش کئے جب میں نے گھر میں قدم رکھا تو ہاشم میری حالت دیکھ کر حد درجہ متوحش رہ گیا اور اس وقت نہ جانے میری ذہنی رو کیوں اس قدر بہک گئی تھی کہ میں نے تمام تر اعتراف بے خو[د] سے کر لئے۔ شاید ہاشم کو میرے اس قدر گر جانے کی توقع نہیں تھی۔ مگر اس وقت نے کچھ نہیں کہا تھا۔

اگلی صبح خاموشی سے آنگن میں اُتری تھی۔ تازہ اخبار لان میں پڑا تھا اور اس ا[خبار] میں موجود میری اور ملک قاسم کی تصویریں دیکھ کر ہاشم گویا پاگل ہی ہو گیا۔

مجھے آج بھی اس کی وحشت سے پھٹی پھٹی آنکھیں یاد آتی ہیں تو میرا خود کو ختم لینے کو جی چاہتا ہے۔ مگر اپنے ہاتھوں سے خود کو مارنا بہت مشکل کام ہے۔ میرے عورتیں ایسے کام نہیں کر سکتیں۔ مگر ہاشم نے یہ کام کر دکھایا تھا۔ اس نے خودکشی کر اگر بروقت اسے ٹریٹ منٹ نہ ملتا تو اس کی زندگی بچنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہوش میں آنے کے بعد پہلا کام اس نے مجھے طلاق دینے کا کیا۔ میری دلی خوا[ہش] پوری ہو چکی تھی۔ میرے دل اور ذہن سے ایک بھاری بوجھ ہٹ گیا۔

''تم سوچ رہی ہو گی کہ ہاشم سے اتنی نفرت کے باوجود میں نے اتنے سال کے ساتھ کیوں گزارے۔ اس میں بھی میرا ذاتی مفاد شامل تھا۔ جب اتنے خسارے نقصان اپنے حصے میں لے لئے تھے تو آخری فائدہ میں کیوں کر چھوڑتی۔

نکاح کے وقت پھوپھی اماں نے جو کچھ میرے تحفظ کے لئے مجھے تحریری طور کر دیا تھا، اس میں یہ بات واضح لکھی تھی کہ اگر میں خود سے طلاق لیتی یعنی کورٹ ذریعے تو پھر مجھے فیکٹری اور کوٹھی تو دُور، بینک بیلنس میں سے بھی کچھ نہ ملتا۔

اب میری دیرینہ خواہش بھی پوری ہو گئی تھی یعنی کہ طلاق مل چکی تھی اور فیکٹری کوٹھی کے ساتھ لاکھوں کا بینک بیلنس بھی۔

کورٹ کے فیصلے کے مطابق تم ہمیشہ کے لئے میری کسٹڈی میں آ چکی تھیں۔

نے تمہیں لینے کی خاطر عدالت میں کیس دائر کیا تھا، جبکہ میں نے صرف اسے شکست دینے کی خاطر تمہیں پانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

ایک رات چپکے سے ہاشم، عبدالباری کو لے کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ شاید اپنی آبائی زمینوں پر۔ میں نے پھر کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں نے خود کو مصنوعی بہلاووں سے بہلا لیا۔ میری زندگی کا محور پارٹیز، سیاحت، ہنگامے اور ہلا گلا رہ گیا۔

پھر ایک دن اچانک میری فاخرہ پر نگاہ پڑ گئی۔ اس کے ساتھ دو بچیاں تھیں۔ درمکنون اور رانیہ۔ یہ دونوں اس کی بھتیجیاں تھیں۔ نہ جانے کیا سوچ کر میں نے اپنی گاڑی اس کے رکشہ کے پیچھے لگا دی۔

اندرون شہر لاہور کی گلیوں کے آغاز نے مجھے حد درجہ بد مزا کیا تھا مگر پھر بھی میں اس کے پیچھے نہ جانے کیا دیکھنے چلی آئی تھی۔

مولوی عبدالرحمٰن قریبی مسجد کے امام....... فاخرہ کے دوسرے شوہر، پانچ بچوں کے باپ۔ اس تعارف نے مجھے ایک پل کے لئے ضرور تکلیف سے دوچار کیا تھا۔

محلوں سے اٹھ کر وہ ایک مرتبہ پھر مشقت کی چکی میں پس رہی تھی مگر اتنی پُرسکون، اتنی مطمئن، اس قدر سرشار۔ اسے اطمینان میں دیکھ کر میرا اطمینان رخصت ہو گیا تھا۔

فاخرہ بے قراری سے عبدالباری کا پوچھ رہی تھی۔ میں اسے کیا بتاتی کہ مجھے تو خود پتہ نہیں تھا کہ عبدالباری اور ہاشم کہاں ہیں۔

وہ اتنی ذلتوں کے بعد نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ ایک مرد کو جب کوئی عورت ٹھکراتی ہے تو اس کی مردانہ انا بلبلا اُٹھتی ہے۔ ہاشم بھی تو ایک مرد تھا، جسے میں نے اتنی مرتبہ دھتکارا، اسے اتنا ذلیل کیا کہ وہ دنیا سے جی چرا کر نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا۔

ایک اور بات عنوہ! میں نے ہمیشہ تمہیں ہاشم سے متنفر کرنا چاہا ہے، مگر ہاشم بلاشبہ ایک نیک طبیعت، باکردار اور بہترین شخص تھا جو خوش قسمتی سے بن مانگے مجھے مل گیا تھا۔ مگر میں نے اس کی قدر نہیں کی، اس کی محبت کو حُسن کے ترازو میں تولتی رہی۔

جس رات وہ اپنے ہی گھر سے شکستہ قدموں کے ساتھ نکلا تھا، اس رات میں نے [اسے] یہ باور کروا کر بھیجا تھا کہ تمہاری بیٹی بھی تم جیسے بدصورت انسان کو بطور باپ [ت]عارف کرواتے ہوئے شرمندگی محسوس کرے گی، جیسی شرمندگی میں اپنے سرکل میں [تم]ہیں متعارف کروا کر محسوس کرتی ہوں۔ اس کے بعد اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ [و]ہ اپنا سب کچھ ہار کر مجھے ایک نہ ختم ہونے والی سزا کے حوالے کر کے چلا گیا۔ اس

کیجانے کے بعد قدرت نے اس کی محبت میرے دل میں ڈال کر مجھے محبت کی ناقدری کی ایسی سزا دی کہ میں تمام عمر ایک پچھتاوے کی آگ میں جلتی رہوں۔ میں نے اس نارسائی کے غم کو بھلانے کی خاطر خود کو ہمیشہ کے لئے اندھی کھائی میں گرا دیا۔

جب پچھتاوے کے ناگ مجھے بہت ڈستے تھے تو میں بے تحاشا ڈرنک کرتی تھی۔

تمہارے لئے اپنی ماں کا ماضی کوئی قابل فخر نہیں ہے، مگر تمہارے اطمینان کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ تم ہاشم فریدی جیسے نیک، متقی اور پرہیزگار شخص کی بیٹی ہو۔

تم اس سوسائٹی کی لڑکیوں جیسی نہیں۔ تم اس ماحول میں قطعاً ان فٹ تھیں۔ لوگ پیٹھ پیچھے مجھے کہتے تھے کہ امبرین کی بیٹی نہ جانے کس پر ہے اور میرا دل فخر کے ایک احساس سے جھوم اٹھتا تھا کہ تم ہاشم فریدی کی بیٹی ہو۔ اس کی طرح دھیما بولنے والی میٹھی طبیعت اور اعلیٰ خیالات کی مالک۔

میرے اندر ایک اور احساسِ زیاں بھی لمحہ لمحہ مجھے ڈستا رہتا ہے کہ میں نے تمہارا شادی تمہاری چاہ کے بغیر کر دی۔ نجانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ زیان تمہار لئے بہت سوفٹ ایموشنز رکھتا ہے اور شاید اس لئے بھی کہ میں تمہارا مستقبل محفوظ د چاہتی تھی۔ شاید اس لئے بھی کہ تمہارے تایا عبیث فریدی کا وہ بہت لاڈلا بیٹا تھا۔ لئے بھی کہ وہ تمہیں بہت چاہتا تھا۔ اس کی چاہت کی پیمائش بھی میں نے اپنے طر سے کی تھی۔

تم سمجھو گی کہ میں نے تمہاری شادی ایک بزنس ڈیلنگ کے تحت کی ہے۔ ہرگز عنوہ! میں تو صرف زیان کے دل میں موجود تمہاری محبت کا اندازہ لگانا چاہتی تھی جو فیصد کامیاب رہا۔

اس کا بزنس بہت سے ملکوں میں پھیلا ہوا ہے اور سب سے زیادہ پرافٹ ایبل کی پیرس میں موجود گلاس فیکٹری اور ہوٹل تھا........ جسے میں نے قانونی طور پر کرنے کے لئے کہا تو وہ خاموشی سے اس ڈیل پر رضامند ہو گیا۔ بزنس مین خسارے کا سودا نہیں کرتا۔ اس کے دوستوں، حسام نے، سب نے اسے بہت کی کوشش کی تھی مگر اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ مجھے یہی لگا، تمہارے لئے بہترین انتخاب

اگرچہ شروع میں میرا ازلی لالچ اور مفاد عود کر آیا تھا، مگر میں یہاں آتے فیکٹری اور اپنا تمام تر بینک بیلنس پاکستان میں موجود ٹرسٹ کو ٹرانسفر کر چکی ہوں

میں نہ اچھی بیٹی تھی، نہ بیوی اور نہ ماں........ مجھے لگتا ہے کہ شاید اللہ

معاف نہیں کرے گا۔ مگر اس کی رحمت سے مایوسی گناہ ہے۔ اور میں ناامید ہو کر مزید گناہگار نہیں ہونا چاہتی۔

مجھے پتہ چلا تھا کہ تم کری ایشن کے مراحل سے گزر رہی ہو۔ تمہاری ماں کے لئے یہ خبر اس جلتی بجھتی زندگی میں اک پل کو ٹمٹمانے والے دیے کی مانند ہے۔ تم بہت اچھی ماں بنو گی، یہ مجھے یقین ہے۔ زیان اور تم دونوں ہی ایک ٹوٹے خاندان کے بچے ہو۔ مگر میری جان! اپنے آنے والے بچوں کو بہت اچھا، گھریلو اور محبت بھرا ماحول دینا۔ زیان کی کچھ عادتیں تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ہوں گی۔ وہ رفتہ رفتہ اپنی بری عادتوں کو ترک کر دے گا۔ اور رہا سوال رانیہ کے متعلق تو بیٹا! اس کہانی کی گہرائی میں اتر کر کیا کرو گی؟ کوئی بھی رانیہ تمہاری حیثیت تک نہیں پہنچ سکتی۔ جو تم ہو، وہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

زیان نے بھی بہت کچھ کھونے کے بعد تمہیں اور حقیقی خوشیوں کو پایا ہے۔ تم اس کے ساتھ کبھی بھی اُلجھنا مت۔ ایک دن وہ تمہیں تمام تر سچائی بتا دے گا۔ اور ہاں، اس نے رانیہ کے بارے میں بھی حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ تم حیران ہو گی کہ میں اتنی باخبر کیسے ہوں۔ تو میری جان! یہ جو زیان ہے نا، بہت مشکل آدمی ہے۔ اسے سمجھنا تقریباً ناممکن ہے۔ مجھ سے بے زاری اور کچھ کچھ نفرت کے باوجود وہ مجھے صرف عنوہ کی ماں سمجھ کر روز فون کرتا ہے۔ روزانہ میرے چیک اپ کے لئے ایک ڈاکٹر آتا ہے۔ مس ٹینا کو تنخواہ بھی زیان دیتا ہے۔

زیان مجھ سے بہت چڑتا تھا۔ شاید اس لئے بھی کہ میں اپنی ازلی حاسدانہ فطرت کی وجہ سے اکثر فاخرہ کے متعلق طنز کرتی رہتی تھی۔ وہ صرف عبیث کو جانتا ہے۔ اپنے باپ کو جس کے بارے میں زیان کی رائے کچھ اچھی نہیں۔ وہ فاخرہ کو نہیں جانتا کہ اس کی ماں کا کتنا بڑا ظرف ہے۔ اس نے پہاڑ جتنا صدمہ کیسے اپنے دل پر جھیل لیا۔ ایک ماں کے لئے اولاد سے جدائی کا فیصلہ موت کے برابر ہے۔ وہ عورت اپنی ہر آزمائش میں کامیاب رہی ہے۔ ایک بدکردار شوہر سے ہر طرح کا ظلم و ستم سہہ کر وہ صرف اپنے بچوں کے لئے ہی نباہ کرنا چاہتی تھی مگر اس کی قسمت بہت اچھی تھی جو عبیث نے خود ہی اسے چھوڑ دیا۔ اسے مولوی عبدالرحمٰن جیسا نیک شوہر اللہ کی طرف سے تحفے میں ملا تھا۔

اس سے کہنا اپنی دکھی، بے بس ماں کو اس کے ناکردہ گناہ کی اتنی بڑی سزا نہ دے۔

اور میری تمام گڈ وِشز عنوہ کے لئے۔ جو دنیا کی سب سے اچھی بیٹی ہے۔ ایسی ہی

بیٹیاں آنکھوں کا نور ہوتی ہیں۔ فرمانبردار اور اللہ کی رضا میں راضی ہونے والی، تقدیر کے فیصلوں سے ٹکرانے والے تمام عمر میرے جیسی زندگی گزارتے ہیں۔ اور اس زندگی سے موت اچھی ہے۔ اس سے پہلے کہ میری زندگی کے پچھتاوے تمہاری زندگی میں زہر گھولیں، جب میں نے حقیقت کو جان لیا تو خاموشی سے تم سے دور چلی آئی۔ اب کوئی تمہیں امبرین کے حوالے سے طعنہ نہیں دے گا۔

اگر تم اپنے باپ سے ملنا چاہتی ہو تو شاہ قدوس کی حویلی چلی جانا۔ وہاں فاخرہ کا عبدالباری بھی ہو گا۔ زیان کا چھوٹا بھائی۔ تم اسے فاخرہ کا پیغام دینا۔ وہ زیان نہیں ہے۔ ضرور اس کی پیاس کو سیراب کرنے آئے گا۔ یہ تاکید اس لئے کر رہی ہوں کہ بہر حال کچھ نہ کچھ فاخرہ کی موجودہ زندگی میں میرا بھی قصور نکلتا ہے۔ میرے حسد اور بغض نے اسے ان حالوں تک پہنچا دیا ہے۔ یا پھر میں ایک ماں کو تمہارے توسط سے اس کے بیٹے سے ملوا کر کم از کم ایک نیکی اپنے نامہ اعمال میں لکھوانا چاہتی ہوں۔ میری پیاری بیٹی! اپنی ماں کی آخری خواہش سمجھ کر اسے ضرور پورا کرنا۔ اور ہو سکے تو زیان کے دل پر چھائی بدگمانیوں کی دھول کو بھی صاف کرنے کی کوشش کرنا۔ نہ جانے کب سانسوں کا یہ سلسلہ ٹوٹ جائے۔ اب ویسے بھی جینے کی خواہش نہیں رہی اور اس طرح جینے کی تو بالکل بھی نہیں۔

جب تم ہاشم سے ملنے جاؤ گی تو تمہیں کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہو گی۔ وہ تمہاری صورت دیکھ کر تمہیں پہچان لے گا۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔

میں ہاشم سے معافی مانگنے کے خود کو قابل نہیں سمجھتی۔ البتہ تم سے ضرور التجا کروں گی کہ اپنی بدبخت ماں کو معاف کر دینا۔ تمہاری بدنصیب ماں!

امبرین۔"

ضبط کی تمام تر طنابیں ایک ایک کر کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھیں۔ عنوہ اسی طرح منہ پر ہاتھ رکھے روتی ہوئی اسٹڈی روم سے باہر نکل گئی تھی۔

اگلے دن وہ حنا کو ساتھ لئے بغیر کسی کو بتائے زینو بابا کے ہمراہ ایک انجانی منزل کی طرف چل نکلی تھی۔

"فاخرہ بیٹی! تم میں اور شگفتہ میں ایک چیز مشترک ہے۔ اور وہ بھلا کیا ہے؟"
قمری خالہ نے پان دان گھسیٹ کر گھٹنے کے نیچے کھسکایا اور گہری سوچوں میں گم سم فاخرہ سے بولیں۔ مقصد صرف فاخرہ کا دھیان بٹانے کا تھا، جو ہر وقت بھیگی آنکھوں سے نہ جانے کیا سوچتی رہتی تھیں۔

"کیا چیز مشترک ہے خالہ جان!" شگفتہ بیگم نے ہنستے ہوئے داخلی دروازے میں قدم رکھا۔

"یہی کہ تم رمیز کی سوتیلی ماں ہو اور فاخرہ زردہ کی۔ مگر تم دونوں میں اللہ کی قسم آج تک مصنوعی پن نہیں دیکھا۔ تمہاری قربانیاں اپنی جگہ مگر فاخرہ کے بلند حوصلے اور ہمت کی مثال نہیں ملتی۔" خالہ قمری اپنے ازلی منہ پھٹ انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"مگر میرے نمبر کیسے کم ہوئے خالہ جان؟" شگفتہ بیگم نے شگفتگی سے کہا۔

"بیٹے! جو غم فاخرہ نے اپنے بچوں کے متعلق جھیلے ہیں، پاس رہ کر، قریب آ کر دوریوں کا صدمہ نہیں برداشت ہوتا۔ سمجھو، کنواں پاس تھا، پھر بھی فاخرہ کی ممتا پیاسی رہ گئی۔" خالہ قمری آبدیدہ سی کہہ رہی تھیں۔ شگفتہ بیگم بھی خاموش ہو گئیں۔ جبکہ فاخرہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں جو کہ خالہ قمری نے انہیں عنایت کیا تھا۔ اگر دنیا میں برے لوگ بھی تھے تو اچھے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک مثال تو سامنے بیٹھی بہتر سالہ یہ بوڑھی خاتون تھیں، جو ہمیشہ ہر کڑے وقت میں فاخرہ کے لئے ڈھال بن جاتی تھیں۔

اس وقت جب بے سروسامانی کا عالم تھا، مالک مکان رؤف گجر اپنا مکان خالی کروا چکا تھا، وہ بے یار و مددگار اک آس لئے زیان کو، اپنے لخت جگر کو دیکھ رہی تھیں۔ شاید وہ آگے بڑھ کر اپنی بکھری ٹوٹی ماں کو سہارا دے۔ مگر وہ تو عبیث فریدی کا بیٹا تھا۔ ویسا

ہی کٹھور اور پتھر دل۔ نہ جانے کیوں فاخرہ اس سے رحم کی بھیک مانگنے لگی تھیں۔ اس وقت جب سر پر چھت نہیں تھی، مالی پوزیشن بہت ڈاؤن تھی۔ زروہ کی شادی میں وہ مقروض تک ہوگئی تھیں۔ شاید اس بات سے رؤف گجر نے فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ زروہ کی شادی کا سن کر آگ بگولا ہوگیا اور پھر اس بدفطرت، اوباش نے سارہ کا ہاتھ مانگنے اور رشتہ طے کرنے پر اسرار شروع کر دیا۔ فاخرہ نے جب محلے کے بزرگ اور نئے امام مسجد کو بلوا کر تمام معاملہ ان کے گوش گزار کیا اور انہوں نے رؤف گجر کو سخت سست سنانا شروع کیں تو وہ ہتھے سے اکھڑ کر انہیں مکان خالی کرنے کی دھمکی دیتا، بکتا جھکتا نکل گیا تھا۔

اس نے صرف دھمکی نہیں دی تھی بلکہ سامان اٹھا کر باہر پھینکوانا شروع کر دیا تھا۔ فاخرہ نے اس ذلت کی گھڑی میں کسی غیبی امداد کی شدت سے دعا کی تھی اور پھر پورے نو سال بعد ایک مرتبہ پھر انہی گلیوں میں زیان کو آتا دیکھ کر وہ حق دق رہ گئیں۔ مگر زیان نے ان کے ممتا بھرے جذبات کو مجروح کر دیا تھا جبھی تو انہوں نے دل کو اتنا سخت کر لیا کہ اب کبھی اس کا نام ان کے لبوں پر نہیں آیا تھا۔

ابھی وہ گلی کے آخری سرے پر پہنچی تھیں، جب خالہ قمری لشتم پشتم ان تک آئیں۔ وہ رحمت کا گویا فرشتہ بن کر آئی تھیں۔ انہوں نے نہ صرف انہیں اپنے بھتیجے کے گھر میں جگہ دی بلکہ کرایہ لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ قمری خالہ کا بھتیجا کچھ عرصہ پہلے اپنی فیملی سمیت باہر سیٹل ہوگیا تھا۔

دنیا کا نظام اسی لئے تو چل رہا تھا کہ کچھ بدلوگوں کے درمیان ایسے اچھے لوگ بھی موجود تھے۔ ان کی آنکھوں میں کچھ بیتے دنوں کی کرچیاں چبھنے لگی تھیں۔

انہوں نے ایک بہت ہی غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ والد کی پرچون کی معمولی سی دکان تھی مگر وہ بہت ہی نیک اور دین دار انسان تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں بچوں کی تربیت بہت اچھی کی تھی۔

بچوں کو پڑھانے کا بہت شوق تھا انہیں۔ اسی لئے فاخرہ نے ابا جی کے شوق اور جنون کی وجہ سے ماسٹرز کر لیا تھا۔ ظہیر بھی اچھا خاصا ذہین تھا مگر لاپروائی کی وجہ سے صرف انٹر کے بعد پڑھائی کو خیرباد کر کے ابا جی کی دکان پر بیٹھنے لگا تھا۔

انہی دنوں فاخرہ کے لئے شاہ قدوس کی حویلی سے رشتہ آیا۔ ابا جی کے جاننے والوں کے توسط سے آئے رشتے کو اماں نے کسی نعمت کی طرح قبول کیا تھا۔ شاہ قدوس جیسی نیک، معزز اور رحم دل خاتون جن کی سخاوت کے دور دور تک چرچے تھے، جن کے

نرم میٹھے لفظوں نے اماں کو اپنا اسیر کر لیا تھا، ایسے اچھے رشتے کو ٹھکرانا کہاں کی عقل مندی تھی۔ یوں معمولی سی جانچ پڑتال کے بعد ہاں کر دی گئی اور محض کچھ ہی دنوں بعد وہ ایک شاندار حویلی میں رخصت ہو کر چلی گئیں۔

پہلا دھچکا انہیں اس وقت لگا تھا جب عبیث نے گھونگھٹ اٹھانے کے بعد کہا۔

''اگر تم خوب صورت نہ ہوتیں تو میں نے تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دینا تھا۔''

عبیث فریدی اپنی ماں اور چھوٹے بھائی سے قطعاً مختلف تھا۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ رہنا کس قدر تکلیف دہ تھا جس میں تمام اخلاقی برائیاں پائی جاتی تھیں۔ مگر صبر اور محبت کے سبق ان کی ماں نے جو گرہ میں باندھ کر دیئے تھے، صرف انہی کی بدولت وہ آٹھ سال عبیث کے ساتھ اس کی ہر طرح کی زیادتی برداشت کرتے ہوئے رہی تھی۔

زیان کی پیدائش کے بعد بھی عبیث کے شغل ویسے ہی جاری تھے اور ان دنوں وہ اپنی کزن امبرین میں بہت دلچسپی لینے لگا تھا۔

اماں جان (ساس) کا گھریلو ملازم انہیں تمام رپورٹ پہنچاتا رہتا تھا۔ بقول کرم دین کے، چھوٹے صاحب آج کل ایک ماڈرن لڑکی کے ساتھ بہت گھوم پھر رہے ہیں۔

یہ بے تکلفی انہیں شادی کے قریب لے آئی تھی۔ ایسا کچھ فاخرہ نے سوچا بھی نہ تھا۔ جوں ہی شہر سے اطلاع پہنچی، اماں جان اسے ہمراہ لئے فوراً روانہ ہوگئی تھیں۔

عبیث تو اماں جان کو دیکھتے ہی فرار ہو گیا تھا، البتہ دلہن بنی امبرین کو دیکھ کر فاخرہ کو دلی صدمہ پہنچا۔

''ایک عورت دوسری عورت کی تباہی کا سامان کر رہی تھی۔ بے چاری عبیث کے ہرجائی پن کو جانتی نہیں۔ اسے یوں ہی نئے چہرے متوجہ کرتے ہیں۔ نادان لڑکی۔''

فاخرہ نے افسردگی سے سوچا۔ کچھ ہی دیر بعد اماں جان نے ہاشم بھائی کے کان میں نہ جانے کیا پھونکا کہ تمام منظر یک لخت بدل گیا۔ چہ مگوئیاں کرتے لوگوں کی زبانیں رک گئیں اور مبارک سلامت کا شور اٹھنے لگا۔

عبیث اس واقعہ کے بعد کچھ عرصہ نادم رہا اور پھر دوبارہ سے اپنی مصروفیات میں خود کو گم کر لیا۔

اماں جان کی وفات کے بعد عبیث کو من مانیاں کرنے کی مکمل چھوٹ مل گئی تھی۔ غیر عورتوں کو گھر لے آتا۔ فاخرہ اگر کچھ کہتیں تو انہیں زدوکوب کیا جاتا اور پھر ایک دن وہ انہیں طلاق دے کر اور گھر سے نکال کر زیان کو لئے پہلے شہر اور پھر کسی دوسرے ملک

چلا گیا۔

اسے آنے والی ننھی جان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے اپنا ایک وارث چاہئے تھا، جسے لے کر وہ مغرور ہو چکا تھا۔

ان کی زندگی میں پہلے کون سی آسانیاں تھیں، جب ایک مرتبہ پھر میکے کی دہلیز پر آ کر بیٹھنا پڑا۔ اس عرصے میں ابا جی اور اماں تو چل بسے تھے۔ اب میکے کا مان صرف بھائی اور بھاوج تھی، جسے ان کا بے ضرر وجود اور معصوم سا عبدالباری کھٹکتا تھا۔ آئے دن کے طعنوں اور لڑائیوں سے گھبرا کر ظہیر نے سوچا، بچے کو یتیم خانے بھجوا دیا جائے۔ مگر فاخرہ کے دل کو کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا۔ بہت سوچنے کے بعد انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر اپنے جگر کے دوسرے ٹکڑے کو بھی کسی اور کو سونپ دیا۔ اتنا اطمینان تو بہر حال دل کو تھا کہ ہاشم بھائی غیر نہیں بلکہ باری کے سگے چچا ہیں۔ مگر امبرین کے مزاج سے خوف آتا تھا۔

عبدالباری چلا گیا مگر ندرت کو اب نند کا وجود بھی ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ سارا کام کاج کرنے کے بعد بھی وہ ندرت کے مزاج کو بہتر نہیں کر پاتی تھیں۔ اسی طرح کچھ سال گزرے کہ ندرت اپنے محلے کے ایک مولوی کا رشتہ لے آئی۔ عبدالرحمٰن کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی، پانچ بچے تھے، جنہیں فاخرہ نے ماں بن کر پالا پوسا اور محبت دی تھی۔

سادگی سے ہفتے کے اندر اندر نکاح ہوا اور وہ مولوی عبدالرحمٰن کے گھر چلی آئیں۔ ان کے بچے بہت ہی باادب اور نیک تھے، جلد ہی گھل مل گئے۔ اسی طرح وقت کے تھال میں کچھ سال اور سکوں کی طرح گرے تھے۔

ندرت کے ہاں تیسری بچی کی ولادت ہوئی۔ دو گھنٹے بعد وہ بچی سمیت خود بھی چل بسی۔ ظہیر ننھی پریوں کو ان کے حوالے کر کے خود کراچی چلا گیا اور پھر اس کی کبھی خیر خبر نہیں آئی۔

درمکنون اور رانیہ دونوں میں ان کی جان تھی۔ ان کے اکلوتے بھائی کی نشانیاں مولوی صاحب نے بھی بچیوں سے ہمیشہ شفقت بھرا رویّہ رکھا۔ وہ انہیں ہمیشہ اچھا کھلانے اور پہنانے کی کوشش کرتے تھے مگر پھر بھی نہ جانے کیوں درمکنون ان کے گھر کے ماحول، رہن سہن، ہر شے سے متنفر تھی۔ وہ جادو کی چھڑی سے کسی اونچے محل میں چاہتی تھی اور وہ اپنی لاڈلی کو ہر لمحہ یہی باور کرواتی تھیں کہ اونچے محلوں میں سکھ نصیب سے ملتا ہے میری بیٹی! ہمیشہ اچھے مقدر کی دعا کیا کرو۔ یہ دھن دولت بس دھوکا ہے۔

اور پھر ایک دن بالکل اچانک جھٹ پٹے کی اس شام درمکنون کو اونچے محلوں میں لے کر جانے والا آ گیا تھا۔ فاخرہ نے اپنے دریچے میں کھڑے قدرت کے اس شاہکار کو دیکھا اور دل تھام کر رہ گئیں۔

وہی آنکھیں، وہی سحر طراز نقوش سے سجا چہرہ۔ کشادہ پیشانی پر چمکتا اس کا بلند بخت۔ ان کے جگر کا ٹکڑا...... ان کا زیان عبیث کھڑا تھا۔ آنکھیں ترس گئی تھیں، اس چہرے کو دیکھنے کے لئے۔

ان کی آنکھیں بے تابی سے اس کا طواف کر رہی تھیں جبکہ وہ بڑے اشتیاق، جوش اور کچھ کچھ بے چینی سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور جوں ہی اس کی نظریں سبز دریچے میں جھانکتے چہرے پر پڑیں، اس کے لبوں سے گویا ایک گنگناتا نغمہ ان کے وجود کو گویا ساکت کر گیا۔

"دریہ......!" زیان نے بڑے جوش کے عالم میں اسے پکارا اور دھڑ دھڑ سیڑھیاں اُترتی درمکنون دوسرے ہی پل اس کے سامنے تھی۔ سارہ، زروہ اور مہک بہت حیرت اور کچھ کچھ ناپسندیدگی سے ایک اجنبی کو اپنے گھر میں بغیر دستک کے آتا دیکھ کر اور درمکنون سے یوں بے تکلفانہ گفتگو کرتے سن کر ناگواری سے بڑی تینوں کمرے میں جا گھسیں اور چھوٹی مہک ان کے قریب ہی بیٹھ گئی، جو باتوں میں سارے جہان کو فراموش کئے یوں گم ہو چکے تھے گویا ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا وجود تھا ہی نہیں۔

❁

"عنوہ! تم پاگل ہو گئی ہو؟...... اسپیڈ کم کرو۔" حنا نے چلا کر کہا تو زینو بابا بھی پچھلی سیٹ سے سہم کر بولے۔

"جی بٹیا رانی! اب تھوڑی دور گاؤں رہ گیا ہے۔ آپ ذرا آہستہ گاڑی چلائیں۔"

"زینو بابا! اب کس طرف جانا ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا تو زینو بابا راستہ سمجھانے لگے۔

بڑی اور چوڑی سڑک کے دائیں طرف بڑا سا لوہے کا بورڈ لگا تھا، جس کے اوپر شاہ قدوس لعل اسٹارز جگمگا رہا تھا۔ نیچے عبدالباری کا نام بھی لکھا تھا۔ عنوہ کچھ پُر جوش ہو کر بڑی شان سے کھڑی پُرشکوہ عمارت کو دیکھنے لگی تھی جبکہ حنا اس علاقے کی قدرتی خوب صورتی دیکھ کر چہکنے لگی۔

"واٹ اے بیوٹی فل پلیس اِٹ اِز۔ (یہ کتنی خوب صورت جگہ ہے)"

"بابا! ہم ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ دیکھئے، عبدالباری کا نام لکھا ہے۔" وہ گاڑی سے اُتر کر پُر جوش سی حویلی اور اسکول کی عمارت کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت رانیہ، دریہ سب کچھ ذہن سے فراموش ہو چکا تھا۔ صرف یاد تھا تو اتنا کہ وہ اپنے بابا سے ملے گی آج اسے اپنی پہچان ملنے والی تھی۔ اور وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ممی کا دعویٰ کتنا سچا ہے۔

"عبدالباری کون؟" حنا نے حیرانی سے پوچھا۔

"زیان کا چھوٹا بھائی۔" لہجے میں ڈھیروں خوشی اور کھنک تھی۔

عبدالباری ایک جھٹکے سے ڈھلوانی سطح پر چڑھ کر ان دو اجنبی لڑکیوں تک پہنچا تھا۔ وہ پھولوں کی باڑ کے پاس ایک لائم اسٹون پر بیٹھا مسلسل درمکنون کے متعلق سوچ رہا تھا جب دونسوانی آوازوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

"عبدالباری، زیان کا چھوٹا بھائی۔"

وہ سرعت سے ان کے قریب پہنچا تھا۔ اس کے دل کی رفتار معمول سے ہٹ تھی۔ عنوہ جو گاڑی سے ٹیک لگائے گہرے گہرے سانس لے رہی تھی اور زینو بابا جو حویلی کے اندرونی حصے کی طرف گئے تھے، ان کا انتظار بھی ہو رہا تھا۔

"آپ کون ہیں......؟" عبدالباری نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ اس کا چہرہ بہت ہو رہا تھا۔

"پہلے آپ بتایئے، آپ کون ہیں؟" حنا نے گم سم سی کھڑی عنوہ کو دیکھ کر تنک تو وہ خودبخود عنوہ کی طرف رخ پھیر کر کہنے لگا۔

"آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے کیا کہا ہے؟"

"میں نے......؟" عنوہ نے اپنی طرف اشارہ کیا اور پھر اچانک کچھ کلک ہوا اس نے سامنے کھڑے خوش پوش، خوبرو نوجوان کو بغور دیکھا اور دل نے گویا تصدیق مہر لگا دی تھی۔

"آپ عبدالباری ہیں؟" عنوہ نے خوشی سے بھرپور کپکپاتی آواز میں کہا۔

"جی......اور آپ کون ہیں؟ اور زیان؟" اس کی آنکھوں میں اُلجھن تھی چہرے پر دبا دبا جوش۔

"میں عنوہ زیان ہوں۔ یعنی زیان کی بیوی۔ اور زیان آپ کا بڑا بھائی ہے زیان کو نہیں جانتے ہوں گے۔ کیونکہ آپ کو بابا......"

"عنوہ بیٹا جی! اندر آیئے، شاہ صاحب بلا رہے ہیں۔" اسی پل زینو بابا لے

مداخلت کی تو وہ دونوں اندر کی طرف بڑھ گئی تھیں جبکہ عبدالباری سوچوں میں گم حیران پریشان سا وہیں کھڑا رہ گیا۔

"یہ لڑکی کیا سچ کہہ رہی ہے؟ مگر ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟...... لیکن یہ جھوٹ کیوں بولے گی؟"

"چلی گئی ہیں وہ دونوں۔ اب آ جایئے واپس اپنے حواسوں میں۔" قریب ہی عیشہ کی کھنک دار ہنسی سنائی دی تو وہ حیرت زدہ سا پلٹا۔

"تم کب آئیں؟"

"میں تو پہلے سے ہی موجود ہوں مگر آپ کو دکھائی نہیں دیتی۔" کچھ جتاتا، کچھ سمجھاتا عیشہ کا روٹھا روٹھا، مبہم سا انداز بہت سی باتیں واضح کر گیا تھا۔

"اوہو......تو بڑوں کی میٹنگ کی خبر اس تک بھی پہنچ گئی ہے۔" عبدالباری نے سوچا اور پھر ایک شگفتہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولا۔

"نظر تو بہت آتی ہو اور کہنا بھی بہت کچھ چاہتا ہوں، مگر مناسب وقت کا انتظار ہے۔" اس نے بابا جان کی خواہش پر سر جھکا دیا تھا۔ ویسے بھی خودسری اس کی شخصیت کا خاصہ نہیں تھی۔ یہی بابا جان کی تربیت کا تقاضا تھا کہ وہ اس رشتے پر راضی ہو جاتا جو اللہ نے اس کی تقدیر میں لکھ دیا تھا اور وہ ناشکرے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے بابا جان کے قول کے مطابق درمکنون کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔

"اور وہ مناسب وقت کب آئے گا؟" عیشہ نے مسکرا کر پوچھا اور پھر گھبرا کر پلٹنے لگی جب پیچھے سے عبدالباری کی آواز سنائی دی تھی۔

"اِن شاءاللہ بہت جلد۔"

❁

"یا اللہ! یہ خواب ہے یا حقیقت؟ تم......میری عنوہ، خود چل کر میرے پاس آ گئیں۔" انہوں نے آنکھیں موندیں تو دو شفاف قطرے گالوں پر بہنے لگے۔ انہوں نے اپنی دونوں بانہیں پھیلا دی تھیں اور عنوہ کو لگا وہ کڑی دھوپ سے ٹھنڈی چھاؤں میں آ گئی ہے۔ صحرا میں گویا ابر رحمت پورے جلال سے برسا تھا۔ جل تھل ہو گئی تھی۔ ہر شے سیراب ہو گئی تھی۔ وہ بابا جان کے سینے میں منہ چھپا کے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور حنا کو لگا کہ اس کا دل پگھل کر بہہ جائے گا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عنوہ اسے اتنا بڑا سرپرائز دے گی۔ اور پھر اس نے عنوہ کے بابا جان کو غور سے دیکھنا شروع

کیا۔ اس نے یہ مہربان اور شفیق چہرہ کہاں دیکھا تھا؟ اور پھر ایک دم ہی کچھ فلیش ہوا۔

"مکہ میں...... جب میں اور ابو عمرہ کرنے گئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی لڑکی بھی تھی۔" حنا کو بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔

"بابا جان! آپ کی بیٹی کہاں ہے؟" حنا زیادہ دیر اپنے تجسس کو برقرار نہیں رکھ سکی تھی، بے چینی سے پوچھ بیٹھی۔

"یہ وقت اس کی عبادت کا ہے بیٹے! تم لوگ صبح ہی اس سے مل سکو گی۔ ابھی آرام کرو۔ کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔" انہوں نے بہت ہی شفقت اور حلاوت سے کہا تو حنا بخدن بی بی کی ہمراہی میں اٹھ کر چلی گئی جبکہ عنوہ نے ایک مرتبہ پھر ان کے شفیق مہربان سینے میں منہ چھپا لیا۔

"آپ نے میرے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا ہے بابا جان!...... آپ نے مجھے اپنی محبت سے محروم رکھا۔ مجھے تنہائیوں کے حوالے کر آئے۔ مڑ کر میری خبر بھی نہیں لی۔"

"میں خوف زدہ تھا۔ مجھے خوف تھا کہ تم......"

"پلیز بابا جان! کچھ مت کہیں۔ مجھے کوئی بھی ایسی وضاحت نہیں چاہئے، جو آپ کے لئے تکلیف کا باعث بنے۔" اس نے اپنا ہاتھ ان کے ہونٹوں پر رکھا تو انہوں نے اس کے ہاتھ پر نرم سا بوسہ دیا۔

"میں آپ کی بھی بیٹی تھی۔ آپ نے کیوں سوچا کہ میں ممی کی طرح سطحی رکھنے والی ہوں۔ بابا جان! آپ کو کیا پتہ کہ آپ میرے لئے کیا ہیں۔ ماں باپ اللہ کی طرف سے ایسا حسین تحفہ ہیں جن کا نعم البدل کوئی چیز بھی نہیں ہو سکتی۔ آج میں خوش ہوں کہ آپ کو بتا نہیں سکتی۔ میری گردن بھی تفاخر سے اونچی ہو گئی ہے۔ کے سامنے میرے پلس پوائنٹ میں اضافہ ہوا ہے، ورنہ ممی کے حوالے سے وہ مجھے مار مار کر بے حال کر دیتا تھا۔" عنوہ خوشی سے چہک رہی تھی۔

"زیان کون؟" وہ اپنی بیٹی کا سر چومتے ہوئے دل ہی دل میں پروردگارِ عالم کا ادا کر رہے تھے جس نے انہیں عنوہ سے ملا دیا تھا۔ ان کی پیاری اکلوتی بیٹی، ان کی نا شکستہ زیست کی کل پونجی، ان کی پوری کائنات بس اس ایک چہرے میں سمٹ آئی جو دعا کا حصار انہوں نے عنوہ کے گرد کھینچا تھا وہ اسی حصار میں موجود تھی۔ محفوظ تھی کی آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سرور...... ایسی رحمت جس سے ایک خود پرست وجہ سے انہیں منہ موڑنا پڑا تھا۔ وہ عورت جو کبھی دل میں بستی تھی، عرصہ ہوا، آنکھ

سے اُتر کر تاریک گڑھوں میں گر چکی تھی۔ جسے حُسنِ ظاہر سے عشق تھا۔ حُسنِ باطن کے مفہوم سے نا آشنا سیاہ قلب والی بد بخت عورت۔

وہ عورت انہیں اس لئے یاد تھی کہ اس کی بے وفائی اور ہرجائی پن نے انہیں عشقِ حقیقی سے ملا دیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی کا راز جان لیا تھا۔

"بوجھیں نا...... زیان بھلا کون ہو سکتا ہے؟" وہ انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"زیان......" بابا جان نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ "زیان میری بیٹی کی خوشی معلوم ہوتا ہے، جس سے میرا تعارف کروا کر میری بیٹی کی گردن فخر سے اونچی ہو جائے گی۔"

"بابا جان! اس کے علاوہ پتہ ہے، زیان کون ہے؟" اس نے جان بوجھ کر سسپنس پھیلانا چاہا تھا۔

ان کے لبوں پر دھیمی سی مسکان نے جھلک دکھائی۔

"آپ کے تایا جان، عبیث فریدی کا بیٹا، میرا بھتیجا اور عنوہ کا......"

"نصف بہتر۔" حنا نے مسکراتے ہوئے ٹکڑا لگایا اور عنوہ ہنس ہنس کر دہری ہو رہی تھی۔

"نصف بہتر......" اس نے گویا بہت ہی لطف لیا۔

حنا بہت خوشی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی، جسے کبھی مسکرانا آتا ہی نہ تھا اور اب خوشی اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔ حنا بیگ اٹھا کر واپس چلی گئی تھی سونے کے لئے۔

"بابا جان! آپ نے عبدالباری کو بتایا کہ میں کون ہوں؟"

"تم مجھے موقع دو گی تو بتاؤں گا نا۔" انہوں نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا، وہ امبرین کی جوانی کی تصویر تھی۔

"وہ بہت حیران ہو گا کہ آپ اس کے بابا نہیں چچا ہیں۔" عبدالباری کے قدم دروازے کے قریب ہی رک گئے تھے۔

"بابا جان! میں عبدالباری کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔ میں نے باری کو اس کی ماں سے ملوانے کا خود سے عہد کر رکھا ہے۔" اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"تم جانتی ہو بیٹے! کہ فاخرہ بھالی کہاں ہیں؟"

"نہیں۔ مگر میں انہیں ڈھونڈ لوں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"بابا جان! کیا آپ نے باری کو بتایا ہے کہ اس کی امی نے کس مجبوری کے اسے آپ کے حوالے کیا تھا؟" کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے آہستگی سے کہا تو جان نفی میں سر ہلانے لگے۔

"نہیں بیٹے! بعض آپ کی زندگی کے بہت حساس اور نازک پہلو ہوتے جنہیں آپ اپنے پیاروں کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتے۔ میں نہیں چاہتا کہ باریؔ چلے کہ میں اسے لے کر کیوں روپوش ہو گیا تھا۔ تمہاری ماں نے جو کچھ کیا میں اسے بھی شیئر نہیں کر سکتا۔ بہت عرصہ اس موضوع پر لوگوں نے چٹخارے لئے ہوں میرے لئے یہ بہت اذیت ناک عمل ہے۔" ان کی آنکھوں میں سرخی سی اُترنے لگی اور باہر کھڑا عبدالباری چپکے سے پلٹ گیا۔

"میں آپ کی زندگی کے ان تاریک پہلوؤں کو کبھی نہیں کریدوں گا بابا جان خوشی اور فخر کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ میں بے نشان نہیں ہوں۔ میں کسی گناہ کا جیتا جاگتا انجام نہیں ہوں۔ میرا باپ اس دنیا میں نہیں۔ بظاہر وہ ایک انسان تھا اور میری ماں نہ جانے کن مجبوریوں میں جکڑی ہو گی۔ میں اپنی ماں سے ضرور جاؤں گا۔ اس لئے کہ میں نے ماں کو اپنے ہاتھ سے چھو کر محسوس کرتا ہے۔ بھائی....... اور تم بہت اچھی سی لڑکی عنوہ، میری محبتوں کی شراکت دار بن گئی میری ماں کا سندیسہ سنا کر مجھے خوشیوں کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ میری ا بھابی! میرے کھوئے رشتے مل گئے ہیں۔ میں ایک مضبوط ستون کے سہار ہوں۔ میری بنیادیں مضبوط ہیں اور میرے دل سے آخری پھانس بھی چپکے سے ہے کہ میں کسی کے گناہ کا ثمر نہیں ہوں۔ میرے اور آپ کے رشتے مضبوط ہیں مضبوط ہیں بابا جان! یہ تعلق خون کے تعلق ہیں۔ یہ محبت کے تار دلوں سے جڑے یہ کشش خون کی کشش تھی۔"

❁

وہ بہت تیزی کے ساتھ لاؤنج سے گزرتا گول زینہ طے کر کے رانیہ کے طرف بڑھ گیا تھا۔

آج دوسری مرتبہ وہ رانیہ کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا بعد دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ رانیہ کی آنکھیں تحیر کے عالم میں پھیل سی گئیں۔

"آپ......." وہ ہکلا کر اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

"اندر نہیں آنے دو گی.......؟" زیان کا لہجہ خوشگوار تھا۔ رانیہ حیرت سے بت بنی کھڑی رہی۔

"آؤ، رانیہ! یہاں بیٹھو....... میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" اس نے نرمی ے کہتے ہوئے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی صوفے پر بیٹھ ئی تھی مگر سر یوں جھکا ہوا تھا۔ یہ سر کبھی زیان کے سامنے اُٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ ایک یسے ہی حوالے سے رانیہ کی ذات منسلک تھی۔

"تم مجھ سے نفرت کرتی ہو نا؟"

"نن....... نہیں تو۔" وہ گھبرا کر بولی تھی۔

"یہی سچ ہے۔" زیان نے خاکی لفافہ ٹیبل کے اوپر رکھتے ہوئے کہا۔

"رانیہ.......!"

"جج....... جی۔" اس نے سر اٹھایا اور پھر جھکا لیا۔

"میرا دل چاہتا ہے تم پھر سے مجھے وہی زیان سمجھو۔"

"کک....... کیا؟" وہ متوحش سی آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگی۔

"ہاں رانیہ! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ انتقام کا سلسلہ اب ختم ہو جانا چاہئے۔ بہت ں آگ میں خود بھی جلا ہوں اور....... چھوڑو اس قصے کو۔ اس لفافے میں طلاق کے ﷲغذات ہیں۔ جیسے خاموشی سے یہ نام نہاد بندھن بندھا تھا، اسی خاموشی سے توڑ رہا وں۔ چند ایک لوگوں کے سوا کوئی اس حقیقت سے واقف نہیں۔ اور جو جانتے ہیں، وہ ے وفادار ہیں۔ دیکھو رانیہ! یہ آنسو کیسے؟ تمہاری دلی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ کیا م ایسا نہیں چاہتی تھیں؟" زیان نے ڈپٹ کر پوچھا۔

وہ کچھ نہیں بولی تھی، بس خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

"میں آپ سے نفرت نہیں کرتی۔ بس آپی نے جو کچھ کیا تھا، اگر اس رات میں ال پڑتی تو حالات کچھ اور ہوتے۔"

"اٹس اوکے، میں کچھ فضول سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ یہ بتاؤ تم نے اپنے ے میں کیا سوچا ہے؟"

"کیا مطلب؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اپنوں سے ملنا نہیں چاہو گی؟" زیان نے کہا تو وہ بے چین ہو اٹھی۔

"آپ مجھے پھپھو امی کے گھر چھوڑ دیں۔"

"پھپھوامی کو یہیں نہ لے آؤں؟"

"مگر کیسے؟........کیا وہ آ جائیں گی؟ آپ نے کب سے انہیں امی تسلیم کیا ہے؟" رانیہ نے حیرانی سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ اس کا اعتماد زیان کے رویے کی بدولت رفتہ رفتہ بحال ہو رہا تھا۔

"ایک ایسی کرپٹ عورت کی باتوں پر یقین کر لیا ہے جو اب اس دنیا میں نہیں میں امی کو لینے جا رہا ہوں۔" زیان نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟" رانیہ نے چونک کر پوچھا۔

"عنوہ کی ممی کی۔"

"کیا ان کی ڈیتھ ہو گئی ہے؟" اسے بے حد افسوس ہوا تھا۔

"ہاں۔ پھر کیا سوچا ہے تم نے اپنے بارے میں؟" زیان نے اٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ مجھے دارالاقامہ چھوڑ دیں۔ میں نہیں چاہتی کہ پھپھوامی مجھے آپی کے پرانے حوالے سے ملیں۔"

"سمجھ دار ہو گئی ہو رانیہ! یہ لو، جب نئی زندگی کی ابتدا کرو گی تو اس کی ضرورت محسوس ہو گی۔"

زیان نے ایک اور لفافہ اس کی طرف بڑھایا تو رانیہ حیرانی سے پوچھنے لگی۔

"اس میں کیا ہے؟"

"ایک سپر لگژری فلیٹ کے کاغذات........ یہ گھر تمہارا ہوا۔ میری طرف دونوں کے لئے قبل از وقت تحفہ۔"

"ہم دونوں؟" وہ ایک مرتبہ پھر حیران تھی۔

"تم اور مبین۔ اب سائی موٹی عقل میں بات؟" زیان مسکراتا ہوا نیچے چلا گیا تھا

اسٹڈی روم میں آ کر پہلے اس نے امبرین کی میل کو ڈلیٹ کیا اور پھر شاہ قدا حویلی کے بارے میں سوچنے لگا۔ مگر اس سے پہلے اس نے اپنی ماں سے معافی تھی۔ انہیں بتانا تھا کہ وہ ان سے کتنا پیار کرتا ہے اور ان کے حوالے سے ہی اسے زروہ اور سارہ سے لگاؤ ہے۔ بہت دیر بعد ہی سہی، اس نے حقیقت کو تسلیم کر ہی جن لوگوں سے اس کی ماں نے محبت کی تھی، وہ کیسے ان لوگوں سے نفرت تھا۔ وہ آج کل مبین سے ہر روز ملتا تھا۔ اس کا برابر علاج ہو رہا تھا۔ اور اب

کی بہاروں کی طرف متوجہ ہونے لگا تھا۔ صرف اور صرف رانیہ کی وجہ سے۔

زیان جب پہلی مرتبہ پارک میں بینچ پر گم سم بیٹھے مبین کو دیکھ کر اس کے قریب گیا تو چونکنے سے پہلے ہی اس نے پوچھا تھا۔

"رانیہ کہاں ہے؟"

اور زیان جیسا زیرک بندہ جو مقابل کے اندر تک اُتر جانے کا فن رکھتا تھا، بس خاموشی سے اسے دیکھے گیا تھا۔ فیصلہ تو کب کا ہو چکا تھا۔ اب عمل کرنا باقی تھا۔

آج سے سات آٹھ ماہ پہلے عنوہ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے سے پہلے اس نے سوچا تھا کہ رانیہ کو اس کا جائز مقام دے دینا چاہیے۔ کچھ ایسی ہی سوچوں کے زیراثر وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھا تو اسے جائے نماز پر بیٹھا روتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"اللہ جی، مجھے پھپھوامی سے ملا دے........ زروہ آپی، سعیہ، سارہ اور میرا مبین۔"

وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور زیان بے آواز قدموں سے پلٹ آیا تھا۔

پچھلے ایک دو دن سے وہ مسلسل امی کے پرانے مکان کے ہزار چکر لگا چکا تھا مگر ان کا سراغ ملنا مشکل امر لگ رہا تھا۔

پھر کچھ سوچ کر اس نے پڑوسیوں کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک ادھیڑ عمر عورت نے اس کی تمام بات سن کر خالہ قمر النساء کا ایڈریس دیا تھا۔ یوں اس کی تمام مشکلیں آسان ہوتی چلی گئیں۔

❁

عنوہ کے ہاتھ سے شیشے کا گلاس لڑھکتا ہوا فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ مگر وہ گلاس کی طرف متوجہ کہاں تھی۔ وہ پچھلے صحن میں بیٹھی نرم گرم دھوپ کا مزا لے رہی تھیں جب ایک سر سے لے کر پیروں تک چادر میں لپٹی لڑکی بیرونی دیوار سے لگی ٹونٹی کی طرف بڑھنے لگی۔ اب وہ ٹونٹی کھول کر وضو کرنے لگی تھی مگر اس سے پہلے اس نے اپنی ٹینٹ نما چادر کو کھونٹی پر لٹکایا اور مگن سے انداز میں وضو کرنے لگی تھی۔ یہ حویلی کا پچھلا حصہ تھا۔ یہاں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔

اس کے لمبے بال چوٹی میں بندھے تھے۔ اس کا چہرہ وہ ٹھیک طرح سے دیکھ نہیں پائی تھی مگر پھر بھی اس لڑکی کے خوب صورت ہونے کا اسے یقین تھا۔ جوں ہی وہ چادر کھونٹی سے اتارنے کے لئے پلٹی، نظریں گم سم سی عنوہ سے جا ٹکرائی تھیں۔

"یقیناً بابا صاحب کی بیٹی عنوہ ہے۔" درمکنون نے مسکان لبوں پر سجا کر سوچا۔ اک

اُجلی چمکیلی سی ڈھلی ڈھلی مسکان........وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔
عنوہ کی نظریں اس کی شفاف گردن میں جھولتی موٹی سی چین پر تھیں، جس کا لاکٹ انسانی شکل میں ڈیزائن کیا گیا تھا اور جس میں سفید نگینے جڑے تھے اور واضح لفظوں میں لکھا تھا۔

"Zayan"

اب وہ بالکل عنوہ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ لبوں کے پاس بھورا تل مسکرایا تھا۔ بہت ہی خوب صورت کتابی چہرہ۔

"دریہ۔" وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ درمکنون ایسے وحشت زدہ سی ہو کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی، گویا کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔

"دریہ مائی لو۔" جیسے کسی نے سرگوشی کی تھی، چپکے سے کان کے قریب۔ عنوہ کو لگا اس بند کتاب کا صفحہ صفحہ بکھرنے والا ہے۔ کوئی بھید چھپا نہیں رہے گا، کوئی راز پوشیدہ نہیں رہے گا۔ اس بند کتاب کا لفظ لفظ پڑھنے کو عنوہ بے تاب ہو رہی تھی۔ حنا بھی چونک کر ان کے قریب آ گئی۔

"آپ وہ ہی ہیں نا........مکہ میں عمرے کے دوران ہم ملے تھے۔ آپ عنوہ بابا جان کے ساتھ آئی تھیں۔ بہت شوق تھا مجھے آپ سے دوبارہ ملنے کا۔ دیکھیں اللہ پھر سے ملن کروا دیا ہے۔" حنا پُرجوش سی کہہ رہی تھی۔ پھر عنوہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ان سے ملو عنوہ! میں نے کہا تھا نا کہ میری ملاقات ایک بہت اچھی ہستی ہوئی تھی۔ تمہاری کچھ بے چینی کا حل ان کے پاس ضرور ہو گا۔ آپ لوگ باتیں کریں میں ابو کو اور ہشام کو ایک فون کر کے آئی۔" حنا مسکراتے ہوئے پلٹ گئی تھی جب نے آہستگی سے کہا۔

"میری کچھ نہیں، سب بے چینیوں کا حل ان کے پاس موجود ہے۔"

"تم کون ہو عنوہ!" درمکنون نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

"یہی سوال تو میں آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔ کوئی بھی مجھے اس کا جواب نہیں بہر حال میں زیان کی بیوی ہوں۔" عنوہ کے انکشاف نے اسے دم بخود کر دیا تھا۔

"تم کیا جاننا چاہتی ہو؟ اور کیوں؟" درمکنون نے گہرا طویل سانس کھینچا۔ اس پُل صراط سے گزرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"میں زیان اور آپ کے تعلق کی نوعیت کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں

جاننا چاہتی ہوں؟ اس لئے کہ شاید آپ کی ذات کی کچھ اُلجھنیں رانیہ کی زندگی کے قیمتی سالوں کو اُلجھا رہی ہیں۔ میں رانیہ کو اس کا جائز مقام دلوانا چاہتی ہوں مگر میں یہ بھی دیکھنا چاہوں گی کہ رانیہ کے لئے زیان کے دل میں کتنی گنجائش ہے۔"

اس نے بات کے اختتام پر درمکنون کی طرف دیکھا تھا۔ زلزلے کے بعد کے تمام تر آثار اس چہرے پر پائے جاتے تھے۔ جابجا خوف کی، ملال کی، غم اور ندامت کے آنسوؤں کی دراڑیں تھیں۔

"ایک فیصد بھی نہیں۔" اس نے بھیگتی پلکوں کو چادر کے پلو سے صاف کیا اور بولی۔

"آؤ عنوہ! میرے ساتھ اندر آؤ۔ آج میں اپنی "کتابِ زندگی" تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ اسے نذرِ آتش نہ کرنا، نہ ہی دریا برد کرنا۔ بلکہ اسے پڑھنے والی تمام میرے جیسی لڑکیوں کے لئے عبرت کا جیتا جاگتا نشان بننے دینا۔ ان نادان لڑکیوں کو بتانا، سب کو درمکنون کی طرح بابا صاحب جیسے راہنما نہیں ملتے اور نہ ہی ہر لڑکی درمکنون کی طرح بلند بخت ہوتی ہے۔ جس کے مقدر کی سیاہی ندامت کے اشکوں سے ڈھل جائے۔ نہ ہی ہر ایک پر بخشش و کرم کی عنایات کی جاتی ہیں اور نہ ہی ہر ایک کو معرفت کے جام پلائے جاتے ہیں۔ یہ خاص اس باری تعالیٰ کا فضل ہے۔ یہ خاص اس کی رحمت ہے جس نے درمکنون کی تاریک ذات کو اپنے لطف و کرم کی جلا بخشی۔ ورنہ آج مجھ میں اور کوڑھ کے مریض میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔

آؤ اور صفحہ صفحہ پڑھو، درمکنون کی زیست کا........ جب اس کی آنکھ میں پہلا پہلا خواب اُترا تھا۔ جب درمکنون کو پہلی مرتبہ کسی نے "دریہ" کہہ کر پکارا تھا۔ جھٹ پٹے کی اس گلابی شام میں وہ ہمارے گھر یعنی میری پھپھو امی کے گھر آ گیا تھا۔ مجھے کھوجتے ہوئے، ڈھونڈتے ہوئے۔ اس اجنبی کو مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔"

"یونیورسٹی آف پنجاب سے ماسٹرز کی ڈگری لینا میرا جنون تھا۔ حالانکہ میں جانتی بھی تھی کہ پھپھوامی کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ ان کی معمولی سی گورنمنٹ کی جاب اور لاتعداد مسائل سے نبرد آزما ان کی اکیلی ذات۔

مولوی صاحب کی وفات کے بعد گھریلو حالات بد سے بدترین ہوتے چلے گئے تھے۔ مگر میں نے کبھی ان باریکیوں کے متعلق سوچا نہیں تھا۔ مجھے صرف اپنی خواہشات اور خوابوں سے غرض تھی۔ میں اس بات سے بے نیاز رہتی تھی کہ زروہ اور پھپھوامی نہ جانے کیسے رات رات بھر سلائی مشین چلا کر گھر کی گاڑی کو گھسیٹ رہی ہیں۔

مجھے نت نئے کپڑوں کے لئے پیسے چاہئے ہوتے تھے اور پھپھوامی نے کبھی ماتھے پر بل نہیں ڈالے تھے۔ میری ہر فرمائش بن کہے پوری کر دیتی تھیں۔ کبھی کبھی رانیہ بھی مجھ سے اُلجھ پڑتی اور زروہ کے تو تیور ہمہ وقت بگڑے رہتے تھے۔ اکثر پھپھوامی سے دبی آواز میں جھگڑتی۔

"امی! آپ اس نواب زادی کو سمجھاتی کیوں نہیں ہیں؟ یونیورسٹی کا خرچہ ہم افورڈ نہیں کر سکتے۔ میری طرح پرائیویٹ ایم اے کا امتحان دے لے۔ کیا یہ ضروری ہے ہم اپنے پیٹ کو ننگا کر کے دکھائیں؟ سو طرح کے مسائل ہوتے ہیں۔ بجلی کا بل، گیس بل، مکان کا کرایہ، مبین اور باقی تینوں کی فیسیں۔ آخر رانیہ بھی تو ہے۔ اس نے بے جا فرمائش نہیں کی۔ کبھی آپ کو تنگ نہیں کیا۔ مگر یہ نہ جانے خود کو سمجھتی کیا ہے۔"

زروہ کے انداز مجھے آگ لگا دیتے ہیں۔ اس کا جتانے والا رویہ کہ میں اس باپ کے گھر میں موجود انہی کے ٹکڑوں پر پلنے والی ان کی سوتیلی ماں کی یتیم بھتیجی میرے اندر نفرتوں کا لاوا پکنے لگا تھا، جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ زروہ او درمیان جو لاتعلقی اور اجنبیت کی دیوار تھی، وہ دن بہ دن مضبوط اور بلند ہوتی جا ہم دونوں کو ایک دوسرے کے وجود سے چڑ تھی۔ یہ چڑ روز بہ روز بے

پھر نفرت میں ڈھل گئی۔

زروہ کی مجھ سے بے زاری سمجھ میں آتی تھی۔ وہ میری خودسری اور پھپھوامی کو وقتاً فوقتاً پیسوں کے لئے تنگ کرنے سے چڑتی تھی جبکہ مجھے تو نہ صرف زروہ بلکہ اس گھر کے ہر فرد سے ہی اُلجھن ہوتی تھی۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے جو میرے نزدیک تمام عمر کنوئیں کا مینڈک بن کر زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ جنہیں ترقی اور اچھی زندگی گزارنے کی طلب نہیں تھی۔

دراصل ان دنوں میں قانع، صابر کے مفہوم سے واقف نہیں تھی۔ ان لوگوں کو اپنی قناعت پسندی اور صابر و شاکر ہونے پر فخر تھا جو کہ میرے نزدیک یہ دقیانوسی باتیں تھیں۔

رانیہ! میری چھوٹی بہن مجھ سے بہت مختلف تھی، شاید اسی لئے وہ شروع سے ہی اس ماحول میں رچ بس گئی تھی۔ اس کی سب سے بہت دوستی تھی۔ وہ پھپھوامی کی بھی بہت لاڈلی تھی اور انہوں نے رانیہ اور مبین کے حوالے سے کچھ اچھے خواب بھی دیکھ رکھے تھے، جن کی چمک ان دونوں کی آنکھوں میں محبت بن کر بہت سے راز افشا کر رہی تھی۔

مجھے کچھ بھنک پڑی تو میں نے رانیہ کو خوب جھاڑا۔ وہ مجھ سے بہت ڈرتی تھی۔ بہت خوف زدہ رہتی تھی۔

"ابھی اُگ تو لو، پھر عشق بھی کر لینا۔ اپنی عمر دیکھو۔ اتنی سی ہو ابھی، نہ جانے پھپھو امی کے دماغ میں کیا خناس سمایا ہے۔ قبل از وقت ایسی باتیں کرنا نامناسب ہیں۔ اور پھر میں نے تمہارے لئے بڑے بلند خواب دیکھ رکھے ہیں۔ یہ مبین ان پر فٹ نظر نہیں آتا۔ میں تمہیں کسی اونچے گھر میں بیاہوں گی۔ یہ مبین تمہیں کیا دے سکتا ہے؟ دال روٹی کے چکر میں الجھا، چار بہنوں کی ذمہ داری ہے اس پر۔ انہیں بیاہتے ہوئے بوڑھا ہو جائے گا۔"

میری سوچیں آلودہ ہو چکی تھیں اور رانیہ زرد چہرہ لئے خاموشی سے میرے سامنے سے ہٹ گئی۔

میں نے بتایا ہے نا کہ وہ مجھ سے بہت خوف زدہ رہتی تھی۔ اس میں اعتماد کی کمی تھی۔ میرا اس پر بڑی بہنوں والا رعب اور دبدبہ تھا۔

پھپھوامی اکثر مجھے سمجھاتی تھیں کہ میں رانیہ کے ساتھ نرم لہجے میں بات کیا کروں اور مجھے تو ان کی ہر نصیحت سے گویا چڑ ہو چکی تھی۔ بلکہ مجھے ان کا وجود ہی کھٹکنے لگا تھا۔ پتہ ہے کیوں؟ شاید اس لئے کہ جب وہ مجھ سے ملنے میرے گھر آیا تو پھپھوامی نے ایک نیا ڈرامہ شروع کر دیا۔ وہ بے تحاشا روتے ہوئے اس کا منہ چوم رہی تھیں۔

"تم میرے بیٹے ہو، میرے زیان! میری آنکھیں ترس گئی تھیں تمہیں دیکھنے کے لئے۔" ان کے رونے دھونے سے زیان قطعاً متاثر نہیں ہوا تھا بلکہ ایک دم گویا اسے کرنٹ لگا۔

"میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔" اس نے نفرت سے کہا۔

"تم میرے بیٹے ہو، میرے زیان! میری آنکھوں کی ٹھنڈک، میرا دل گواہی دے رہا ہے۔" پھپھوامی تڑپ کر بولی تھیں۔

"اگر میں آپ کا بیٹا ہوں۔ تو یہ لوگ کون ہیں؟" وہ زہرخند سا مہک، سعدیہ اور سارہ کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

"کیوں چھوڑا تھا آپ نے مجھے؟........ آپ میری ماں نہیں ہو سکتیں۔" زیان آگ بگولا تن فن کرتا چلا گیا تھا۔ اور پھر میں پھپھوامی سے جھگڑنے لگی تھی۔ میری بدکلامی کو خاموشی سے برداشت کرتی وہ معمول کے کام سرانجام دینے لگی تھیں مگر زروہ سے یہ سب برداشت نہیں ہوا تھا۔ میری اور زروہ کی یہ پہلی انتہائی سخت قسم کی لڑائی ہوئی تھی۔ پھر گویا ایک سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔

پھپھوامی کو میرا زیان سے ملنا پسند نہیں تھا۔ مگر جب وہ گھر آتا تھا تو انہوں نے کبھی اسے منع نہیں کیا تھا بلکہ ان کی آنکھیں اسے دیکھ کر چمکنے لگتی تھیں۔

مجھے آج بھی زیان سے یونیورسٹی میں ملاقات کا پہلا دن روزِ اوّل کی طرح یاد ہے۔ کوریڈور میں اپنے دوستوں کے گروپ میں کھڑا وہ مجھے دُور سے ہی دیکھ چکا تھا اور پھر بقول زیان کے اس کے دل نے پہلی بیٹ مس کی تھی، وہ جان بوجھ کر مجھ سے ٹکرایا تھا۔

زیان کہتا تھا، اسے مجھ سے محبت ہے۔ یونیورسٹی کا چپہ چپہ ہماری محبت کا گواہ تھا۔

میں اس کے سنگ چلی تھی۔ ایک بڑے گھر کی چاہ لے کر........ اور اس نے ہاتھ تھاما تھا، اپنے اندر کی محرومیوں کو ختم کرنے کے لئے۔

وہ کہتا تھا، میری زندگی بہت ٹریجک سی ہے۔ وہ اس میں خوشگواری لانا چاہتا تھا اسے اپنی ماں سے نفرت تھی اور یہی نفرت میں نے رفتہ رفتہ اس کے اندر مضبوط کر دی کہ وہ کبھی پلٹ کر ان راہوں کی طرف نہ دیکھے۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ماما مجھے چھوڑ دیں گی۔ کیا کوئی عورت اپنا بچہ چھوڑ سکتی ہے؟" وہ اکثر بہت ٹوٹ پھوٹ کا شکار پھپھوامی کا ذکر چھیڑ دیتا تھا۔ یعنی اس

دل میں ان کے لئے کچھ نرمی ضرور تھی۔

"شاید وہ مجبور ہوں۔" زیان کی دل گرفتگی اکثر مجھے غصے سے بے حال کر دیتی۔

"اونہہ، مجبوری۔" میں سلگتے ہوئے اس کا دھیان بٹا دیتی تھی۔

یونیورسٹی سے فراغت کے بعد زیان نے ہائر اسٹڈیز کے لئے ابراڈ چلے جانا تھا اور میں اپنے اور اس کے تعلق کو کوئی نام دینا چاہتی تھی۔ جبکہ وہ تو دل و جان سے تیار تھا۔

"اچھا ہے، تم بھی میرے ساتھ چلنا۔"

اس کے ڈیڈی نے سنا تو ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"ابھی تم اِم میچور ہو........ شادی کے لئے عمر پڑی ہے۔ اپنی تعلیم مکمل کرو اور اس گرتے کاروبار کو سنبھالو۔" ان کا انداز دوٹوک تھا۔

"مجھے ابھی دریہ سے شادی کرنا ہے۔" زیان بھی انہی کا بیٹا تھا، کیسے ہار مان لیتا۔

زیان کو مجھے درمکنون کہنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے اپنی آسانی اور خواہش پر مجھے دریہ کا نام دیا تھا۔

زیان نے مجھے اپنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا اور اس کے فیصلے سے ٹکرانا عبیث فریدی خود بھی نہیں چاہتے تھے۔ تھوڑی سی مشکلات کے بعد زندگی میں آسانیاں آنے والی تھیں۔ یہی خوشی مجھے ہواؤں میں اُڑائے رکھتی۔

زیان نے صاف لفظوں میں کہا۔ ڈیڈی پروپوزل لے کر نہیں جائیں گے۔ انہوں نے مجھے پرمیشن دے دی ہے۔ ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔ میں زیان کے فیصلے سے متفق تھی۔ میری آنکھیں اپنے دیرینہ خوابوں کی تعبیر پر چمک رہی تھیں۔

میرا دل ریزہ ریزہ ہو رہا تھا اور میں اس وقت کی کیفیات بتانے سے قاصر ہوں۔ میری پھپھو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کے لبوں پر التجا تھی۔ وہ مجھے منع کر رہی تھیں، روک رہی تھیں۔ زمانے کی اونچ نیچ........ اپنی عزت کے واسطے۔ مگر میں آنکھیں اور کان بند کر چکی تھی۔ ایسی بے رحمی میری سرشت میں تو نہیں تھی۔

میں نے اس وقت پھپھوامی سے مزید کوئی بات نہیں کی تھی مگر اس رات میں نے چپکے سے گھر چھوڑ دیا۔

اسی رات ہم نے کورٹ میرج کر لی اور اگلے تین ہفتوں کے اندر اندر میں نے رانیہ کے بھی پیپرز تیار کروا لئے تھے۔ میں اپنی بہن کو ان بندگلیوں سے نکال لانا چاہتی تھی۔ ایک طویل جھڑپ کے بعد میں زبردستی رانیہ کو لے آئی تھی۔ مجھے پھپھوامی کے

آنسوؤں نے بھی موم نہیں کیا تھا، بلکہ جاتے سمے میں نے انہیں جتا کر کہا۔

"آپ چاہتی ہی نہیں کہ ہم اچھی زندگی گزاریں۔ اس مولوی کی اولاد سے بڑی محبت ہے، سگی بھتیجیاں زہر لگتی ہیں۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہوتی تو میرا نکاح خود زیان سے کرتیں۔ مگر آپ کی خودغرضانہ سوچ سے میں واقف ہوں۔ یقیناً زردہ کی زیان سے شادی کا سوچ رکھا ہوگا۔ ان سوتیلے رشتوں نے جب آپ کو دھتکارا تو پھر کہاں جائیں گی؟ ابھی بھی وقت ہے، اور سوچ لیں۔ میں آپ کو بھی لے جانے کے لئے تیار ہوں۔ مگر شرط یہ ہے ان لوگوں سے آپ رابطہ نہیں رکھیں گی۔"

"جاؤ درمکنون! تمہیں اللہ کی امان میں دیا۔ میرا دل اور مت دکھاؤ کہ یہ دکھے دل بددعاؤں کی راہ خود ہموار کر لیتے ہیں۔" انہوں نے رنجیدگی سے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"تیری تربیت میں ہی چوک ہو گئی تھی مجھ سے، ورنہ یہ بھی تو تیرے ساتھ کے بچے ہیں۔ جو بدنامی کی کالک تُو نے میرے منہ پر مل دی ہے، ساری زندگی کے لئے یہی کسک کافی ہوگی۔ لوگ طعنے دیں گے کہ فاخرہ کی بھتیجی گھر سے بھاگ گئی تھی۔ دعا کرنا، تیرے پیچھے جو یہ چار امانتیں مولوی صاحب نے مجھے سونپی تھیں، عزت کے ساتھ اس گھر سے رخصت ہوں۔" وہ چارپائی پر ڈھے گئیں اور میں رانیہ کو گھسیٹتے اس گھر، ان گلیوں سے بہت دُور، روشنیوں کی ایک الگ سی دنیا میں پہنچ گئی تھی۔

مجھ جیسی خوابوں میں رہنے والی لڑکی کے لئے "انڈیانا" جادو کی نگری ثابت ہوا۔ یہاں ہم لوگ زیان کے ایک دوست املاک کے گھر ٹھہرے تھے۔ بڑا ہی پرہیزگار، مُلا ٹائپ نوجوان تھا۔

انڈیانا سے بائی ایئر ہم لوگ کیلیفورنیا پہنچے تھے۔ ہماری آمد سے پہلے ہی ایک فلیٹ ڈیڈی نے رینٹ پر لے دیا تھا۔

زیان نے مجھے بھی ایڈمیشن لینے کا مشورہ دیا، جسے میں نے بری طرح ریجیکٹ دیا۔ میں اب پڑھنا نہیں، صرف انجوائے کرنا چاہتی تھی۔

سچ تو یہ ہے، زیان بہت لبرل تھا۔ اس نے مجھے ہر طرح کی آزادی دی۔ وہ خود بھی آزاد خیال، کھلنڈرا سا نوجوان تھا۔ وہ انسٹیٹیوٹ سے واپس آتا تو ہم دونوں کا زیادہ وقت گھومنے پھرنے میں گزرتا تھا۔ رانیہ اس دوران گھر میں کمرہ بند کئے پھپھو ای کی یاد میں تمام دن آنسو بہاتی رہتی تھی۔

زیان نے مجھے اتنی محبت دی تھی کہ اب میرا اس محبت میں دم گھٹنے لگا تھا۔ محبت کا تھوڑا سا بخار اُترا تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ زیان میں بہت زیادہ حاکمیت پسندی پائی جاتی ہے۔ اسے اپنی زندگی میں لفظ نہیں سے نفرت تھی۔ وہ مجھ پر بھی حکم چلاتا تھا۔ وہ سب پر حکم چلاتا تھا۔ اس کے دوست، جاننے والے، نوکر اُس کے سامنے کچھ ایسا نہیں بولتے تھے جو اسے ناپسند ہو۔

میں اس وقت کی گہرائی اور اپنا شرم ناک ماضی تمہارے سامنے اس لئے کھول رہی ہوں عنوہ! کہ تم زیان کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہو۔ کبھی اس گمان میں اپنے درمیان نفرتوں کو مت جنم دینا۔ میں اس کا بھیانک ماضی ہوں، جسے وہ یقیناً بھلا کر تمہاری طرف بڑھا ہے۔ اگر وہ کچھ بھولتا نہ تو کبھی بھی کسی اور کو میرے علاوہ زندگی میں جگہ نہ دیتا۔"

درمکنون شاید تھک گئی تھی، اسی لئے خاموش ہو گئی۔ کیونکہ اس کی سانسیں دھونکنی کے مانند چل رہی تھیں۔ پورا جسم اس برفیلی ٹھنڈ میں بھی پسینے سے شرابور تھا۔ وہ اپنا دایاں بازو دبا رہی تھی۔ اسے شاید گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ وہ اپنا سینہ بھی مسل رہی تھی۔ عنوہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ دوڑ کر عبدالباری کو بلا لائی تھی۔ کچھ دیر بعد شہر سے ڈاکٹر بھی آ گیا۔

"آپ ان کے ٹیسٹ کروا لیجئے۔ شاید ہارٹ پرابلم ہے۔"

مگر ان کی ہزار کوششوں کے بعد بھی درمکنون چیک اپ کے لئے تیار نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ اسے اب کسی "دوا" کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں ایک اور منظر دیکھ رہی تھیں۔

❀

"عنوہ! جان، میرا جہان!........کہاں ہو تم؟"

شاہ قدوس کی حویلی اس زندگی سے بھرپور آواز سے گونج اٹھی تھی۔ جہاں عنوہ کے ہاتھ سے پلیٹ چھوٹی، وہیں درمکنون نے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"یا اللہ! آزمائش کا یہ سفر کب تمام ہوگا؟........ میں کیسے، کس منہ سے زیان عیث کا سامنا کروں گی؟ نہیں میرے مالک! مجھے اپنی طرف اُٹھتی ان آنکھوں میں اب اور نفرت، حقارت سہنے کا حوصلہ نہیں۔ ان آنکھوں نے مجھے صرف محبت سے ہی دیکھا تھا۔ ان سیاہ، جگر جگر کرتی ہیروں کی طرح دمکتی آنکھوں میں نفرت خود میں نے اپنے ہاتھوں سے رقم کی ہے۔ مگر اور ذلت اٹھانے کا مجھ میں حوصلہ نہیں۔ یا اللہ! سانسوں کے اس بوجھ سے رہائی دے۔ یا اللہ! ذلت کے گڑھے میں گرنے سے بچا لے۔" وہ دل پر ہاتھ

رکھے ستون کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی تھی۔ بارگاہِ ایزدی میں اس کی دعا نے قبولیت کا درجہ پالیا تھا۔ وہ دنیا کی فریب کاری، دکھوں اور ملال کے تمام بوجھ فانی دنیا میں چھوڑ کر دائمی سفر پر روانہ تھی۔ بخدن بی بی نے درمکنون کو گرتے دیکھا اور چلا اٹھی۔

''بی بی صاحب کو دیکھو کیا ہوا ہے؟''

پل ہی پل میں ایک کہرام مچ گیا تھا۔ دو مردوں کی دھتکاری درمکنون کی موت کی خبر نے پوری بستی کو ایک غم کی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہر آنکھ نم تھی۔ ہر دل غم زدہ تھا حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی تھی اور وہ جو سوچا کر تھی کہ کون روئے گا، درمکنون کو جب وہ اس دنیا سے خالی ہاتھ اپنے اصل کی طرف لوٹے گی۔

اور عنوہ زیان عبیث اس کے کان میں کہہ رہی تھی۔

''درمکنون! تم دلوں میں ہمیشہ اچھی یاد بن کر زندہ رہو گی۔ تم نے دریہ سے درمکنوا کا سفر بڑے حوصلے، صبر اور استقلال سے طے کر لیا۔ تمہیں کامیابی کی نوید سنا دی ہے۔ یقیناً جبھی تو اتنی پُرسکون اور مطمئن ہو۔ تم نے بہت تھوڑا کھو کر بہت زیادہ ہے۔ تم کامیاب ہوئیں۔ اتنے لوگ تمہارے جانے کے غم سے نڈھال ہیں اور ماں دنیا سے ناکام گئی کہ اس کی میت پر ایک آنسو بھی بہانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ عیسائی عورت کے ہاتھوں میں دم توڑ کر دنیا سے نامراد چلی گئی۔

مگر درمکنون! تم بہت خوش قسمت ہو۔ ایک دفعہ آنکھ کھول کر تو دیکھو۔ عبدالباری رہا ہے۔ بابا جان رنجیدہ ہیں۔ حنا کی آنکھیں نم ہیں۔ میں درد سے پھٹتا دل تمہارے پاس بیٹھی ہوں۔ تم سے باتیں کر رہی ہوں اور.......اس شاہ قدوس کی کے بیرونی دروازے کے ساتھ شان سے کھڑے بڑ کے درخت کی چھایا میں زیان عبیث غم سے بوجھل دل لئے تمہیں ایک نظر دیکھنے کی غرض سے کھڑا ہے۔ کیا تم ایک دفعہ آنکھیں کھول کر زیان عبیث کو نہیں دیکھو گی؟ اگر دیکھ لو تو اپنی پر مرنے کے بعد بھی غرور آ جائے۔'' عنوہ نے اس کی صبیح پیشانی پر بوسہ دیا پھوٹ کر رو دی۔

''پیاری عنوہ! یہ مختصر سا خط جب تمہیں ملے گا، تب تک میں اس دنیا سے پردہ پوش ہو چکی ہوں گی۔ اس دن بہت سے حقائق میں نے تم سے چھپا لئے تھے۔ شاید میں تمہاری آنکھوں میں اپنے لئے نفرت نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ان آنکھوں میں میرے لئے اتنی عقیدت، اتنا احترام تھا کہ میں چاہ کر بھی اس آدھے سچ کو چھپا گئی۔

میری طبیعت اس وقت بھی بوجھل ہے۔ کیونکہ موت کی آہٹیں میں سن چکی ہوں۔

میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں، وجود لرز رہا ہے اور لکھنے کے لئے الفاظ گم ہو چکے ہیں۔

تمہیں دیکھ کر زیان کی قسمت پر رشک آیا تھا۔ جانتی ہو، زیان یونیورسٹی میں پہلی مرتبہ مجھ میں کس چیز کی وجہ سے انٹرسٹ لینے پر مجبور ہوا تھا؟ سادگی اور معصومیت۔

اس نے دھوکا کھا لیا۔ وہ مجھے ڈائمنڈ سمجھ کر چھو بیٹھا اور میں تو صرف انگارہ تھی۔

اسے بھی جلایا اور خود بھی جلتی رہی۔

ہاں، میری محبت نے سوائے اسے نارسائیوں کے کچھ بھی نہیں دیا۔ زیان مجھ سے نفرت کرتا ہے، اس کے عزیز از جان دوست بھی مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ اور وہ جو املاک ہے، اس نے مجھے دیکھ کر کہا تھا۔

''گندی عورت۔''

ان دو لفظوں نے دریہ کو زمین بوس کر دیا۔ میں پورے قد سے ڈھے گئی اور میرے اوپر عمارت کا تمام ملبہ آن گرا۔

میں لفظ پکڑنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر مجھ سے کچھ لکھا نہیں جا رہا۔ ایک دفعہ پھر زخموں کو کھرچ کر اوّل روز کی طرح کی اذیت کا لطف لینا چاہتی ہوں، اسی لئے بقیہ آدھا سچ بھی سن لو.......جان لو۔''

زیان عبیث اپر کلاس کا وہ نوجوان، جو پہلی نظر میں میری محبت کا اس وقت شکار ہوا

جب اسے محبت کے مفہوم کا علم بھی نہیں تھا۔

میری سادگی کو پاکیزگی کا لبادہ سمجھ کر فریب نظر کا شکار ہو گیا۔ دراصل اپنے اردگرد مصنوعی چہروں والی بے باک عورتوں کو دیکھ کر اس کا جی اوب گیا تھا اسی لئے وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

وہ محبت نہیں تھی، وقتی پسندیدگی تھی جو میرے رنگ ڈھنگ دیکھنے کے بعد سسک سسک کر دم توڑ گئی۔ زیان نے میرے ساتھ جو کمٹ منٹ کی تھی، اسے خلوصِ دل سے نبھایا بھی۔

''زیان کون تھا؟ کیا تھا؟ اور اس کی خواہشات کیا تھیں۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

میں اپنی میٹنگ (کمینگی) کو سامنے رکھے ہوئے تھی۔ میری غرض صرف سپر گلوری لائف تھی۔ مجھے ایک سیڑھی کی ضرورت تھی جو مجھے زیان نے بخوشی مہیا کر دی۔

زیان نے بہت کم عمری میں ڈرنک کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ اسموکنگ بھی کرتا تھا۔ اس کی گرل فرینڈ بھی تھیں۔ یہ اس کا لائف اسٹائل تھا جسے میں نے بدلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود بھی اس کے رنگ میں رنگتی چلی گئی۔

اسے پہلی مرتبہ تب احساس ہوا، جب میں نے بے تحاشا ڈرنک کی اور میرے حواس معطل ہو گئے تھے۔ میں اگر ہائی سوسائٹی کا حصہ بنی تو ویسی خصوصیات بھی مجھ میں ہونی چاہیے تھیں۔

زیان کو ڈیڑھ سال میں پہلی مرتبہ میں نے غصے کے عالم میں دیکھا۔ اس نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا اور رانیہ خوف زدہ ہو کر کمرے میں گھس گئی تھی۔

''نفرت ہے مجھے ڈرنک کرنے والی عورت سے۔'' وہ دھاڑ رہا تھا۔

''خود سے کیوں نہیں نفرت ہوتی۔ تم بھی تو ڈرنک کرتے ہو، مجھے یہ اچھی لگتی ہے۔ میں ضرور پیوں گی۔ مجھے اس کی کھنکتی آواز پسند ہے۔ لو تم بھی دیکھو۔'' میں نے نازک سے بلوریں گلاس میں وہسکی کو ڈالنا شروع کیا۔

''کتنی پیاری آواز ہے، رس بھری، رسیلی۔ گویا کسی پہاڑ کے دامن سے جھرنا ہے۔'' میں نے اسے چڑانا شروع کر دیا تھا۔ اور پھر یہ میرا معمول بن گیا۔ ہنگامے، ڈانس کی محفلیں۔

ایک دن ایسی ہی پارٹی میں میری ملاقات افلاک سے ہوئی۔ افلاک کا بڑا

تھائی لینڈ کے بڑے صنعت کاروں میں شمار ہوتا تھا اس کا۔ ہیرے کی کان کا مالک۔ اس کا بزنس بہت سے ملکوں میں پھیلا ہوا تھا۔

میری اس کے ساتھ بے تکلفی بڑھتی چلی گئی۔ مجھے زیان کا چھوٹا سا کرائے کا فلیٹ اس کے ڈریم ورلڈ کے سامنے چوزوں کے ڈربے جتنا لگتا تھا۔ میری نئی مصروفیت بہت جلد زیان کی نظروں کی زد میں آ گئی۔ انہی دنوں مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ اور جب چیک اپ کروایا تو ٹائم کافی گزر چکا تھا۔

میرے اندر آگ بھڑک اٹھی۔ فی الحال میں بچہ ہرگز نہیں چاہتی تھی، مگر مجبوری یہ تھی کہ مجھے اپنی زندگی بھی عزیز تھی۔

زیان میری بے بسی پر مجھے اور تاؤ دلاتا تھا۔ اور پھر وہ وقت بھی آ گیا، جب ایک چھوٹے سے بچے نے معمولی سے کلینک میں آنکھ کھولی۔ مجھے ان دنوں اپنے اردگرد ہر شے معمولی لگنے لگی تھی۔ زیان نے بچے کے لئے ڈھیروں شاپنگ کی تھی۔ جب وہ کلینک میں آیا تو میں فون پر افلاک سے بات کر رہی تھی۔ وہ کاٹ پر جھک گیا۔ بچے کو دیوانہ وار چومتا رہا۔ اس کے پیار کا کوئی بھی انداز مجھے اب بھانے والا نہیں تھا۔ زیان نے ایک چین میرے گلے میں پہنائی اور دوسری بچے کو۔

پورے تین ہفتوں بعد میرا ننھا سا بیٹا بخار کی لپیٹ میں آ کر آنکھیں موند گیا۔

زیان تو گویا پاگل ہو چکا تھا۔ اس نے بچے کی موت کا شدید صدمہ لیا۔ وہ مجھے مجرم ٹھہراتا رہا۔ میری کوتاہیوں کے بارے میں چلا چلا کر غصے کا اظہار کرتا رہا مگر مجھے اب کسی بھی چیز کی پروا نہیں تھی۔

''تم کوئی گورنس رکھ لیتے۔ بالکل ہی کنگال ہو۔ کشکول پکڑ کر گلیوں میں نکل جاؤ۔ بھیک تو مل ہی جائے گی۔''

رانیہ کانپ کانپ جا رہی تھی اور زیان غصے سے پھنکارتا باہر نکل گیا۔

مجھے اب اس زندان سے نکلنا تھا مگر کیسے؟ اس کے لئے میں نے پوری پلاننگ کی۔ رانیہ کو پاکستان بھیجنے کا لالچ دے کر آمادہ کیا۔ وہ جس قسم کی دبوسی لڑکی تھی، میری ایک جھڑکی پر ہی سارے کس بل نکل گئے۔

میں نے اسے ذہنی ٹارچر کرنا شروع کر دیا تھا مگر وہ میرے منصوبے کو سن کر بدک گئی۔ اس نے چلا چلا کر پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔ جواباً میں نے اسے اتنا مارا کہ وہ نیم بے ہوش ہو گئی۔ اور پھر پلان کے مطابق پیٹر کو گھر بلوا لیا۔

"مانو گی یا یہ آدمی تمہیں اپنے طریقے سے منائے؟" میری دھمکی کو سن کر وہ ...
قدم پر ڈھے گئی تھی۔ پیٹر جیسے درندے کو دیکھ کر اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے۔ میرا
مقصد صرف اسے ڈرانا ہی تھا۔ پیٹر کو بھیج کر میں نے ڈیڈی کو فون کیا جو آج کل امریکہ
آئے ہوئے تھے۔

زیان کے گھر آنے میں صرف دس منٹ رہ گئے تھے جب میں فلیٹ سے نکل گئی
اگلا کام رانیہ کا تھا جو ایک کال گرل کی زندگی گزارنے سے خوف زدہ ہو کر میری ہر با...
ناجائز مان رہی تھی۔ تاہم ایک مرتبہ اس نے بھرّائی آواز میں مجھ سے ضرور کہا تھا۔

"اللہ کرے تم مر جاؤ آپی! کیا اسی دن کے لئے مجھے میری محبتوں سے چھین ...
لے آئی تھیں؟"

میرا پلان مکمل طور پر کامیاب رہا تھا۔ ڈیڈی بھی اچانک گھر میں داخل ہوئے تھے
رانیہ اپنے پھٹے کپڑوں اور خستہ حالت میں زیان کے کمرے سے نکلی اور صرف ایک منٹ
پہلے واش روم میں گھسا زیان میری پلاننگ کو مکمل طور پر کامیاب کر گیا۔

میں نے اتنا واویلا کیا کہ اردگرد کے لوگ چونک اٹھے۔ رانیہ آنسو بہائے جا رہی
تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"مجھے ابھی اور اسی وقت طلاق دو........ میری بہن کے ساتھ........ اُف، ڈیڈی!
مجھے موت کیوں نہیں آ گئی؟"

میں نے بے ہوش ہونے کی بھرپور ایکٹنگ کی تھی۔ زیان میری طرف بڑھا۔ اس
کے ساکت لبوں میں حرکت ہوئی اور اس رات زیان عیث نے پہلی مرتبہ زندگی میں اپنے
باپ کے سامنے شرمندگی محسوس کی۔ اردگرد کی مسلم کمیونٹی کے لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔

زیان چیخ رہا تھا، رانیہ سے التجائیں کر رہا تھا جو ہوش وخرد سے بے گانہ، بے ہوش
پڑی تھی۔ اس کی بے ہوشی نے میرے پلان پر کامیابی کی مہر لگا دی۔

زیان وحشت زدہ سا سب کو دیکھ رہا تھا۔ ڈیڈی نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

"کم از کم رشتوں کے تقدس کا تو خیال کر لیا ہوتا۔" ڈیڈی آگے بڑھے اور زیان
کے منہ پر تھپڑ رسید کر کے صوفے پر ڈھے گئے۔ زیان شاید زندگی میں پہلی مرتبہ رو رہا
تھا۔ کیونکہ اسے اپنے بہتے آنسوؤں پر حیرت ہو رہی تھی۔

زیان نے مجھے طلاق دے دی۔ میں فتح کا احساس لئے اس کے گھر سے نکل آئی۔
"انڈیانا" پہنچ کر میں نے افلاک کو فون کیا اور پھر اس کے "ڈریم ورلڈ" میں داخل ہو...

مگر اس کے بعد میرے خواب چکنا چور ہو گئے۔

میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ افلاک نے سنا تو مجھ پر لعنت بھیجنے خود چلا آیا۔
زیان کا دوست تھا، کلاس فیلو تھا۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ زیان اپنے فرینڈز کے معاملے
...میں بہت لکی تھا۔ اس کے دوست اس سے شدید محبت کرتے تھے۔

زیان کی دربدری اپنی نادانی، کم عقلی اور اندھی خواہشوں کی تکمیل کی خاطر انڈیانا کی
...لوں پر رُل گئی۔

جس کی خاطر میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا، وہ میرے حُسن کا سوداگر نکلا۔ اس نے
...ری خوب صورتی کو کیش کرانا چاہا اور جب میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ کسی مُردہ
... کی طرح مجھے دھتکار گیا۔

"تم جیسی عورتیں........ گھر بسانے کے لئے نہیں، صرف بیڈ روم سجانے کے لئے
ضرورت کے تحت استعمال کی جاتی ہیں اور پھر ٹشو پیپر کی طرح ڈسٹ بن میں پھینک
...یوں اجنبی بن جاتے ہیں، گویا کبھی ملے ہی نہیں تھے۔"

میں پتھرا کر واپس پلٹی تو راستوں کو گم پایا۔ شکاگو سے نیویارک اور پھر واپسی
...تان کے سفر نے روم روم میں تھکن اُتار دی تھی۔

میں ان بدقسمت عورتوں میں سے تھی، جو اپنے ہاتھوں سے گڑھا کھودتی ہیں اور پھر
...ی اس میں گر جاتی ہیں۔ میں نے گھاٹے کا سودا کیا تھا۔ نقصان بھی سارے
...ے حصے میں آئے۔

پھر مجھے بابا صاحب ملے۔ انہوں نے میرے وجود میں چبھے ایک ایک کانٹے کو
...دیا تھا اور کل کی شام آخری کانٹا بھی نکل گیا۔

زیان کو زندگی کی طرف پلٹتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں تمہارے لئے محبت اور چاہ
چمک پا کر میں پُرسکون اور مطمئن ہو گئی ہوں۔ زیان کی تمام تر اذیتوں کے بعد اللہ
...طرف سے ملنے والا خاص تحفہ ہو تم عنوہ! تمہیں دیکھ کر فخر کرنے کو دل کرتا ہے اور
...ن کا تفاخر بے جا نہیں ہے۔

عنوہ! میں تم سے کچھ بھی نہیں مانگوں گی، سوائے اک آخری خواہش کے کہ جب تم
اپنے ہرے بھرے گلشن کو ہمیشہ آباد شاد رہنے کی دعا مانگو گی تو شاہ قدوس کی حویلی کے
...لی جانب موجود شہرِ خموشاں کے ایک کونے میں گہری نیند سوئی درکنون کے لئے
دعائے مغفرت ضرور کرنا۔"

"میں زیان عبیث ہوں۔ عبیث فریدی کا بیٹا۔ جسے وہ میری ماں سے چھین کر ادا
لے گئے تھے۔ میں نے آزاد فضاؤں میں زندگی کے ابتدائی کئی سال گزارے تھے
حُسن اور عریانی کو دیکھ کر میرا دل عورت سے ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔
اور پھر ڈیڈی کی فرینڈز کو گھر میں آتا جاتا دیکھ کر میرے ذہن میں عورت کا امیج بگڑ
کر رہ گیا۔
ہماری سوسائٹی میں دوستیاں، محفلیں اور شراب شباب کے جشن اک عام نارمل
روٹین کی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔
میں ڈرنک بھی کرتا تھا۔ اور جب لاس ویگاس میں ڈیڈی کے ہمراہ جتنا بھی عرصہ
رہا تو خصوصاً ٹونی کے کلب میں جوا کھیلنے کا شغل بھی کرتا رہا تھا۔ پھر ہم دونوں پاکستان
سیٹل ہو گئے۔
امی کے بارے میں ڈیڈی نے ہمیشہ مجھے متنفر کرنے کی کوشش کی تھی، جس کی وجہ
سے مجھے ماں کا ذکر بھی پسند نہیں رہا تھا۔ پھر ہم پاکستان سیٹل ہو گئے۔
یوں ہی بے مقصد زندگی گزارتے، ہلا گلا، پارٹیز اور ہنگاموں میں خود کو مصروف
رکھتے اور کبھی کبھی یونیورسٹی کا چکر لگا کر ڈیڈی کو مطمئن کرنے کے چکر میں زیان عبیث
خود بھی چکرا گیا۔ بے ارادہ سی نگاہ اٹھی تھی جو دل کے پار اتر گئی۔ درمکنون، میری پہلی
محبت، پہلی کمٹ منٹ، پہلی عورت جو مجھے بہت اچھی لگی اور دل نے اس کے ساتھ کی
تمنا کر لی۔ مجھے جو چیز پسند آئے، میں اسے حاصل کر لیتا ہوں۔ وہ مجھے اچھی لگی، میں
نے اسے اپنا بنا لیا۔ ٹوٹل غلط طریقے سے وہ گھر سے بھاگ آئی۔ اس گھر سے، جہاں
میری ماں رہتی تھی۔ ہم نے کورٹ میرج کر لی۔ ڈیڈی نے دریہ کو کھلے دل سے قبول کر
لیا اور چند دن بعد ہم لوگ امریکہ چلے آئے۔
وہ درمکنون تھی، جس کا نام مجھے مشکل لگتا تھا۔ سو میں نے اپنی آسانی کے لئے اسے
دریہ کا نام دیا۔
وہ میری پہلی کمٹ منٹ تھی، جسے میں نے آخری دم تک نبھانے کا عہد کر رکھا تھا۔
میرے لاشعور میں خاندان ٹوٹنے کا خدشہ اول روز سے ہی موجود تھا۔ اسی لئے میں دریہ
کو گھر تک محدود رکھ کر اسے خود سے بے زار نہیں کرنا چاہتا تھا۔
مگر وہ اتنی جلدی یہاں کے رنگ ڈھنگ اپنا لے گی، یہ میرے گمان میں بھی نہیں

تھا۔ اسموکنگ، ڈرنک، رات گئے تک گھر سے غائب رہنا، اس کا مختصر سا لباس........
میرے لئے یہ سب نا قابلِ برداشت تھا۔ میں اس کی ڈھٹائی پر چلانے لگا۔
اس نے اپنی روش نہیں بدلی تھی جب ایک دن املاک کا فون آیا۔
"یار! بھابی کو سمجھاؤ۔ یہ کس سمت چل پڑی ہیں؟ فرسٹ ٹائم میں نے انہیں دیکھا
تو تمہاری خوش قسمتی پر رشک سا آیا تھا۔ اور اب۔" وہ افسوس سے کہہ رہا تھا جبکہ میرا
رواں رواں سلگنے لگا۔
اس طرح ایک دو مزید املاک کے فون آئے۔
"تم تو جانتے ہو نا، افلاک بھائی کی عادت کو۔ بڑے گھاگ شکاری ہیں۔ تم بھابی
کو بھی سمجھاتے کیوں نہیں؟" اور میں اسے کیا بتاتا کہ وہ سمجھنے اور کچھ سوچنے کی پوزیشن
سے بہت آگے نکل گئی ہے۔
بچے کی پیدائش، ڈیتھ اور پھر دریہ کی نا قابلِ برداشت حرکتوں نے بنیادی طور پر
مجھے توڑ ڈالا تھا اور اس صورتِ حال نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔
میں اپنے گھر کو بچانا چاہتا تھا اور درپردہ وہ میری پشت میں تیر گھونپنے کی مکمل
پلاننگ کر چکی تھی اور اس کے لئے دریہ نے اپنی بہن کا انتخاب کیا تھا۔
روتی دھوتی رانیہ، واویلا کرتی دریہ اور پھر ڈیڈی کے ساتھ اردگرد والے فلیٹس کے
لوگ، جنہیں دریہ خود بلا کر لائی تھی۔
بہت عرصہ بعد تک بھی میں اس کے ڈرامے کو سمجھ نہیں پایا تھا، جب تک خود رانیہ
اعتراف نہ کر لیتی۔ اور پھر رانیہ کے اعتراف نے میرے اندر انتقام کی آگ بھڑکا دی۔
رانیہ ظہیر، دریہ کی چھوٹی بہن، جس کا نکاح ڈیڈی نے اس وقت میرے ساتھ کیا
تھا، جب میرے ہوش و حواس سلامت نہیں تھے۔ دریہ کو طلاق دینے کے بعد اتنی ذلت،
اتنی توہین سمیٹتے ہوئے اور اس کا تمام تر ڈرامہ سمجھنے کے بعد میرا نروس بریک ڈاؤن
ہوتے ہوتے بچا تھا۔ میرے دوستوں نے میرے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔ خصوصاً حسام اور
افلاک تو رہتے ہی میرے پاس تھے۔
اور جس دن مجھے پتہ چلا کہ افلاک نے دریہ کو دھتکار دیا ہے، اسی شام کیلیفورنیا کی
سڑکوں پر دریہ کی محبت نے میرے دل سے آخری ہچکی لے کر دم توڑ دیا تھا۔ میں نے
سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں اتنی ذلت اٹھاؤں گا۔ میرے دل کے شہر پر بڑی بھیانک
شام اُتری تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اب کوئی سحر طلوع نہیں ہو گی۔ محبت کے شہر کو کالی

شام نے آن گھیرا تھا۔ اس نے مجھے ٹھکرایا اور میرے اندر ایک اور زیان عبیث نے جنم لیا۔ مجھ پر دولت اکٹھی کرنے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ پھر میں نے اتنا پیسہ کمایا، مجھے خود اپنے اثاثوں کی مالیت کا اندازہ نہیں رہا تھا۔

دریہ نے محبت کا سودا دولت کے ساتھ کیا تھا۔ آخری وقت میں ڈیڈی نے کچھ اعتراف کئے تھے۔ مجھے عنوہ کے بارے میں بتایا اور رانیہ کو آزاد کرنے کی بھی التجا کی۔ وہ میرا رانیہ کے ساتھ رویہ دیکھ کر رنجیدہ رہتے تھے اور اپنے اس وقت کے فیصلے پر پچھتاتے تھے۔ یہ رشتہ صرف انتقام کا تھا۔ میرے دل میں ان تین عورتوں میں سے سب سے زیادہ جگہ بنانے والی عنوہ ہاشم ہے، جس سے میں نے زندگی گزارنے کا شعور پایا۔ سلیقہ سیکھا۔

درمکنون نے مجھے نفرت کرنا سکھایا تھا۔ رانیہ نے انتقام کے رنگوں سے آشنا کروایا تھا اور محبت کرنا میں نے عنوہ سے سیکھا ہے۔ جس نے مجھے یہ باور کروایا تھا کہ زندگی کا اصل مقصد پیسہ کمانا نہیں.......اور جو مجھے بڑی محبت اور دلجمعی سے نماز کا طریقہ بتاتی تھی۔ جس کے ہاتھوں سے اپنے ذاتی کام کروا کر میرے دل میں سکون کی لہریں دوڑنے لگتی تھیں۔

حالانکہ اب دو بچوں کی مصروفیت کی وجہ سے اس کی توجہ مجھ پر ذرا کم کم ہی ہوتی ہے مگر مجھے بھی اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے ہزار طریقے آتے ہیں۔ وہ اکثر چڑ کر کہتی ہے۔ ''آپ بھی بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتے ہیں۔''

ہر نئی طلوع ہونے والی سحر مجھے عنوہ کے مزید قریب کر دیتی ہے۔ اس کی چاہتوں کے بھی ہزار رنگ ہیں اور ہر رنگ پہلے سے بھی زیادہ دلکش اور حسین ہوتا ہے۔ میں اپنے ہرجائی کی اس محبت کی شام کو امریکہ کے شہر کیلیفورنیا کے سپرد کر آیا تھا۔ کیونکہ مجھے اپنے دیس کی چمکتی سنہری طلوع ہونے والی سحر اپنی طرف بلا رہی تھی۔ ڈیڈی کی آخری وصیت مجھے اپنی زندگی کے حاصل کے قریب لے آئے تھی، یہ میں نے سوچا نہیں تھا۔

میں نے عنوہ کو ایک پارٹی میں دیکھا اور اس کا اسیر ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر سادگی، معصومیت نے مجھے اپنی جانب مائل کیا تھا، مگر اب کے نگاہ نے گوہر تاب کو اندر تک سے پرکھ لیا تھا۔

''زیان کے بچے!'' عنوہ نے بیڈ روم کے دوازے میں جھانک کر کڑی نگاہ سے مجھے گھورا تو میری سوچوں کو بھی بریک لگ گئے۔

''ہاں بچوں کی اماں!'' میں نے بڑی محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ

میری نظر کی گری سے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیمرہ لینے آئے تھے آپ۔ نیچے رخصتی کے لئے رمیز اور زروہ بے تاب ہو رہے ہیں اور آپ کھڑکی کھولے چاند ستاروں سے باتیں کرنے میں مصروف ہیں۔''

میں تقریباً دو دو سیڑھیاں پھلانگتا نیچے آیا تو عبدالباری کو بھی گھورتے دیکھ کر سنبھلا۔

''خیر تو ہے؟ آج سب نظروں کے تیروں سے گھائل کرنے پر تلے ہو۔''

''آپ کے بھلکڑ پن کو سیلوٹ کرنے کو دل چاہ رہا ہے، زیان بھائی! جلدی آیئے۔ امی خفا ہو رہی ہیں۔''

''اوہو، سوری یار! آ رہا ہوں۔ تم چلو۔'' میں نے کچن میں ہدایات دیتی عنوہ کو بازو سے گھسیٹا اور باہر لان میں چلا آیا۔

آج سدیہ اور وصی کی شادی کی تقریب تھی۔ پورا لان برقی قمقموں سے سجا عجب بہار دکھا رہا تھا۔

''مجھے سو فیصد یقین تھا کہ تم اندر رومانس بگھارنے لگے ہو گے۔'' ہم دونوں کو ایک ساتھ آتا دیکھ کر میجر رمیز نے شرارت سے کہا تو میں اپنے ازلی پُراعتماد انداز میں بولا۔

''تم پر کسی نے کرفیو تو نہیں لگایا....... برابر ہی تو بیٹھی ہیں، ہو جاؤ شروع۔'' رمیز کا قہقہہ بے ساختہ تھا جبکہ زروہ جھینپ کر اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

عیشہ، علی کو گود میں اٹھائے، ساڑھی سنبھالنے کے چکر میں ہلکان ہو رہی تھی۔ جوں ہی میری نظر عیشہ پر پڑی، میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دو ماہ کے پیارے علی کو گود میں اٹھاتے ہوئے بولا۔

''تمہیں کس احمق نے ساڑھی پہننے کا مشورہ دیا تھا؟''

''آپ کے بھائی نے۔'' عیشہ برجستہ بولی تو سب ہی ہنس پڑے۔ فاخرہ نے اک سرشاری کے عالم میں اپنے ہرے بھرے گلشن کو دیکھا تھا۔ آنکھ سے دو تشکر کے آنسو ٹپکے تھے۔

''عبیث فریدی! اسی گھر سے تم نے مجھے نکال دیا تھا۔ جب میرے پیروں کے نیچے زمین رہی تھی نہ سر پر آسمان...... آج دیکھو پلٹ کر، میرے دائیں بائیں دو مضبوط ستون کھڑے ہیں۔'

انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کی پیشانی چوم کر سوچا۔ زیان جب قمری خالہ کے گھر سے معافی مانگنے اور لینے کے لئے آیا تو ان کا دل خود بخود شفاف آئینے کے مانند

ہو گیا تھا۔

رانیہ اور مبین دبئی سیٹل ہو چکے تھے۔ زروہ اپنے گھر میں خوش باش تھی۔ سنیہ کے لئے زرین نے بڑی چاہت سے دستِ سوال دراز کیا تھا۔

مہک تو ابھی چھوٹی تھی، البتہ سارہ کی انہیں بہت فکر تھی۔ اور آج اس تقریب کے اختتام سے پہلے ہی ان کی یہ پریشانی بھی دور ہو گئی۔

املاک نے چپکے سے زیان کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ اس نے عنوہ تک بات پہنچائی اور یوں املاک نے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا معاملہ کر کے عنوہ سے ادھار رنگ لی اور فاخرہ کے ساتھ بیٹھی قمر النساء خالہ کے ہاتھ میں تھما دی۔ خالہ جان اس ادا پر نہال ہو کر املاک کے سر پر دو تین بوسے لینے کے بعد شرمائی لجائی سارہ تک پہنچ چکی تھیں۔

ادھر عیشہ، فاخرہ سے کہہ رہی تھی۔

''امی جان! آپ نے اور امبرین آنٹی نے روایتی دیورانی جیٹھانی والا مزا تو لیا نہیں...... جو نوک جھونک ہر وقت زیان بھائی اور عبدالباری کے درمیان ہوتی ہے، اس سے بھی لطف اندوز نہیں ہوتی ہوں گی آپ دونوں، جیسے میں اور بھابی لطف اندوز ہوتے ہیں۔''

''بس بیٹا! ساتھ رہنے کا موقع نہیں مل سکا۔'' وہ عیشہ کی اونگیوں بونگیوں کے جواب میں ہنستے ہوئے کچھ نہ کچھ کہہ دیتی تھیں۔

عنوہ، حنا اور حسّام کا فون سن کر آئی جو آج کل لندن میں ہوتے تھے کیونکہ لندن والی فیکٹری حسّام بھائی کے انڈر تھی اور اس خوشی کے موقع پر وہ دونوں مصروفیت کی وجہ سے نہیں آ سکے تھے۔

عنوہ نے لان پر اک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ ہر کوئی مسرور، شاد اور ہنس رہا تھا۔ بابا جان اب ان کے درمیان نہیں رہے تھے، بلکہ حج کے دوران ہارٹ اٹیک ہونے کی وجہ سے اسی پاک سرزمین میں ہی دفنا دیئے گئے۔ یہی ان کی وصیت تھی۔ ان کی دیرینہ آرزو پوری ہو چکی تھی۔

آج چاند کی چودہ تاریخ تھی۔ ہر شے ٹھنڈی میٹھی چاندنی میں نہائی لگ رہی تھی۔

آج سے چند دن پہلے وہ زیان کا اچھا موڈ دیکھ کر بہت عرصے بعد درمکنون کا ذکر چھیڑ بیٹھی تھی۔

''آپ نے اسے معاف کر دیا ہے نا......؟''

''کسے؟'' زیان نے حیرت سے پوچھا۔ حالانکہ جان چکا تھا کہ وہ کس کے بارے میں بات کر رہی ہے۔

''درمکنون کو۔'' عنوہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے پوری سچائی سے کہا تھا۔ ''جب اللہ اسے معاف کر چکا ہے تو پھر ہم تو معمولی سے، حقیر بندے ہیں اس کے۔ اور پھر تم ہی تو کہتی ہو، معاف کرنے والے اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں۔''

عنوہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔

''ارے ماریہ کو جو جھوٹے لارے لگائے تھے، ماریہ کا کیا بنے گا؟''

''مجھے بیوی چاہئے، ڈیکوریشن پیس نہیں۔'' املاک نے سنجیدگی سے کہا۔

''شکر ہے، تمہیں بھی عقلِ سلیم آ گئی ہے، ورنہ خوامخواہ اس پر لٹو ہو رہے تھے۔'' زیان نے چڑا کر کہا۔

''بس یار! نظر کا دھوکا تھی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سارہ کی طرف دیکھا۔ عنوہ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے قدرے الگ تھلگ بیٹھی فاخرہ کے قریب آ گئی۔

درمکنون آج ان کے درمیان نہیں تھی۔ فاخرہ یقیناً اس کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں نم نم سی تھیں۔ انہوں نے اور عنوہ نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر دودھیا چاندنی لٹاتے چاند کی طرف دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے درمکنون کا چہرہ نور میں نہایا، ستاروں کے جھرمٹ میں سے جھانک رہا ہے۔ اس نے فاخرہ کے کندھے پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور بولی۔

''امی جان! وہ سب سے اچھی، پرسون جگہ گئی ہے۔ جہاں باغ ہوں گے، نہریں ہوں گی، خوشبوئیں ہوں گی، روشنیاں ہوں گی۔ جہاں رنج نہیں ہو گا، دکھ نہیں ہوں گے، پچھتاوے نہیں ہوں گے۔ اور نہ ہی ملال کے سائے ہوں گے۔''

''ہوں......'' انہوں نے گہری اطمینان بھری سانس کھینچ کر تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوا، گویا چاند بھی مسکرا کر تائید کر رہا ہے۔

صباح کی شہری

بڑی افسردہ اور غمگین شام، ہاسٹل کی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر بین کر رہی تھی۔

آج گگن پر کوئی چاند تھا، نہ کوئی تارہ۔ ہر شے سیاہ دھوئیں میں لپٹی عجب خوف ناک اور بھیانک دکھائی دے رہی تھی۔

ہاسٹل کے لان میں لگے سرسبز اونچے اونچے درخت کسی دیو کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہوا بھی سخت خشک اور کٹیلی تھی۔ زمین پر پاؤں رکھا تو یوں لگا، گویا انگارے بچھے ہوں۔ اتنی تپش، اس قدر جلن تھی کہ آنکھیں برس برس کر تھکنے لگیں۔ زمین گرم نہیں تھی، یہ آگ تو اس کے اندر بھڑک رہی تھی، سلگ رہی تھی۔ اس کا جسم تنور کے مانند تپ رہا تھا۔ کوئلوں کی بھٹی کی طرح سلگ رہا تھا۔ پیروں پر آبلے تھے، آنکھیں لہو لہو تھیں اور روح زخم زخم۔

"اس نے میری انسلٹ کی، مجھے برا بھلا کہا، میں خاموش رہی۔ اس نے مجھے ذلیل کیا، میں خاموش رہی۔ میری زبان گویا تالو سے چپک گئی۔ تمہیں کیا پتہ عانیہ! مجھ پر کتنے عذاب اُترے تھے۔ مگر میں پھر بھی چپ تھی۔ میری آواز کھوگئی تھی۔ الفاظ گم ہو گئے اور لبوں پر تالا لگ گیا۔ مگر جب اس نے میرے کردار کو رگیدا، میری عزتِ نفس، نسوانی انا کو مجروح کرنا چاہا تو میں خاموش نہیں رہ سکی۔ میں نے اسے بھی اذیت سے دوچار کرنا چاہا مگر کچھ بھی نہ کر سکی۔ صرف روتی رہی، آنسو بہاتی رہی۔ مجھے اس کا منہ توڑ جواب دینا چاہئے تھا، اس کے چہرے کو مسخ کر دینا چاہئے تھا۔ مگر میں ساکت، خاموش اور گم سم سی کھڑی رہ گئی اور وہ میری ذات کے پرخچے اُڑاتی شان سے چلی گئی۔

اس نے مجھے زارون کی، سب کی نظروں سے گرانا چاہا۔ میرے دامن میں ذلتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ میری اوڑھنی کو لفظوں کے تیروں سے چھلنی کر دیا۔ وہ میری ہستی کے غرور کو تہس نہس کر گئی۔ وہ عدن فرجند ہے۔ بہت غرور ہے اسے باپ کی دولت وحشمت پر

اس نے مجھے انسیکٹ سمجھا، مجھے پیروں سے کچل کر چل دی۔

نہیں عدن فرجند! تم نے اچھا نہیں کیا........ تم نے مجھے ذلیل کیا۔ میرے باپ نے مجھے انسانیت کے درس دیئے تھے، مگر یہاں تو کچھ نہیں ہے۔ نہ انسانیت، نہ محبت، نہ عزت۔

وہ رو رو کر بے حال ہوگئی تھی۔ اس کا سر عانیہ کی گود میں تھا، جو خود بھی بے آواز رو رہی تھی۔

❁

بوئنگ سیون تھری سیون ایس طیارہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔

وہ ایئرپورٹ کی شاندار عمارت سے باہر نکلی۔ ٹیکسی کی تلاش میں نظر دوڑائی تو نگاہ نے ایک چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔

قاسم انکل پُر جوش سے اس کی طرف بڑھے تھے۔ انہوں نے یقیناً اسے پہچان لیا تھا۔ اور وہ بھی انکل کو پہچان چکی تھی۔ کیونکہ اس نے انکل کی تصویریں پاپا کے پاس دیکھ رکھی تھی۔

"شہرے........!" انکل نے آگے بڑھ کر یقین بھرے لہجے میں کہا تو وہ مسکرا کر سر ہلانے لگی تھی۔

"کیسی ہو بیٹا؟........ سفر میں پریشانی تو نہیں ہوئی؟" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

"پہلی مرتبہ سفر کیا ہے، اکیلے، پاپا کے بغیر۔" وہ اس کے سوٹ کیس، ٹیکسی میں رکھواتے ہوئے بول رہے تھے۔

وہ انہیں کیا بتاتی کہ ساری زندگی اس نے تنہا ہی سفر کیا ہے۔ کیونکہ وہ سیاحت کی دیوانی تھی۔ پاپا ہارٹ پیشنٹ تھے، کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ البتہ انہوں نے اس کے جنونی شوق کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ کھڑی نہیں کی تھی بلکہ وہ خود اس کے گھومنے پھرنے کے لئے تمام انتظامات کرتے تھے۔

وہ صباح (ملائشیا) کی رہائشی تھی۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ وہ لوگ کئی نسلوں سے "صباح" میں آباد تھے۔ اس کے گرینڈ پاپا کے دادا بہت سال پہلے تلاشِ معاش کی غرض سے ملائیشیا چلے گئے تھے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ اس کے پاپا حسنین احمد کی شادی پاکستان کے ایک بڑے خاندان میں ہوئی تھی، اس طرح پاکستان سے تعلق برقرار

تھا۔ ممی کا میکہ بھی پاکستان کے شہر کراچی میں آباد تھا۔ مگر نہ جانے کیا وجہ تھی کہ پاپا اپنے آخری وقت میں انکل قاسم کا ایڈریس دے کر پاکستان ہمیشہ کے لئے رہنے پر آمادہ کر چکے تھے۔ قاسم انکل نہ صرف پاپا کے دوست تھے بلکہ کزن بھی تھے۔ اکثر فون پر انکل اور ان کی بیگم صوبیہ آنٹی سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔

وہ بہت شوق اور اشتیاق کے عالم میں کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے حسین فطری مناظر کی دلکشی میں کھوئی ہوئی تھی، جب انکل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''حسنین ٹھیک کہتا تھا کہ شہری، پاکستان کی دیوانی ہے۔''

''مجھے پاکستان سے فطری محبت ہے۔ یہ میرے بزرگوں کا ملک ہے۔'' اس نے مسکرا کر مختصر سا جواب دیا اور ایک مرتبہ پھر اردگرد کی خوب صورتی میں کھو گئی۔ مگر صرف آدھے گھنٹے کے بعد خوب صورت مناظر کہیں دور رہ گئے تھے۔ اسے ایک پل کے لئے یوں محسوس ہوا گویا وہ ایک فلم دیکھ رہی تھی، جس کا اختتام چند منٹوں میں ہی ہو گیا تھا۔

ٹیکسی اب پنڈی کی شاہراہ پر رواں دواں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک قدرے پرانی سی بلڈنگ کے قریب ٹیکسی رک گئی۔

''آؤ بیٹا!'' وہ انکل کی ہمراہی میں کچھ حیران پریشان سی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔

دروازہ بیمار بیمار سی ثوبیہ آنٹی نے کھولا تھا۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے بھرپور انداز میں لپٹا کر ماتھے کو چوما۔

''شہری تو تصویروں سے زیادہ خوب صورت ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے انکل سے کہہ رہی تھیں۔ شہرے بھی دھیرے سے مسکرا دی۔

یہ ایک تنگ سا، تین کمروں کا فلیٹ تھا۔ وہ انکل، آنٹی کی مالی پوزیشن کا اندازہ لگا کر قدرے پشیمان ہو گئی تھی۔

'پاپا نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ انکل کی معاشی حالت کس قدر ڈاؤن ہے۔' شہری نے افسردگی سے سوچا۔ اسے حقیقتاً ان کی موجودہ حالت دیکھ کر گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ اور جب وہ آنٹی کے اصرار پر فریش ہونے کے بعد کھانے کی میز تک آئی اور ٹیبل کو لوازمات سے پُر دیکھ کر مزید پشیمان ہو گئی۔

''آنٹی! آپ نے کیوں اتنا تکلف کیا ہے؟ آپ کے خیال میں کیا میں پیٹو ہوں؟''

''تم ہماری بیٹی ہو شہرے! خود کو مہمان مت سمجھنا۔ کھانا کھاؤ۔ میں تمہارے لئے دودھ گرم کرتی ہوں۔ پھر آرام سے سو جانا۔'' انہوں نے محبت سے کہا اور پھر مختصر سے

کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ انکل بھی آ گئے تھے اور کھانے کے دوران اس کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ رکھ رہے تھے۔ آنٹی گرم گرم پھلکے لے آئیں۔

''شہرے! کھانا کھاؤ، ٹونگو نہیں۔'' انہوں نے خفگی سے کہا تو وہ پلیٹ پر جھک گئی۔

''یہ سویٹ تو ٹرائی کرو۔'' انکل نے ٹرائفل کا باؤل اس کے سامنے کھسکا دیا تو وہ مروت کے مارے تھوڑی سی سویٹ پیالی میں نکال کر کھانے لگی۔ اسے سویٹ میٹ میں کچھ بھی پسند نہیں تھا، حتیٰ کہ چاکلیٹ اور آئس کریم بھی وہ نہیں کھاتی تھی۔ چائے بغیر چینی کے۔ اس کے جاننے والے بے حد حیران ہوتے تھے۔ اسے سپائسی فوڈز پسند تھے۔ املی کی چٹنی اور گول گپے فیورٹ تھے، جس کی بدولت اس کا گلا اکثر خراب رہتا تھا اور پاپا سے بہت ساری ڈانٹ کھانی پڑتی۔

''شہری! تمہیں پاکستان دیکھنے کا بہت شوق تھا نا........ اب خوب گھومنا پھرنا، انجوائے کرنا۔'' آنٹی کھانے کے بعد برتن سمیٹنے لگیں تو شہرے بھی ان کی ہیلپ کے خیال سے کچن میں آ گئی۔

''آنٹی! گھوموں پھروں گی تو ضرور، مگر اس سے پہلے میں اپنے ایڈمیشن کے متعلق بہت کانشس ہو رہی ہوں۔ کیا مجھے عانیہ کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جائے گا نا؟'' اس کی آنکھوں میں پریشانی کے ہلکے سائے دیکھ کر آنٹی نرمی سے مسکرائیں۔

''کیوں پریشان ہو رہی ہو؟ ابھی تمہاری عانیہ سے فون پر بات کرواتی ہوں۔ عانیہ کو تم سے ملنے کا بے حد شوق ہے۔ وہ ہاسٹل میں شدت سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔'' آنٹی نے اپنی اکلوتی بیٹی عانیہ کا حوالہ دیا تھا۔ شہرے پُرسکون سی سر ہلا کر برتن خشک کرنے لگی۔ اسی پل آنٹی نے شہرے کی طرف مڑ کر دیکھا اور اس کے ہاتھ سے پلیٹ پکڑ کر ٹیبل پر رکھ دی۔

''یہ دودھ کا گلاس سلیب پر سے اٹھاؤ اور سامنے کمرے میں چلی جاؤ۔ ایک بھرپور نیند لینے کے بعد تم فریش ہو جاؤ گی۔ اب صبح ملاقات کریں گے۔ جاؤ شاباش! یہ سامنے والا عانیہ کا کمرہ ہے۔'' انہوں نے خوش دلی سے کہا تو وہ ناراض سی، بغیر گلاس اٹھائے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

یہ عانیہ کا کمرہ تھا۔ جس میں دو پلنگ تھے، ایک کتابوں سے لدی ٹیبل تھی، ایک عدد وارڈروب اور بس۔ اس نے دو منٹ میں پورے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر پلنگ پر دراز ہو گئی۔

کچھ دیر بعد آنٹی فون سیٹ اٹھا کر اور دودھ سے لبالب بھرے گلاس سمیت آ گئی تھیں۔

"تم دودھ پیو، تب تک میں عانیہ سے بات کرتی ہوں۔" آنٹی نے گلاس زبردستی اس کے ہاتھ میں تھمایا اور پھر خود فون پر مصروف ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے فون شہرے کو تھمایا۔

"عانیہ تم سے بات کرنے کو بے چین ہے۔"

"آپ ہمارے ملک آئیں، آپ کا بہت شکریہ۔" شہرے نے ریسیور کان سے لگایا ہی تھا کہ دوسری طرف گنگناتی آواز سنائی دی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی تھی۔

"کیسی ہو عانیہ؟"

"فرسٹ کلاس۔ ایک دم فریش، حسین، ذہین۔ اور باقی تم دیکھنے کے بعد بتانا۔" عانیہ نے شوخی سے مبالغہ آمیزی کی حد کر دی تھی۔

شہرے مسکرائی اور بولی۔

"میں نے اپنے سرٹیفکیٹ بھجوا دیے تھے۔ کیا ایڈمیشن ہو جائے گا؟"

"کیوں نہیں۔ تمہارا اکیڈمک ریکارڈ بہت اچھا ہے۔" عانیہ نے کھلے دل سے سراہا تھا۔ شہرے اس سے بات کر کے قدرے مطمئن سی ہو گئی تھی۔ اسی لئے آنٹی اور انکل کو شب بخیر کہہ کر سکون سے پلنگ پر لیٹ گئی اور آنکھیں بھی موند لیں۔ مگر بند پلکوں کے اس پار بہت سے منظر گڈمڈ ہو رہے تھے۔ کچھ یادیں، اپنا گھر، آنگن، دریچہ...... وہ سوچوں کی رو میں بہتے ہوئے دُور، بہت دُور اپنے شہر میں جا پہنچی تھی، جہاں اس کا بہت ہی خوب صورت، گلابی پھولوں سے ڈھکا "ہوم لینڈ" تھا۔

❁
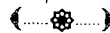
وہ حسنین احمد اور یاسمہ حسنین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ ان کی شادی کے چار سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ منی سی، بے حد سپید بچی کو پہلی مرتبہ گود میں لے کر حسنین احمد نے اسے شہرے (**Shehray**) کا نام دیا تھا۔

یہ ایک ترکی نام تھا، جس کے معنی انتہائی خوب صورت کے تھے۔ وہ ایک صحت مند اور حسین بچی تھی اور اپنی ممی اور پاپا کی آنکھوں کا تارہ۔ شہرے نے ممی کو نہیں دیکھا تھا۔ ہلکی سی کوئی اچھی "یاد" بھی ماں کے حوالے سے اسے یاد نہیں تھی۔ کیونکہ ممی ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئی تھیں۔ اس سیاہ شام کے بعد وہ اور پاپا ایک دوسرے کے دکھ سُکھ

کے سانجھی بن گئے تھے۔

حسنین احمد کی شہرے میں جان بند تھی۔ وہ اسے دیکھ کر جیتے تھے۔ اس کی ہر فرمائش، ہر خواہش کو بن کہے جان جاتے اور پلک جھپکتے پورا کر دیتے۔ اس کی آنکھ کے آنسو ان کا دل پگھلا دیتے تھے۔ اتنی ڈھیر ساری توجہ اور محبت نے اسے بگڑنے نہیں دیا تھا۔

اس کی شخصیت میں کوئی دراڑ نہیں تھی۔ کیونکہ اس نے ایک محبت بھرے، متوازن ماحول میں پرورش پائی تھی۔ وہ سلجھی سوچوں کی حامل ایک نہایت با اخلاق، خلیق، شفیق، نرم دل، ہمدرد فطرت کی لڑکی تھی۔ پاپا نے اسے راست گوئی، سچائی اور سب کی عزت و تکریم کے جو اسباق یاد کروائے تھے، وہ ہمیشہ کے لئے حافظے میں محفوظ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے پاپا کی بہت ہی لاڈلی اور فرماں بردار بیٹی تھی۔

شعور کے مراحل طے کرتے ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے پاس جو سب سے قیمتی "متاع" ماں تھی، وہ نہیں ہے۔ اور اس احساس کی شدت نے شہرے کو پاپا کے مزید قریب کر دیا تھا۔ وہ ان کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتی۔

وہ اسٹڈی میں ہوتے تو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چائے کا گرما گرم کپ پہنچا دیتی۔ پاپا سونے کے لئے بیڈروم کی طرف بڑھتے اور شہرے چپکے سے نیم گرم دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ آتی۔ رات کو ان کے آفس جانے کی تیاری پوری ذمہ داری سے کرتی۔ کپڑے، ٹائی، کوٹ اور میچنگ اسٹاکنگ۔ ہر شے ترتیب سے صوفے پر رکھی ہوتی، جوتے پالش شدہ چمک رہے ہوتے اور حسنین احمد کی آنکھیں بھیگنے لگتیں۔

یہ شہرے کی روٹین تھی، جو پچھلے چھ ماہ سے وہ دیکھ رہے تھے۔ ایک دن انہوں نے شہرے کو ٹوکا تو وہ ناراض ہو گئی۔

"اگر میں یہ سب کچھ نہ کروں تو کون کرے گا؟"

"مس ایوا ہیں نا۔" انہوں نے نرمی سے سمجھانا چاہا تو وہ مزید خفا ہو گئی اور بولی۔ "مجھے مس ایوا اچھی نہیں لگتیں۔ اور نہ ہی بٹلر جمل اچھا لگتا ہے۔ دونوں چور ہیں۔ سارا کچن خالی کر دیتے ہیں۔ اور فریج سے پھل نکال کر کھاتے ہیں۔ آپ بس انہیں فارغ کریں۔"

وہ کچھ دنوں سے اپنے گھر کے دونوں نوکروں کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ ان کی تمام تر حرکتوں کو نوٹ کرنے کے بعد اس نے انہیں فارغ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

حسنین احمد دل ہی دل میں اپنی بیٹی کی ذمہ دارانہ طبیعت سے بہت خوش تھے۔ انہوں

نے خود بھی دونوں نوکروں کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور بیٹی کی فارقہ جس کو سراہا بھی۔

مس ایوا اور جمل دونوں کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ کچھ کوششوں کے بعد انہوں نے ''جمس'' نامی ایک بوڑھے خانساماں کو بطور کک گھر میں ملازمت دے دی تھی جو کہ پہلے ان کی فوڈ فیکٹری میں پیکنگ کا کام کرتے تھے۔ وہ امانت دار اور کم گو انسان تھے۔ جلد ہی شہرے ان سے متاثر ہوگئی۔ اُن کی ککنگ کی خوب جی بھر کر تعریفیں کرتی۔ اکثر ان سے کچھ نہ کچھ پکانا سیکھ رہی ہوتی تھی۔ مگر ہزار کوششوں کے بعد بھی اسے کچھ پکانا نہیں آیا تھا۔

جمس بابا کے آ جانے سے ککنگ کا مسئلہ تو حل ہوا، مگر اتنے بڑے ہوم لینڈ کی صفائی ستھرائی کا معاملہ ہنوز برقرار تھا۔ اس مسئلے کو کیسے سلجھایا جائے۔ روزانہ پاپا کے آفس سے آنے کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹہ بحث میں گزرتا۔ موضوع وہی ایک عدد نوکرانی کا حصول تھا۔ ایک دو کام والیاں نفیسہ آنٹی نے بھیجی بھی تھیں، مگر شہرے نے تو انہیں دیکھتے ہی ریجیکٹ کر دیا تھا۔ ایک اتنی موٹی تھی کہ نہ جانے اپنا بوجھ لئے چل پھر کیسے سکتی تھی، کام کیسے کرتی۔ سیڑھیاں تو محترمہ چڑھ نہیں سکتی تھیں۔ ڈسٹنگ سے سخت الرجک، بس کپڑے دھونے کے لئے بہ خوشی دو من کے سر کو ہلا دیا تھا۔ شہرے نے ناراضی سے ''محترمہ'' کو دیکھا اور جانے کا اشارہ کر دیا۔ دوسری کی طرف توجہ کی تو دل کو سخت ترین دھچکا لگا۔ یہ خاتون پہلی والی ''کورٹنی'' سے بالکل سائز میں مختلف تھیں۔ اتنی سوکھی سڑی، ہڈیوں کا ڈھانچہ سی۔ اس کی سوکھی لمبی گردن کی اور ہاتھوں کی وینز تک نظر آ رہی تھیں۔ خصوصاً ہاتھوں کی وینز تو بہت اُبھری ہوئی عجیب لگ رہی تھیں۔ اس کا سدا کا نرم دل دکھ کے احساس سے بھر گیا۔

''ریٹا! تمہیں کھانے کو نہیں ملتا؟ جب تمہاری خوراک ہی مناسب نہیں، جسم میں جان تک نہیں تو کام کیسے کرو گی؟ میں اتنا ظلم تم پر نہیں کر سکتی۔ ہمارا اتنا بڑا گھر ہے، تم تو ڈسٹنگ کرتے کرتے ہی آدھی ہو جاؤ گی اور باقی صفائی کرتے فوت ہو جاؤ گی۔ میں ایسا ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ پلیز تم چلی جاؤ، یہ پیسے بھی رکھ لو۔ خوب کھاؤ پیو اور پھر کام کے بارے میں سوچنا۔''

ریٹا کو واپسی کی راہ دکھانے سے پہلے اپنی زیرِ نگرانی خوب اچھی طرح شاندار سا لنچ کروایا، کچھ کھانا بڑے سے ٹفن میں پیک کروا کے ریٹا کی خواہش کے مطابق اسے تھمایا اور جانے سے پہلے سو **Ringgit** کے سات آٹھ نوٹ چپکے سے ریٹا کو پکڑا دیئے اور

پھر بیرونی گیٹ تک چھوڑنے بھی آئی۔

دونوں کے جانے کے بعد وہ افسردہ سی ویلوٹ کے صوفے میں دھنسی بیٹھی ریموٹ سے چینل سرچنگ میں مصروف تھی، جب نفیسہ آنٹی چلی آئیں۔ یہ ان کے پڑوس میں عرصہ دراز سے مقیم تھیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی رحمہ اس کی کلاس فیلو اور فرینڈ تھی۔ دونوں کا زیادہ تر وقت اکٹھے گزرتا تھا۔ وہ بھی اسی کی طرح سیاحت کی شوقین تھی اور ان دونوں نے ایک ساتھ کئی ملک پاپا کے ساتھ گھومے تھے۔ شہرے کے ہوم لینڈ کے لاؤنج، سٹنگ روم اور بیڈ روم میں تمام دیواروں کے ساتھ مختلف خاص خاص مقامات کی تصویریں شان سے ٹنگی ہوئی تھیں۔ اکثر آنے والے اور پاپا کے فرینڈز خوب متاثر ہوتے کہ شہرے نے اتنی سی عمر میں نہ جانے کون کون سے ملک دیکھ رکھے ہیں۔ پاپا کے بغیر اس نے پندرہ سال کی عمر میں سفر کرنا شروع کیا تھا۔ وہ اسے بہت زیادہ بااعتماد اور بہادر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ شہرے بہت اسٹرونگ ہو، بہت مضبوط بن جائے۔ بالکل فولاد کی طرح کہ زندگی کے سفر میں اسے ان کے بغیر اگر چلنا پڑے تو ان کی پیاری بیٹی کو نہ ٹھوکر لگے اور نہ ہی وہ تنہائی کے احساس سے گھبرا جائے۔

''شہری بیٹا! تم نے ریٹا کو بھی جواب دے دیا ہے؟'' آنٹی کی آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی۔

''آنٹی! ریٹا کم از کم اس گھر میں کام کرنے کی اہل نہیں۔ وہ تو ایک بیمار اور کمزور چکن کی طرح لگتی ہے۔ آپ کوئی صحت مند ''پیس'' لا کر دیں۔'' اس کے معصوم انداز کو ملاحظہ کر کے آنٹی نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''جمس بابا! آنٹی کے لئے کافی لائیں۔'' اس نے ہانک لگائی تھی۔ کچھ پل بعد جمس بابا ٹرالی گھسیٹتے ہوئے آ گئے۔ آنٹی نے بغور خانساماں کا جائزہ لیا اور ان کے جانے کے بعد بولیں۔

''شکل سے ہی خرانٹ لگتا ہے۔ جمل ٹھیک تھا۔''

''کہاں ٹھیک تھا آنٹی!'' وہ ایک دم الرٹ ہوگئی تھی۔ ایک پاؤں کارپٹ پر، دوسرا صوفے پر اور گود میں کشن دبوچے وہ ان کو دونوں نوکروں کی ''چوریوں'' کے متعلق بتا رہی تھی۔

''پاپا کے والٹ سے پیسے چراتے تھے، کچن سے راشن دس دن کے اندر اندر ختم ہو جاتا تھا۔ فریج سے انڈے اور پھل نکال کر کھاتے تھے۔ سرف کے ڈبے اور شیمپو کی

بوتلیں غائب ہونے لگی تھیں۔"

شہری بہت جوش کے عالم میں بتا رہی تھی۔ اپنی عقل مندی کو سراہ رہی تھی اور نفیسہ آنٹی پہلو پہ پہلو بدل رہی تھیں۔ کافی کی طرف دیکھا تک نہیں۔

'یہ شہرے تو بہت چالاک ہے۔' نفیسہ نے تلخی سے سر جھٹکا اور شہد آگیں لہجے میں بولیں۔

"شہرے! تم تو بہت چھوٹی ہو۔ تمہیں لوگوں کی فطرت کا کیا پتہ؟ بس اس بڈھے پر کڑی نگاہ رکھنا اور جلد فارغ بھی کر دینا۔ میں ایک بہت اچھے بٹلر کا انتظام کر رکھوں گی۔ گریجویٹ ہے، فرفر انگریزی بولتا ہے۔ اس "بابے" کی عربی پلس اُردو کے کمکسچر کی تمہیں کہاں سمجھ آتی ہو گی؟"

"نہیں آنٹی! میں اور پاپا، حمس بابا سے مطمئن ہیں۔ آپ بس ایک عدد نوکرانی کا بندوبست کر دیں۔ صفائی تو میں کر لیتی ہوں، کپڑے دھونا مشکل ہے۔" وہ کسی سمجھ دار خاتونِ خانہ کی طرح بات چیت کرتی، نفیسہ کو زہر لگ رہی تھی۔

"تمہارے اسکول کا ٹرپ دوحہ جا رہا ہے، رحمہ تو جائے گی۔ کیا تم نہیں جاؤ گی؟"

آنٹی نے موضوع بدلا تو شہرے افسردگی سے بولی۔

"نہیں آنٹی! ایک تو پاپا کی طبیعت اچھی نہیں، دوسرا میرے جانے کے بعد ان کا کون خیال رکھے گا؟"

"اونہہ، ایک تم اور تمہارے پاپا۔" وہ جلتی بھنتی اُٹھ گئی تھیں اور شہرے انہیں پکارتی رہ گئی۔

"حمس بابا! آنٹی نے کافی تو پی نہیں۔ چلیں، میں اور آپ پی لیتے ہیں۔" وہ فل سائز کافی کا مگ اٹھا کر ایک مرتبہ پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

❁

"یار شہری! تم بھی پروگرام بناؤ نا۔ اگر تم دوحہ جاؤ گی تو میں جا سکوں گی۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی تو جاتی ہوں۔ میرے پاپا تو تم جانتی ہو، اتنا مہنگا ٹرپ افورڈ نہیں کر سکتے۔" وہ اسکول کے سوئمنگ پول کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں، جب رحمہ نے بہت لجاجت سے کہا تھا۔

"آئم سوری رحمہ! شاید میں اس دفعہ نہ جا سکوں۔ نیکسٹ ٹائم دیکھوں گی۔" اس نے افسردگی سے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے اور آہستگی سے بولی تھی۔ رحمہ کا منہ اتر گیا۔

"ہماری پوری کلاس جائے گی، میرے اور تمہارے علاوہ۔ ٹیچر "ثریہ" بھی جا رہی ہیں۔" رحمہ نے اس کی فیورٹ ٹیچر کا لالچ دینا چاہا تھا مگر وہ نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

"تم انکل کی وجہ سے کہہ رہی ہو۔ حالانکہ اب تو وہ ٹھیک ہیں۔"

"پاپا کو صرف ایزما ہی نہیں، ہارٹ پرابلم بھی ہے۔ اور......"

شہرے کی آواز بھرّا گئی تھی۔ کل پاپا کے ذاتی معالج انہیں چیک اپ کے لئے لے گئے تھے۔ واپسی پر پاپا بہت افسردہ اور پریشان تھے۔ اس کے بہت دفعہ پوچھنے پر بھی انہوں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ مگر کل شام کو اس نے اسٹڈی کی دراز میں سے پاپا کی رپورٹس نکال لی تھیں۔ رپورٹس کے مطابق پاپا کو ڈائی بی ٹیز کی شکایت بھی ہو رہی تھی۔

اس شام شہرے بے حد روئی تھی۔ بہت چھوٹی سی عمر میں اسے بہت کچھ کھو دینے کا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ ممی کے بعد پاپا سے دائمی جدائی کا تصور بھی اس کی راتوں کی نیند اُڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ رات رات بھر جاگتی رہتی تھی اور اٹھ اٹھ کر پاپا کے کمرے میں جھانکتی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ ان کا خیال رکھتی تھی۔

'یہ تو نہیں مانے گی۔ مجھے انکل سے بات کرنا چاہئے۔ آفٹر آل انہوں نے ہی تو میرے بھی جانے کے انتظامات کرنے ہیں۔' رحمہ نے سوچا اور پھر مزید دماغ کھپانے کا

ارادہ کر کے اٹھ گئی۔

اور پھر اگلے چار دن بعد شہرے نے دیکھا کہ پاپا نے پرنسپل کو انفارم کر کے اس کے اور رحمہ کے جانے کے تمام انتظامات کر دیئے تھے۔ اس کی تمام ناراضی کا ایک جواب ان کے پاس موجود تھا۔

''میری بیٹی کا ایک ہی تو شوق ہے۔ میں اسے ہرصورت پورا کرنا چاہوں گا۔ اور پھر ورلڈ ریکارڈ بک میں شہری کا نام سیاحت کے حوالے سے دیکھنا میرا بھی جنون ہے۔'' وہ شرارت سے کہہ رہے تھے اور شہری نے غصے سے پاؤں پٹخا اور اٹھ کر چلی گئی۔

اسے نفیسہ آنٹی اور رحمہ دونوں پر جی بھر کر تاؤ آ رہا تھا۔ مگر ہمیشہ کی طرح وہ نفیسہ آنٹی کے سامنے خود کو بے بس سمجھتی تھی۔

انکل عابف پہلے پہل اس کے پاپا کی فوڈ فیکٹری میں جاب کرتے تھے۔ وہ لوگ بھی عرصہ دراز سے ملائیشیا میں مقیم تھے۔ پاپا، انکل کی تنخواہ کے علاوہ بھی ہیلپ کرتے تھے۔ پاکستانی ہونے کی وجہ سے انکل کی پوری فیملی پر پاپا کافی مہربان تھے۔ جب انکل نے جاب چھوڑی اور پھر اپنا ذاتی اسٹور بھی اسٹیبلش کر لیا، تب بھی پاپا نے ان کے ساتھ تعلقات قائم رکھے تھے۔ پاپا کی مہربانی اور مالی ہیلپ کی وجہ سے انکل ان کے برابر میں بہت شاندار نہ سہی، قدرے بہتر مکان لینے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

شہرے نے ہوش سنبھالتے ہی انکل، آنٹی کو اپنے گھر میں آتے اور بے تکلفی سے پورے گھر میں دندناتے دیکھا تھا۔ پاپا کی غیر موجودگی میں وہ رحمہ کو بھی لے کر آ جاتے تھے۔ انہوں نے پڑوسی ہونے کا حق بھی پورا پورا وصول کیا تھا۔ اکثر رحمہ رات کو بھی اس کے پاس رک جاتی۔ وہ فطرتاً سیدھی سادی معصوم سی لڑکی تھی۔ رحمہ اس کے کھلونوں پر آرام سے قبضہ جما لیتی۔ اس کا ڈول ہاؤس، پپی ہاؤس رحمہ کے بیڈروم کی زینت بن چکا تھا۔ اکثر رحمہ کو اس کا بیگ، یونیفارم اور شوز تک پسند آ جاتے اور پاپا نرمی سے اسے سمجھاتے۔

''شہری بیٹے! یہ بیگ آپ بہن کو دے دو، میں آپ کو اور لا دوں گا۔'' شہری فوراً ہی پاپا کے حکم کی تعمیل کرتی تھی۔

رحمہ کا ایڈمیشن بھی اس کے اسکول میں ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کام بھی پاپا نے ہی کروایا ہوگا۔ اکثر آنٹی فیس جمع کروانے کی آخری ڈیٹ میں پاپا کے پاس آ جاتی تھیں۔

''بھائی جان! شہری کے ساتھ رحمہ کی بھی فیس جمع کروا دیجئے گا۔ عابف تو ان دنوں اسٹور میں خسارے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ وہ تو رحمہ کو اسکول سے اُٹھوانے کی بات کر رہے ہیں۔ مگر میرا دل نہیں مانتا۔''

آنٹی اس قدر رقت بھرے لہجے میں کہتی تھیں کہ شہرے کا دل بھی پاپا کے ساتھ پسیج جاتا۔

ان کا ٹرپ دوحہ سے واپس آیا تو گھر میں ایک عدد ملازمہ چلتی پھرتی دیکھ کر شہرے کو خوشگوار جھٹکا لگا۔ یقیناً آنٹی فون پر اسی سرپرائز کی بات کر رہی تھیں۔

''یہ امترا ہے۔ بے چاری انڈیا سے آئی ہے۔ اس کا شوہر سات جھوٹے پھیرے لگوا کر دھوکے سے لے آیا تھا۔ اِدھر اُدھر دھکے کھاتی پھر رہی تھی۔ میں لے آئی ہوں۔ کہو، اچھا لگا میرا سرپرائز؟'' آنٹی نے فخریہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ اثبات میں گردن ہلانے لگی تھی۔

امترا بیس اکیس سال کی حسین لڑکی تھی۔ بننے سنورنے کی حد درجہ شوقین۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں شہرے کو اس کے رنگ ڈھنگ کھلنے لگے تھے۔ اس نے بہت جلد ''آگہی'' کا سفر طے کر لیا تھا۔ شعور کی منزلیں بہت جلد عبور کر لی تھیں۔ وہ عورت کی بدلتی نگاہ کو جاننے لگی تھی۔ اور یہ تو بالکل سیدھی سادی بات، آئینے کے مانند نظر آ رہی تھی کہ امترا بیگم صفائی ستھرائی کے بجائے پاپا کو اکثر تاڑتی، چوری چوری دیکھتی پکڑی گئی تھی اور شہرے کا ایک دم اس سے بھی دل کھٹا ہو گیا۔

ایک دن وہ اسکول سے آئی تو محترمہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی میک اپ کر رہی تھیں اور پرفیوم کا استعمال بھی دل کھول کر کیا گیا تھا۔ شہرے کو دیکھ کر نہ جھجکی نہ گھبرائی بلکہ آرام سے کہنے لگی۔

''شہری جی! میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

''بالکل چڑیل۔'' شہری نے ہنستا کر کہا تو وہ قل قل ہنسنے لگی تھی۔

''آپ بہت جولی اور سویٹ ہیں۔ اور میں بہت خوب صورت ہوں۔'' اس نے غصے سے کہا تھا مگر امترا پر قطعاً اثر نہ ہوا۔ وہ اپنا میک اپ چھوٹے سے بیگ میں ڈالنے لگی تھی۔ شہری نے حیرت سے پہلے میک اپ اور پھر بیگ کو دیکھا۔ یہ ایک امپورٹڈ بیگ تھا۔

''کس نے لے کر دیا ہے یہ بیگ؟'' شہری نے مشکوک انداز میں گھورا تو وہ گڑبڑا

کر بولی تھی اور پھر ایک دم دانتوں تلے زبان داب لی۔

''نفیسہ جی نے۔''

''آنٹی نے؟'' شہری کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ خفگی سے اسے جھاڑتی ہوئی آنٹی کی طرف آ گئی تھی۔ وہ کچن میں کھڑی تھیں، فون کانوں سے لگا رکھا تھا۔ ان کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔

''ہاں، ہاں...... کام ہو جائے گا۔ یہ شہری بڑی بھولی سی چیز ہے۔ نتیجہ ہنڈرڈ پرسنٹ ہوگا۔ بس تھوڑا سا انتظار کرو۔''

شہری نے ناسمجھی کے عالم میں ان کی دو چار باتیں سنی تھیں اور پھر کچن میں داخل ہو گئی۔ آنٹی اسے دیکھ کر قدرے بوکھلا گئی تھیں۔ فون سرعت سے ٹیبل پر پٹخا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''کب آئی ہو شہری؟''

''ابھی چند منٹ پہلے۔'' اس نے لاپروائی سے کہا تھا۔ آنٹی نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تھا اور پھر مطمئن سی ہو گئیں۔

''رحمہ اپنے کمرے میں ہے۔''

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔'' وہ ایک چھوٹا سا امرود باسکٹ سے اٹھا کر ان کے پیچھے لاؤنج میں چلی آئی تھی۔ آنٹی ایک دفعہ پھر چونک سی گئیں۔

''کون سی بات؟'' ان کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

''امترا کے بارے میں۔'' وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور کشن کو اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

''کیا تم اس کے کام سے مطمئن نہیں ہو؟'' آنٹی نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں، کام تو وہ ٹھیک کرتی ہے۔ مگر آنٹی! مجھے اس کی عادتیں پسند نہیں۔ اتنا میک اپ تھوپے رکھتی ہے، ہر وقت گنگناتی پھرتی ہے۔ مجھے تو نہیں لگتا اس کے ساتھ کوئی فراڈ ہوا ہوگا۔ بلکہ وہ تو خود شکل سے ''فراڈن'' لگتی ہے۔'' اس نے اپنی اُلجھن کا اظہار بغیر جھجکے کر دیا تھا۔ بس پاپا کو ''تاڑنے'' والی بات گول کر دی تھی۔ اس بات سے شہرے کو اپنی اور پاپا کی انسلٹ فیل ہو رہی تھی، لہٰذا آرام سے چھپا گئی تھی۔ ورنہ امترا کی حرکتیں نظرانداز کی جانے والی نہیں تھیں۔ آنٹی نے توجہ سے اس کی بات سنی اور پھر رسان سے بولنے لگیں۔

''میک اپ کرتی ہے، خود کو صاف ستھرا رکھتی ہے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ورنہ کام والیاں تو بہت گندی ہوتی ہیں۔ صفائی کروانے کو دل نہیں مانتا۔''

''وہ آئندہ پیسٹری بن کر ہمارے گھر میں نہیں آئے گی۔ آپ اسے سمجھا دیجئے گا۔'' شہری نے ناگواری سے کہا تو نفیسہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔

'کس قدر ہوشیار لڑکی ہے۔ ہر چیز پر اتنی گہری نظر۔ سو سالہ بڑھی روح سما چکی ہے اس کے اندر۔ ایک رحمہ ہے، انتہائی احمق اور بے عقل۔ کسی بات کا ہوش نہیں۔ اور یہ شہری، اس کا تو مجھے کوئی مضبوط بندوبست کرنا ہوگا۔'

انہوں نے دل ہی دل میں پکا فیصلہ کر لیا تھا۔ بس اس کے فائنل ایگزامز کا انتظار تھا۔ پھر اسے ہائیر اسٹڈیز کے لئے لندن جانا تھا، ہر صورت، ہر قیمت پر۔ اپنے راستے کی اس سب سے بڑی رکاوٹ کو ہٹانے کا وہ پورا پورا منصوبہ بنا چکی تھیں۔

اگلی شام پاپا اسے ڈنر کروانے باہر لے گئے تھے۔ یہ ایک عربین ریسٹورنٹ تھا۔ اس نے اپنی فیورٹ ڈشز میں کوفتہ بریانی، پودینے اور ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ لیموں کا اچار منگوایا تھا۔ آرڈر نوٹ کرواتے ہوئے اس کے منہ میں ڈھیروں پانی بھر آیا تھا۔ پاپا اس کی بے تابی نوٹ کر کے مسکرا رہے تھے۔ خود وہ پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔ رات سے انہیں کچھ فیور بھی محسوس ہو رہا تھا، اسی لئے انہوں نے اپنے لئے صرف پورج کا آرڈر دیا تھا۔

کھانے کے دوران پاپا نے اس سے ایگزامز کی تیاری کے متعلق پوچھا۔

''پاپا! میں پورا سلیبس حفظ کر چکی ہوں۔'' اس نے سوں سوں کرتے ہوئے بتایا تھا۔

''کس کالج میں جانے کا ارادہ ہے؟'' انہوں نے لائم جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

''اس بارے میں بھی آپ بہتر جانتے ہیں۔'' شہری نے گلاس لبوں سے لگا کر ان کے مان کو بھی بڑھا دیا تھا۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

''آج صبح تم اسکول جب گئیں تو نفیسہ بھابی اور عاطف آ گئے تھے۔ ایسے ہی باتوں باتوں میں تمہاری آئندہ پڑھائی اور فیوچر کے بارے میں پوچھنے لگے۔ بھابی بتا رہی

تھیں کہ تمہاری خواہش ہے، لندن کے انسٹی ٹیوٹ میں پڑھنے کی۔ اگر تم لندن جانا چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ یہاں تمہاری اسکولنگ ملک کے سب سے بڑے اسکول سے ہوئی۔ تمہارا پچھلا ریکارڈ بھی شاندار ہے۔ ایڈمیشن ملنا مشکل نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بیٹی بہترین اداروں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔'' انہوں نے نیپکن سے ہاتھ صاف کئے اور پھر بغور سوچوں میں گم شہرے کی طرف دیکھنے لگے تھے، جس کی توجہ کھانے سے ہٹ چکی تھی۔

''پہلے لندن جانے کی خواہش تھی، مگر اب نہیں۔'' کافی دیر سوچنے کے بعد وہ آہستگی سے بولی۔

''کیوں بیٹا؟'' انہوں نے حیرانی سے پوچھا تھا اور پھر کچھ سمجھ کر سر ہلانے لگے۔

''میری وجہ سے کہہ رہی ہو۔ مگر میں اب بالکل فٹ محسوس کر رہا ہوں۔ تمہیں بہت آگے جانا ہے شہرے! بہت سا پڑھنا ہے، اپنا ایک الگ مقام بنانا ہے۔ میں چاہتا ہوں، تم گریجویشن کر لو اور پھر میں پاکستان ہمیشہ کے لئے تمہیں لے کر چلا جاؤں گا۔ اس ضمن میں قاسم سے بھی بات کر چکا ہوں میں۔ اپنا بزنس وائنڈ اپ کر لوں گا۔ تم تعلیم مکمل کر لو، پھر سب کچھ تم ہی کو سنبھالنا ہے۔ میں اب تھکنے لگا ہوں شہرے! اگر تم نہ ہوتیں تو باسمہ کے بعد میں خود کو ختم کر لیتا۔ اس کے بغیر زندگی میں میرے لئے کوئی رنگ نہیں بچا۔''

''پاپا........!'' شہرے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کا چہرہ تھاما اور پھر ان کے شانے سے سر ٹکا کر رو دی۔ انہوں نے کبھی ممی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید اسی لئے کہ وہ شہرے کو کسی محرومی کا احساس دلانا نہیں چاہتے تھے۔

''پاکستان؟........ مگر کیوں پاپا؟'' کچھ دیر سوچنے کے بعد شہرے نے حیرانی سے پوچھا۔ ''پاکستان میں ہمارا کون ہے؟''

''میرے نہ سہی، مگر تمہارے وہاں بہت سے رشتے موجود ہیں۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا تھا اور پھر بل پے کر کے اٹھ گئے۔ گھر جانے کے بجائے وہ دونوں واک کرتے ہوئے قریبی پارک میں آ گئے تھے۔ اس وقت پارک سنسان تھا۔ پاپا ایک بینچ پر بیٹھ چکے تھے۔

''پاپا! میں سمجھی نہیں۔'' اس نے اُلجھ کر انہیں کچھ یاد دلانا چاہا۔

''تم کچھ نہیں جانتیں شہرے! میں تمہیں آج کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں، سمجھانا چاہتا

ہوں۔'' وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کیا کھوج رہے تھے۔

''میری اور تمہاری ممی کی لو میرج تھی۔ وہ پاکستان سے یونیورسٹی ٹرپ کے ساتھ آئی تھی۔ ہماری ملاقات ایئرپورٹ پر ہوئی تھی۔ اس ایک ملاقات نے اس دیوانی سی لڑکی کو میرا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ مجھے چاہنے لگی تھی اور میں بھی........ مختصر یہ کہ ملائیشیا سے واپسی پر کچھ خواب آنکھوں میں لے کر وہ اس سرزمین کو چھوڑ گئی تھی۔

صرف چند ماہ بعد اس نے میرے ساتھ پھر سے رابطہ کیا تھا۔ وہ اپنے پیرنٹس کو منانے میں ناکام ہو گئی تھی۔ اسے بڑا یقین تھا کہ وہ اپنے پاپا کو منا لے گی۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہو سکا۔ کچھ عرصہ گزرا کہ ایک دن آفس میں مجھ سے ملنے ایک ویل ڈریسڈ سا مہذب نوجوان آیا۔ وہ کراچی سے آیا تھا۔ اس کا نام اسفندیار تھا اور وہ باسمہ کا بڑا بھائی تھا۔ وہ مجھ سے ملا تھا بہت تپاک سے۔ تین دن وہ میرے ساتھ رہا تھا۔ اس نے مجھے یقیناً اندر تک جانچا، پرکھا اور پھر مطمئن ہو کر اپنے آفس کا ایڈریس دے کر چلا گیا تھا۔ کراچی میں ان کی کئی فیکٹریاں تھیں۔ ان کا بہت بڑا بزنس تھا۔

صرف چند دن بعد وہ دوبارہ آ گیا تھا۔ مگر اس دفعہ وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ باسمہ بھی تھی۔ ہوم لینڈ میں ہمارا نکاح ہوا تھا۔ اسفندیار نکاح کے فوراً بعد چلا گیا تھا اور باسمہ ہمیشہ کے لئے میری ہو گئی۔

ہم نے بہت اچھا اور خوشگوار وقت گزارا تھا۔ تمہاری آمد نے ہماری خوشیوں کو دوبالا کر دیا۔ مگر پھر نہ جانے کس کی نظر ہمارے آشیانے کو بکھیر گئی تھی۔ باسمہ کی اچانک ڈیتھ نے مجھے نیم پاگل کر دیا تھا۔ میری دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ اور میں کئی دن ہسپتال میں پڑا رہا۔''

پاپا بولتے بولتے ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔

''پاپا! آپ نے ممی کی ڈیتھ کی خبر ان کی فیملی کو نہیں دی تھی؟'' وہ بے حد رنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

''میں نے انہیں اطلاع کر دی تھی۔ اس کے پانچوں بھائی اور ماں باپ شام کی فلائٹ سے پہنچ چکے تھے۔ باسمہ کی بھابھیاں بھی آئی تھیں۔ وہ اپنی فیملی میں سب سے چھوٹی تھی اور سب کی بے حد لاڈلی بھی۔ میں نے سب سے زیادہ اسفندیار کو روتے دیکھا تھا۔ اسے باسمہ سے بہت محبت تھی اور یہی محبت اپنا آپ منوا کر اسفندیار کو ملائیشیا کھینچ لائی تھی۔ وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور باسمہ کی پسند کو سراہا بھی۔

اور پھر نہ جانے کن طوفانوں سے گزر کر وہ باسمہ کو میرے پاس لے آیا تھا۔

وہ باسمہ کو پاکستان لے کر جانا چاہتے تھے، اپنے خاندانی قبرستان میں دفن کرنے کی غرض سے۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں تھا بھی نہیں۔ وہ واپس جا رہے تھے۔ باسمہ تابوت میں بند تھی اور میرا دل کُرلا رہا تھا۔

اس رات تین بجے میں بھی پاکستان چلا گیا تھا۔ پانچ بجے باسمہ کو دفن کر دیا گیا اور اگلی شام باسمہ کی ممی نے مجھے اور تمہیں گھر سے نکال دیا۔

وہ مجھے باسمہ کا قاتل سمجھتی تھیں۔ شاید صدمے کی وجہ سے وہ مجھے گالیاں دے رہی تھیں۔ میں نے ان کی تمام تر گالیاں بخوشی سنی تھیں۔ میں ان کے ''غم'' کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ اسفندیار نہ جانے کہاں تھا۔ اور پھر میں اپنا سب کچھ پاکستان کی مٹی میں دفن کر کے، لٹا پٹا سا واپس آ گیا۔''

پاپا خاموش ہوئے تو وہ بھرائی آواز میں بولی۔

''انہوں نے پھر آپ سے کوئی رابطہ نہیں رکھا؟ مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی؟''

''نہیں۔ شاید باسمہ کے بعد مجھ سے رابطہ رکھنے کی خود میں ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اور پھر تم سے کیسے ملتے؟'' پاپا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا تھا۔ اور پھر اس کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے بولے۔

''اس دراز میں سے البم نکال کر لاؤ۔''

''ممی کی تصویریں۔'' وہ ایک دم پُرجوش سی ہو کر اٹھ گئی تھی۔ بڑا سا بھاری بھرکم البم نکال کر وہ پاپا کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ پندرہ سالوں میں پہلی مرتبہ اس نے اپنی ماں کی تصویریں دیکھی تھیں۔ اس گھر کی کسی دیوار پر ممی کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ پاپا اسے ہر غم اور ہر صدمے سے بچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کی ماں کی ہر یاد کو دل کے نہاں خانوں میں محفوظ کر رکھا تھا۔

''پاپا! میں ممی جیسی ہوں نا؟'' اس نے ایک ہاتھ سے تصویر کو پکڑا اور دوسرا ہاتھ اپنے چہرے کے نقوش پر پھیرتے ہوئے چہک کر بولی۔

''ہوں........'' انہوں نے ہنکارا بھرا اور بولے۔

''تم اپنی ممی جیسی ہو۔ اگر تم اسفندیار کے سامنے جاؤ گی تو وہ تمہیں پہلی نظر میں پہچان لے گا۔'' وہ اسے بتا رہے تھے۔ کچھ ماضی کی خوشگوار باتیں، یادیں۔

''یہ اسفندیار ہے۔ اس کی اور باسمہ کی محبت مثالی تھی۔'' پاپا نے ایک تصویر اس

کے سامنے نکال کر رکھی تھی۔ اس نے بغور اپنی ممی کے بھائی کو دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ، دو مرتبہ اور پھر کئی مرتبہ۔ ان کا ایک ایک نقش اسے ازبر ہو چکا تھا۔ شہرے نے آنکھیں بند کیں اور اسفندیار کی تصویر اس کی نگاہوں کے پار اُتر گئی۔ اسے ایک فطری سی بے تحاشا محبت اس وجود سے محسوس ہو رہی تھی۔ اسفند یار اس کی ممی کے بھائی تھے۔ اس کی ممی کے ہمراز دوست۔ ممی اور پاپا کی محبت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والے۔ اس کی آنکھیں عقیدت اور محبت کے احساس سے لبریز ہو چکی تھیں۔

اس نے بے ساختہ تصویر کو چوم لیا تھا۔ وہ اس ایک چہرے کو قریب سے دیکھنے اور ملنے کے لئے بے تاب تھی مگر بیچ میں بہت لمبا، طویل سفر اور دوریاں موجود تھیں۔ ان فاصلوں کو پاٹنا تھا۔ نانا نانی سے ملنا تھا۔ اگر کچھ رنجشیں تھیں تو انہیں دور کرنا تھا۔ مگر کیسے؟

اگلے بہت سارے دن مصروفیت کی نذر ہو گئے تھے۔ ایگزامز شروع ہوئے اور پھر ختم بھی ہو گئے۔

پاپا اسے لندن بھیجنے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ شہرے کا رونا دھونا، چیخنا چلانا، فریادیں کرنا سب بے کار گیا۔ پاپا نے اس کی بھوک ہڑتال پر بھی توجہ نہیں دی تھی۔

''شہرے! تم میری وجہ سے اپنی دیرینہ خواہش کا گلا مت گھونٹو میری بیٹی!'' اور پھر وہ پاپا کے آنسوؤں کے سامنے ہار گئی تھی۔ اس کی خاموشی نے سب سے زیادہ نفیسہ آنٹی اور رحمہ کو خوش کیا تھا۔

وہ لندن پہنچ چکی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے سرکنے لگا۔ دو سال چپکے سے گزر گئے۔ شہرے ان دو سالوں میں چار مرتبہ پاپا سے ملنے گئی تھی۔ ایک مرتبہ وہ خود اس کے پاس چلے آئے تھے۔ وہ بہت اُلجھے اُلجھے، پریشان سے تھے۔ شہرے نے بہت ضد کی تھی ان کے ساتھ جانے کی، مگر پاپا نہیں مانے تھے۔ وہ بہت چپ چپ سے رہنے لگے تھے۔ فون پر روز بات ہوتی تھی۔ مگر شہرے ان کے رویّے، انداز اور لب و لہجے سے کچھ بھی اندازہ نہیں کر سکی تھی۔

پاپا پریشان تھے۔ اسے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا۔ کیوں؟ کیا وجہ تھی؟ کون سا مسئلہ تھا؟ پاپا نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔

ان دنوں اس کی ساری توجہ پڑھائی پر تھی۔ فارغ اوقات میں وہ کتابیں پڑھتی تھی یا پھر گھومتی پھرتی۔

اس نے انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن لندن سے بی بی اے کر لیا تھا۔ اس
دوران اس نے اپنے سیاحت کے شوق کو بھی خوب خوب پورا کیا۔ کئی ملکوں کی سیر کی
سوئٹزرلینڈ، جنیوا اور برن کے علاوہ شنگھائی، قاہرہ، مصر اور یو ایس اے سمیت کئی ممالک
گھومے تھے۔

اس نے قدیم دنیا کے کئی عجائبات مثلاً زیئس کا مجسمہ، رہوڈز کا مجسمہ، ڈیانا
مندر، اسکندریہ کا روشنی کا مینار کے متعلق سن رکھا تھا۔ زلزلوں نے انہیں تباہ کر دیا تھا
روم کا محل، تاج محل آگرہ اور بادشاہی مسجد دیکھنے کی چاہ اور فیصل مسجد کو دیکھنے کی
ہے۔ لندن میں چھ سال گزارنے کے بعد اپنے وطن ملائیشیا آئی تھی۔ اس کے سامان
میں کئی سوٹ کیس تھے اور کچھ بہت بڑی بڑی پیکنگ میں لپٹی پینٹنگز تھیں جو کہ اس
رحمہ کے لئے خریدی تھیں۔ کچھ مختلف مقامات کی فل سائز فریم شدہ تصویریں تھیں۔ ان
میں ایک ہیلی کار ے سس کے مقبرے اور دوسری ریاست میسوری کے مقام سینٹ لوئس
میں واقع محراب کے اسٹین لیس اسٹیل سے بنے دروازے کی تصویریں تھیں، جو کہ اس
نے اپنے ڈرائنگ روم میں سجائی تھی۔ اس گولائی دار محراب کی تصویر پہلی نظر میں رحمہ کو
پسند آ گئی تھی۔ مگر اب وہ پہلی والی شہرے نہیں تھی، جو اپنی پسندیدہ چیز خاموشی سے رحمہ
کے حوالے کر دیتی۔

بیچ میں چھ سال کا عرصہ موجود تھا۔ ان چھ سالوں میں وہ چند ایک بار ہی آنٹی اور
رحمہ سے مل سکی تھی۔ ایم بی اے کے دوران پاپا ہر چھ ماہ بعد خود اس سے ملنے آ جاتے
تھے۔ وہ جب بھی لندن آتے، شہرے کے پاس تین چار ماہ ضرور رہتے۔ اس دوران
شہرے اکثر حیران ہو کر پوچھتی تھی کہ فیکٹری کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟ اور پاپا پہلے
سے انداز میں مسکرا کر کہتے۔

"عاجف ہے نا۔"

"مگر پاپا! عاجف انکل کا تو اپنا بزنس ہے، ان کے ذاتی اسٹور ہیں اور وہ تو خود کافی
مصروف ہوتے ہیں۔ پھر فیکٹری کے لئے ٹائم کیسے نکالتے ہیں؟" شہرے الجھ کر
پوچھتی۔

"فیکٹری کے لئے اس کے پاس بہت وقت ہوتا ہے۔" وہ سپاٹ انداز میں کہہ کر
اسے مزید الجھا دیتے تھے۔

"پاپا! میں سمجھی نہیں۔"

"جن دنوں عاجف مالی بحران کا شکار تھا، میں نے اس کی بہت مدد کی تھی۔ یہ اسی
مدد کا رزلٹ ہے۔" ان کی مبہم گفتگو شہرے کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر ایک تو اسے
یقین ضرور ہو چکا تھا کہ پاپا بہت پریشان رہنے لگے ہیں۔ کیا وجہ تھی؟ آج اس نے
بات جاننے کا فیصلہ کر لیا۔

"ایک چیز ہوتی ہے ایکس پلوریشن، کچھ پانے کی جستجو کرنا۔ اس کے لئے آپ کے
سامنے کئی سمتیں ہوتی ہیں۔ ان کا تعین آپ کو خود کرنا پڑتا ہے۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ
آپ اچھے یا برے، سیدھے یا الجھے کس راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ بعض لوگ زندگی
کی آسائشات اپنے زورِ بازو، محنت اور لگن سے حاصل کرتے ہیں اور بعض لوگ کسی نہ
کسی شارٹ کٹ کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ وہ موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ جب
بھی ان کو پرافٹ ایبل موقع قدرت صرف اور صرف آزمائش کے لئے فراہم کرتی ہے،
لوگ اپنے معیار سے فوراً گر جاتے ہیں۔ ایگزیکٹلی! ایسے لوگ خود اپنے ہاتھوں سے
پستی کا انتخاب کرتے ہیں۔ تمہارے عاجف انکل اسی کیٹگری میں آتے ہیں۔ میں نہیں
چاہتا کہ تمہیں دورانِ تعلیم مینٹلی اپ سیٹ کروں۔ مگر کچھ باتیں تمہارے علم میں لانا بے
حد ضروری ہیں۔ بیٹا! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ وہ
مادہ پرست لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے، تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں صرف تمہاری تعلیم
مکمل ہونے کا انتظار کر رہا ہوں، پھر فیکٹری فروخت کرنے کے بعد تمہیں پاکستان
ہمارے اپنوں کے پاس بھجوا دوں گا۔ وہ لوگ باسمہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ یقیناً
اس کی اکلوتی بیٹی، اس کی آخری نشانی کو ضرور سینے سے لگا لیں گے۔"

پاپا خاموش ہوئے تو وہ بے اختیار سسکنے لگی تھی۔ زندگی کا ایک یہ بھی کریہہ روپ نظر
آ گیا تھا۔ جن لوگوں کے لئے اتنی قربانیاں دیں، محبت دی، وہی آستین کے سانپ نکلے
۔ انہوں نے پاپا کو تنہا اور بیمار جان کر پیٹھ پیچھے خنجر گھونپ دیا تھا۔ اس رات زندگی
میں پہلی مرتبہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی اور تکیہ بھگوتی رہی۔

❁

پاپا ہمیشہ کی طرح دو ماہ مزید اس کے پاس رہے تھے۔ ان کے لئے طویل سفر
نقصان دہ تھا مگر وہ اپنی تکلیف بھلائے محض اس کو الجھنوں سے بچانے کی غرض سے خود
چلے آتے تھے۔ یہاں ایک ڈاکٹر سے وہ اپنا علاج بھی کروا رہے تھے۔ موجودہ میڈیسن
اور چیک اپ کی وجہ سے نتیجہ کافی تسلی بخش تھا۔

پاپا کے جانے کے بعد وہ کئی دن ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہی تھی۔ رات بھر جاگتی رہتی اور سوچتی رہی۔ اس کی روم میٹ انجلی بھی اس کی روٹین سے کافی حیران تھی۔ کہاں تو صرف پڑھائی کے علاوہ اسے کچھ سوجھتا نہیں تھا اور اب وہ کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا رہی تھی۔

یونیورسٹی کا سالانہ ٹرپ برونائی جا رہا تھا۔ شہرے کے انکار نے انجلی کو حیران کر دیا تھا۔ مگر وہ بہت بے تکلفی ہونے کے باوجود شہرے سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکی تھی۔

یہ کیفیت چند دنوں تک اس پر اس طرح طاری رہی تھی کہ اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ رکھا تھا۔ دراصل وہ ابھی تک ''شاک'' کے عالم میں تھی۔ اسے شاید انکل سے اس درجہ گر جانے کی توقع نہیں تھی۔

اگلی مرتبہ پاپا کچھ جلدی اس سے ملنے آ گئے تھے۔ ان کی دوائیاں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ شہرے سب سے پہلے انہیں ڈاکٹر کے پاس لے آئی۔

''آپ اپنی ڈائٹ کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟'' ڈاکٹر نے پہلی نظر میں ان کی گرتی صحت کو تشویش بھری نگاہ سے دیکھا تھا۔

پاپا نے ڈاکٹر کو مطمئن کرنے کے لئے نہ جانے کیا کہا تھا مگر شہرے خود ان کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ نئے سرے سے چیک اپ ہوا تھا، مختلف قسم کے ٹیسٹ کروائے گئے تھے۔ تین بجے تک رپورٹس ملیں۔ جب تک اس نے خود اپنی آنکھوں سے رپورٹس نہیں پڑھ لی تھیں، تب تک اسے چین نہیں آیا تھا۔ رپورٹس پہلے سے بہتر تھیں، بس ویک نیس کافی زیادہ تھی۔ شہرے نے ہمیشہ کی طرح پاپا کے ساتھ واپس جانے کی ضد کرنا شروع کر دی تھی۔

''صرف چند ماہ تو رہ گئے ہیں۔ فائنل ایگزامز کے بعد تم میرے پاس آ جاؤ گی۔''

وہ اسے بہلا پھسلا کر ایک دفعہ پھر قائل کر چکے تھے اور اس کی تمام نصیحتیں ملائیشیا تک ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔

''پاپا! اپنا بہت خیال رکھئے گا۔ میں آپ کو بہت مس کرتی ہوں۔ مگر مجبور ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ بہت سا پڑھانا، میرے نام کے آگے ڈگریاں اور میڈلز دیکھنا آپ کا دیرینہ خواب ہے۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔'' وہ آنسو بھری نگاہیں ہاتھوں کی پشت سے مسلتی زیرلب بڑبڑائی تھی۔

انجلی کب سے اسے روتے ہوئے اور زیرلب کچھ نہ کچھ بدبداتے دیکھ رہی تھی۔ جب رہا نہ گیا تو بول اٹھی۔

''تم اپنے پاپا کو مس کر رہی ہو شہرے؟''

''ہوں۔'' اس نے تکیے پر سر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔

''ایک بات پوچھوں، مائنڈ تو نہیں کرو گی؟'' انجلی، کافی کے مگ کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں کارڈیگنز تھا۔ یقیناً وہ کسی نئے فرینڈ سے ملاقات کرنے جا رہی تھی۔ اسے روتا دیکھ کر رک گئی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنے لئے کافی بنا لائی۔ یقیناً اس کا شہرے سے لمبی گفتگو کا ارادہ تھا۔

''بولو، تمہیں یہ بات سن کر حیرانی ہوگی کہ مجھے اتنی جلدی غصہ نہیں آتا۔ میں نہایت سوچ سمجھ کر غصہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ یہاں تک کہ میرا غصہ، ناراضی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔'' اب وہ آنکھیں کھولے سامنے دیوار کو دیکھ رہی تھی۔ انجلی نے غور کیا، شہرے حسین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں اس وقت رونے کی شدت کی وجہ سے بے حد گلابی ہو رہی تھیں۔ بلاشبہ وہ بہت حسین لڑکی تھی۔ انجلی نے دل ہی دل میں اسے سراہا اور بولی۔

''تمہارا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے؟''

''تم نے یہ بات کیوں سوچی اور پوچھی؟'' شہرے نے بھی الٹا سوال داغ دیا تھا۔

انجلی بالوں کو پونی میں جکڑتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔

''میں نے تمہیں اتنے سالوں میں تنہا دیکھا ہے۔ آفٹر آل ہم پچھلے ساڑھے پانچ سال سے ایک ہی کمرے کو شیئر کر رہی ہیں۔''

''مجھے بوائے تو کیا، گرل فرینڈز سے بھی چڑ ہے۔ بلکہ میری کوئی دوست نہیں ہے۔ بس ایک رحمہ تھی، مگر اب وہ بھی نہیں۔'' اس نے جلتی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے دبایا۔ دو سلگتے آنسو گالوں پر لڑھک آئے تھے۔

''چیٹر لوگ۔'' اس نے تنفر سے سوچا۔

''کیا تمہاری کسی کے ساتھ کمٹ منٹ ہے؟'' ایک اور پرسنل سوال۔ شہرے نے پوری آنکھیں کھول لی تھیں۔ انجلی اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی مگر آج وہ اسے حیران کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی۔ اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ وہ شہرے سے پرسنل ڈسکشن کر رہی تھی۔ کیونکہ اسے بوائے فرینڈز کی قربتوں سے فرصت ہی کہاں ملتی

تھی کہ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی۔

"نہیں۔" شہرے نے صاف گوئی سے جواب دیا تھا۔ انجلی کچھ بدمزہ سی ہوگئی۔

"تم حسین ہو، دولت مند ہو اور پھر اکلوتی بھی۔ کیا آج تک تمہیں کسی نے پرپوز نہیں کیا؟ دوستی کی آفر نہیں کی؟........تم شروع سے ہی کو ایجوکیشن میں پڑھتی رہی ہو۔"

"خوب صورت اور دولت مند ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی نسوانیت کو مٹی میں رول دیا جائے۔ سوسائٹی میں پیرنٹس کی عزت پر کیچڑ اچھالنے کا اہتمام کیا جائے۔ میرے پاپا نے میری تربیت کچھ ایسے خطوط پر کی ہے کہ میں ان باتوں کو دوسروں کے لئے ناپسند کرتی ہوں۔ کجا کہ خود بھی ایسی نازیبا حرکتوں میں ملوث ہو جاؤں۔" شہرے نے ناگواری سے اسے بہت کچھ جتا دیا تھا۔

"تم صرف اپنے پاپا کی بات کرتی ہو، کیا ممی نہیں ہیں؟ یا پھر تمہارے پاپا کی علیحدگی ہو چکی ہے؟" انجلی نے تمسخر سے کہا تھا۔

شہرے کی آنکھیں پھر سے نم ہونے لگیں۔

"میری ممی کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ وہ بہت سویٹ مدر تھیں۔"

"اوہو........ ویری سوری شہرے! میں نے تمہیں دُکھی کر دیا۔" انجلی نے مصنوعی تاسف سے کہا تھا۔

"اِٹس او کے۔" وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ "تم کہیں جا رہی ہو؟" شہرے کی نگاہ اب اس کی تیاریوں پر پڑی تھی، اسی لئے حیرانی سے دیکھنے لگی۔

"گولڈی سے ملنے جا رہی ہوں۔ کچھ آؤٹنگ کا پروگرام ہے۔ اگر تم بھی آنا چاہو تو........" انجلی کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی اور شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"گولڈی کے فرینڈ بنٹی سے فرینڈ شپ کرا دوں۔ تمہیں بھی زندگی کا لطف آ جائے گا۔" انجلی نے عامیانہ انداز میں آنکھ ماری تو وہ ناگواری سے سرخ پڑ گئی۔

"یہ دوستیاں آپ کو ہی مبارک ہوں۔" اس نے تنفر سے کہا تھا اور پھر تکیہ منہ پر رکھ لیا۔ انجلی ٹک ٹک کرتی ہنستی کھلکھلاتی چلی گئی تھی۔ شہرے کی ذہنی رو پھر سے بہک گئی۔ اس کا دل سینے میں پھڑ پھڑا رہا تھا اور اپنے ہوم لینڈ کی طرف اُڑنے کے لئے بے تاب تھا۔ پاپا کی تنہائیوں کے احساس نے ایک مرتبہ پھر اس کی آنکھوں کو بھگو ڈالا تھا۔

اسی پل فون کی گھنٹی گونج اٹھی۔ دوسری طرف امترا تھی، جو اس کے واپس آنے کی

بابت پوچھ رہی تھی۔

"شہری جی! کب آئیں گی؟"

"کیوں؟ تم اُداس ہو گئی ہو؟" شہرے نے چِڑ کر کہا۔

"تو اور کیا جی۔ گھر میں رونق ہی نہیں ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔

"حمس بابا کیسے ہیں؟" اس نے اپنے خانساماں کے بارے میں پوچھا تھا۔

"وہ تو جی نوکری چھوڑ کر جا چکے ہیں۔" امترا نے اطمینان سے بتایا تو شہرے حیران پریشان ہی رہ گئی تھی۔

"مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔ پاپا نے بھی ذکر نہیں کیا۔"

"وہ جی، بڑے صاحب تو اس وقت آپ سے ملنے لندن گئے تھے۔" امترا کچھ دھیمی آواز میں رازداری سے کہہ رہی تھی۔

"حمس بابا نے کیوں جاب چھوڑی ہے؟ کیا وہ سیلری سے مطمئن نہیں تھے؟"

"ایسی بات نہیں جی شہری صاحبہ!" امترا نے مزید لہجے میں تجسس بھرا تو شہرے کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"بتا ہی دو۔"

"پہلے آپ وعدہ کرو، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی جو کچھ میں آپ کو بتاؤں گی۔" امترا کے انداز میں کچھ تو تھا کہ شہرے کھٹک سی گئی۔

"وعدہ رہا۔"

"شہری جی! نفیسہ میڈم نے خانساماں کی چھٹی کروا دی ہے۔ وہ نفیسہ میڈم کو پسند نہیں تھے۔ ایمان دار جو تھے۔ اور ہم ٹھہرے لالچی۔ اس لئے نفیسہ میڈم کے جال میں پھنس گئے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ نفیسہ آنٹی کی جرأت کیسے ہوئی ہمارے ڈومیسٹک معاملات میں ٹانگ اڑانے کی؟" شہرے نے ناگواری سے چیخ کر کہا تھا۔ وہ ایک دم پوری جان سے کانپ گئی تھی۔ نفیسہ اور امترا ان دونوں کے تار یقیناً جڑے ہوئے تھے۔ اور وہ نادان، ملازموں کے بارے میں اتنے سالوں سے اس عورت پر بھروسہ کرتی رہی تھی۔

"اپنے ذاتی گھریلو معاملات میں آپ نے خود نفیسہ میڈم کو گھسنے کی اجازت دی ہے۔ آپ کے گھر کا ہر معاملہ نفیسہ میڈم کے بیڈ روم میں ڈسکس ہوتا ہے۔ انہوں نے پوری پلاننگ سے آپ کو لندن پڑھنے کے لئے بھجوایا ہے تا کہ کھل کر کارڈ کھیل سکیں۔"

صاحب بہت بیمار رہتے ہیں، انہوں نے کبھی اردگرد کی طرف دھیان نہیں دیا۔ ان کی دنیا صرف آپ تک محدود ہے، اسی لئے نفیسہ جیسی عورتوں کو کھلی چھوٹ مل گئی ہے۔

میرا نام امترا نہیں ''مریم'' ہے۔ میں گریجویٹ ہوں، ان کے اسٹور پر کام کرتی ہوں۔ شاید بہت چالاک بھی ہوں، اسی لئے نفیسہ کی نظر مجھ پر ٹھہر گئی تھی۔ آپ کے گھر میں سب نوکر میڈم کی مرضی سے آتے ہیں تا کہ اس گھر میں ہونے والی ہر بات سب سے پہلے ان تک پہنچے۔ بٹلر جمل اور میڈ ایوا دونوں ہی میڈم کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ جب آپ نے انہیں فارغ کیا تو میڈم کو شدید دھچکا پہنچا تھا۔ مگر وہ جلد ہی سنبھل گئیں اور مجھے دریافت کر کے لے آئیں۔ میں شاید لاج میں آپ پر نہ جانے اور بھی کیا کیا ستم ڈھاتی، مگر جلد ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں بہت غلط کام کر رہی ہوں۔

اس کا احساس مجھے یاسر نے دلایا تھا۔ وہ ایک پاکستانی ہے اور میں اس کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کر چکی ہوں۔ میرا اصل نام مریم ہے، جو کہ میرے پاپا نے بہت شوق سے رکھا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا، شہری جی! میں نے آپ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میری خواہش ہے، میں کسی پاکستانی سے شادی کروں۔ یہ خواہش پوری ہو چکی ہے۔ میں انڈیا کی نہیں، یہیں کی رہنے والی ہوں۔ ممی کے پچھلوں کا تعلق بنگال سے تھا، مگر وہ لوگ عرصہ دراز سے ریاض میں رہائش پذیر تھے۔ میری ممی نے پہلی شادی ایک عربی سے کی تھی۔ تین سال تک میری ماں کے ہاں جب کوئی اولاد نہیں ہوئی تو اس آدمی نے دوسری شادی کر لی اور ممی کو چھوڑ دیا۔ پھر انہوں نے دوسری شادی ایک پاکستانی سے کی تھی۔ پھر میری بڑی بہن اور میں پیدا ہوئی۔ وہ بہت عرصے سے ممی سے ناراض ہو کر لندن چلی گئی تھی۔ اور ہم لوگ ملائیشیا آ گئے۔ چند سال بعد پاپا کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ میرے نزدیک یاسر سے ملنے سے پہلے مذہب کی کوئی اہمیت نہیں تھی، مگر اس سے مل کر صحیح اندازہ ہوا ہے کہ مذہب کے بغیر انسان اپاہج ہوتا ہے۔

شہری جی! میری کوتاہیوں اور گناہوں پر مجھے معاف کر دینا۔ حالانکہ میں نے آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی مگر میں خود کو مجرم تصور کرتی ہوں، میں صرف آپ کو ایک بات بتانا چاہتی ہوں کہ نفیسہ آپ کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔

میں آج شام دوسرے شہر چلی جاؤں گی۔ صاحب اب اکیلے ہو جائیں گے۔ آپ جلد از جلد واپس آ جائیں۔ اور ایک بات میں آپ کو بہت شرمندگی کے عالم میں بتا رہی ہوں کہ میڈم مجھے اس لئے میڈ بنا کر آپ کے گھر لائی تھیں کہ میں صاحب کو اپنی طرف

متوجہ کر لوں تا کہ وہ لوگ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ مگر صاحب نے ان کے کسی بھی ارادہ کو پایہ تکمیل تک پہنچنے نہیں دیا۔ وہ ان کی تمام تر پلاننگ کو جان گئے تھے۔ فون بہت لمبا ہو گیا ہے اور مجھے ابھی بس اسٹاپ تک جانا ہے، اس لئے اللہ حافظ........ مجھے معاف کر دینا شہری جی!'' وہ تیز تیز بول رہی تھی اور پھر ایک دم ہی لائن منقطع کر دی گئی۔ ٹوں ٹوں کی مخصوص آواز اسے ہوش کی دنیا میں کھینچ لائی۔

''اوہ گاڈ........!'' شہرے نے سر ہاتھوں میں گرایا اور بے آواز رونے لگی۔

❁

وہ جتنی بھی کوشش کرتی، ایگزامز سے پہلے واپس نہیں جا سکتی تھی۔ امترا (مریم) سے ٹیلی فونک گفتگو سچائی پر مبنی تھی۔ وہ ان سب ''فیکٹس'' سے نظر نہیں چرا سکتی تھی۔

جوں ہی اس نے روم میں پہلا قدم رکھا، فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

ریسیور کان سے لگایا تو دوسری طرف پاپا کی آواز سن کر وہ خوشگوار حیرت میں گھر گئی تھی۔ انہوں نے اس وقت کبھی فون نہیں کیا تھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''مجھے کیا ہونا ہے؟ میں بالکل ٹھیک ہوں، بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ ہینڈسم ہو گیا ہوں۔'' ان کے لہجے میں چھپی شرارت محسوس کر کے وہ کھلکھلا اٹھی۔

''پاپا! میں بہت جلد آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ اور پھر ہمیشہ ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔''

''ہمیشہ ہمیشہ کیوں؟ میں تو جلد تمہاری شادی کر دوں گا اور پھر پورے ''ہوم لینڈ'' پر راج کروں گا۔'' انہوں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔'' شہری نے انہیں دھمکایا۔

''نری خوش فہمی........ آپ کا کیا خیال ہے کہ میں نے گھر داماد کے متعلق پلاننگ کر رکھی ہے؟'' ان کے لہجے میں بھرپور شرارت تھی۔

''پاپا........!'' وہ ٹھنکی۔

''جی پاپا کی جان!'' ان کے انداز میں، لہجے میں، الفاظ میں محبت ہی محبت تھی۔

''آج آپ بہت موڈ میں لگ رہے ہیں۔''

''میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اپنی بیٹی سے آج ڈھیروں باتیں کروں۔'' انہوں نے دش دلی سے کہا۔

"پاپا! آپ ٹھیک ہیں نا؟" شہری نے بھی انہیں چھیڑنا چاہا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" وہ شاید مسکرائے تھے۔

"کیا مطلب؟" شہرے نے چلا کر کہا۔

"جو آپ سمجھ لیں۔" وہ اسے خوب خوب چھیڑ رہے تھے۔

"پاپا! آپ کا کہیں دوسری شادی کا ارادہ تو نہیں؟"

"بالکل ٹھیک سمجھی ہیں آپ۔" ان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ شہرے بھی مسکرا دی۔

"میں اپوزیشن گروپ میں شامل ہوں۔" اس نے اعلان کیا۔

"ہم حزبِ اختلاف کو منالیں گے۔" وہ بھرپور یقین سے بولے تھے۔ شہرے ہنس ہنس کر دوہری ہوگئی۔

"میں فیڈرل گورنمنٹ کی باتوں میں آنے والی نہیں۔"

"گورنمنٹ کو صرف باتیں بنانا تو آتی ہیں۔ ہم آپ کو اپنی لچھے دار باتوں میں اُلجھا لیں گے۔" وہ ابھی بھی غیر سنجیدہ تھے اور شہرے ان کی گفتگو کے بے ساختہ پن کو انجوائے کر رہی تھی۔

"آپ اس وقت کیا کر رہے ہیں؟" تفتیش شروع ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ شہری ان کے دیر تک جاگنے پر سخت خفا ہوگی، اسی لئے مزے سے بولے۔

"آپ سے باتیں۔"

"اس سے پہلے؟" شہری تھانیدارنی بن چکی تھی۔

وہ بے ساختہ مسکرائے۔

"ٹی وی دیکھ رہا تھا۔"

"پاپا! ذرا ٹائم دیکھیں۔ نیند آپ کی صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔" اس نے خفگی سے کہا تو وہ قدرے بدلے بدلے لہجے میں بولے۔

"سونا ہی تو ہے........ اب کچھ دیر جاگ کر، تمہاری آواز سن کر دل کو خوش کرنا چاہ رہا ہوں۔"

"پاپا! میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں۔" اس نے رنجیدگی سے کہا۔

"تیاری کیسی ہے؟ رزلٹ حسبِ معمول شاندار ہونا چاہئے۔" انہوں نے اس کا دھیان بٹانا چاہا تھا، جس میں کامیابی ہوئی تھی۔

"فرسٹ کلاس۔ یوں لگتا ہے، پورا سلیبس میں نے گھول کر پی لیا ہے۔" شہری

ہنستے ہوئے بتا رہی تھی۔

"پیپرز کا بوجھ اتار کر بھاگنے کی نہ کرنا۔ بلکہ خوب گھوم پھر کر انجوائے کرنا۔ گرین وچ کی جھیل دیکھنے ضرور جانا۔ ایک بات بتاؤں شہری! میں اور تمہاری ممی ہنی مون منانے لندن گئے تھے۔ گرین وچ کی جھیل تمہاری ممی کو بہت پسند تھی۔ وہیں ایک درخت کے موٹے تنے پر تمہاری ممی نے میرا اور اپنا نام لکھنے کی کوشش کی تھی۔ باسمہ کو بھی تمہاری طرح سیاحت کا جنون تھا۔ اسے بھی اولڈیسٹ (قدیم ترین) چیزیں اٹریکٹ کرتی تھیں۔ چاہے وہ کوئی عمارت ہو، ہسپتال ہو، بچوں کی نرسری ہو یا پھر قیمتی پتھر۔ وہ ضد کر کے آرڈرسیٹر ہائی لینڈ میں واقع "فورٹ جارج" کے قلعے کو دیکھنے گئی تھی۔ اور پھر رولڈ ہیم جنرل ہسپتال کی تو اس نے اتنی تصویریں بنائی تھیں کہ دو البمز میں تمام تصویریں لگی ہیں۔" پاپا ماضی کی خوشگوار یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔ وہ بھی خواب کی کیفیت میں سن رہی تھی۔

"لندن میں ہم اسفند کے گھر ٹھہرے تھے، ان دنوں وہ اپنے بیٹوں ہارون اور فرزان کے ساتھ لندن میں ہی رہائش پذیر تھا۔ اسفند کی مسز ہاجرہ بھی بہت اچھی تھیں۔ اسفند کے چھوٹے بیٹے زارون کو باسمہ نے اپنا بیٹا بنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔"

"پاپا! میں ضرور پاکستان جاؤں گی اور اپنی ممی کے اتنے اچھے بھائی سے ضرور ملوں گی۔ مجھے تو اتنے اچھے ماموں جان سے بے تحاشا محبت ہوگئی ہے۔ میں ان سے ضرور ملوں گی۔" اس نے بہت جوش کے عالم میں کہا تھا۔

"تم وہاں ضرور جانا۔ وہ لوگ باسمہ کی اولاد سے منہ نہیں موڑیں گے۔" وہ دھیمی آواز میں بولے تھے۔

"پاپا! کیا نانا اور نانو، ممی سے شادی کے بعد بھی خفا تھے؟ یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی نا........؟" یہ سوال تو اسے اکثر پریشان کرتا تھا۔ وہ اپنی اُلجھن دور کرنا چاہتی تھی۔

"وہ صرف باسمہ سے ہی نہیں، اسفند سے بھی بہت عرصہ تک ناراض رہے تھے۔ اسفند سے ان کی صلح باسمہ کی ڈیتھ پر ہوئی تھی۔ باسمہ کے پاپا، اسفند کو موردِ الزام ٹھہراتے تھے کہ وہی تو ہمیں ایک کرنے کا سبب بنا تھا۔ دوسرے تمہارے چار ماموں بہت عرصے تک اسفند سے خفا رہے تھے۔"

پاپا کی آواز میں نمی گھلنے لگی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ممی کا ذکر، ان کی یاد، پاپا کی آنکھوں

میں آنسو بھر دیتی ہے۔ فون رکھنے سے پہلے وہ اسے دودھ پینے کی تاکید کرنے لگے تھے۔ اور شہری بھی انہیں کچھ اسی قسم کی ہدایات دے رہی تھی۔

(.....❀.....)

پیپرز کا بوجھ کیا اُترا تھا، وہ ایکدم ہلکی پھلکی سی ہوگئی تھی۔ انجلی دورانِ امتحان غیر حاضر تھی۔ جس دن اس نے آخری پیپر دیا تھا، اسی شام وہ واپس آئی تھی۔ شہرے بے حد حیران ہوئی۔

"کہاں تھیں تم؟"

"میں شہر سے باہر گئی تھی۔" انجلی نے لاپروائی سے سر جھٹک کر جواب دیا تھا۔

پھر اس کی حیران آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"میں نے گولڈی سے شادی کرلی ہے۔"

"اوہو......" شہری نے گہرا سانس خارج کیا۔ اسے انجلی سے کسی ایسے اقدام کی توقع پہلے سے ہی تھی۔

"کیا اس نے تمہارا مذہب قبول کرلیا ہے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" انجلی پاؤں جھلاتے ہوئے بولی۔

"تم ہندو ہو اور تمہارا شوہر عیسائی۔ تمہارے بچے کیا ہوں گے؟" اس نے طنزیہ کہا تھا۔

"ان کا بھی کچھ مکسچر بن ہی جائے گا۔" انجلی قہقہہ لگا کر ہنس رہی تھی۔

"دفع دُور......" اسے ایکدم کراہیت آنے لگی تھی۔ انجلی اس کے تاثرات سے مزا لیتی واش روم میں گھس گئی۔

اگلی صبح وہ جینز شرٹ پہنے کہیں جانے کے لئے تیار تھی۔

"اب تو ایگزامز بھی ہو چکے، اپنے حجرے سے نکل آیئے مادام! باہر کا موسم بہت اچھا ہے۔ آؤ، گولف کلب چلتے ہیں۔" وہ شہرے کو اپنے ساتھ چلنے کی آفر کر رہی تھی۔

کچھ سوچ کر وہ بھی اس کے ساتھ چلی آئی۔

"مجھے تو گولف کھیلنا نہیں آتا۔" انجلی کے اصرار پر وہ بے ساختہ بدک کر بولی تھی۔

"اس میں مشکل ہی کیا ہے؟"

"مجھ سے ٹھیک طرح سے ہٹ نہیں لگائی جاتی۔" اس نے بے بسی سے کہا تو انجلی ہنسنے لگی۔

"یہ سب لوگ کہاں کے پلیئر ہیں...... ادھر آؤ، میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔

گولف کا ہموار میدان ہے۔ اس کے نقطہ آغاز سے ایک سو دس سے چھ سو پچاس گز تک کے فاصلے میں اٹھارہ سوراخ ہوتے ہیں۔ اس کا میدان میرے خیال کے مطابق چھ ہزار گز تک وسیع ہوتا ہے۔ یہ جاپانیوں کا فیورٹ کھیل ہے۔ یوں کھڑے ہوکر پہلا ہٹ لگاؤ۔ چلو بھئی، گھبراؤ نہیں۔" اس نے شہرے کا شانہ تھپتھپایا تو وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

"ویری بیڈ۔" انجلی نے منہ بنا کر نفی میں سر ہلایا اور اس کی کارکردگی دیکھتے ہوئے افسوس کا اظہار کرنے لگی۔

"دفع کرو۔ یہ تم نہیں کرسکو گی۔ ڈیڑھ اونس کی گیند تک کو ہٹ نہیں لگا سکتیں۔"

شہرے کو ڈھیروں شرمندگی نے گھیر لیا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ مجھے نہیں کھیلنا آتا۔" وہ اردگرد کے لوگوں کو مختلف کمنٹس پاس کرتے اور ہنستے دیکھ کر خفت سے بولی تھی۔

انجلی خود بیگ اور گیند اٹھاتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

دوسری سہ پہر انجلی اسے منانے کی غرض سے بڑا پیک کروا کر لے آئی تھی۔ آج کل وہ ویسے بھی بہت مصروف تھی۔ اس نے بی این میں جاب کرلی تھی۔ ان دنوں ایک مقامی چینل سے بزنس نیوز کے متعلق نئی نئی اطلاعات عوام تک پہنچا رہی تھی۔ شہرے خود بہت مصروف تھی۔ واپس جانے کی تیاریوں میں دن گزرنے کا پتہ ہی نہیں چل رہا تھا۔ وہ آنٹی اور رحمہ پر کچھ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے ان کے لئے بھی اس نے کافی کچھ خرید لیا تھا۔ کل شام آٹھ بجے اس کی فلائٹ کا ٹائم تھا اور آج وہ اپنی درسگاہ کو آخری مرتبہ دیکھنے کے لئے چلی گئی تھی۔ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ، لائبریری اور کلاس روم سے ہوتی ہوئی گراؤنڈ میں چلی آئی تھی۔ چھ سالوں کا ساتھ اب ٹوٹنے والا تھا۔ شہرے جانتی تھی کہ آج کے بعد وہ کبھی بھی لندن کی فضاؤں کو محسوس نہ کرسکے گی۔ کیونکہ اب اسے یہاں واپس نہیں آنا تھا۔

اسے پتہ بھی نہ چلا تھا کہ کچھ آنسو اس کے گال بھگونے لگے تھے۔ وہ گراؤنڈ کی نرم گھاس پر بیٹھ گئی۔ یوں ہی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بالکل اچانک، غیر متوقع اس نے ایک ایسے چہرے کو دیکھ لیا تھا جو کہ اس کے لاشعور میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو چکا تھا۔ اس نے کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کبھی اس چہرے کو دیکھ سکے گی۔ وہ ایک ٹک بالکل پاگلوں، دیوانوں بلکہ کسی صدیوں کے پیاسے کے مانند اسے دیکھ رہی تھی، جسے ایک دم صحرا میں تالاب نظر آ گیا تھا۔ اور وہ بھاگم بھاگ پانی کی طرف لپکا تھا۔

شہرے حسنین بھی کسی پیاسے کی طرح اس کی طرف بھاگی تھی مگر وہ پلک جھپکنے کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھا اور زن سے اسے لے اُڑا۔ وہ بکھری سانسیں ہموار کرتی وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی تھی۔

'یہ اسفند ماموں کا چہرہ تھا، مگر.........' وہ بڑبڑائی۔ اور پھر تھکے تھکے قدم اٹھانے لگی تھی۔ اپنے روم میں جا کر اس نے بیگ میں سے ایک تصویر نکالی اور پھر پہروں اسے دیکھتی رہی۔

دوسری مرتبہ شہرے نے اسے اسی مارٹ میں دیکھا تھا اور اس پر پھر سے دیوانگی طاری ہوگئی تھی۔ وہ لفٹ کے ذریعے ٹاپ پر پہنچی اور پھر تقریباً بھاگتے ہوئے پارکنگ تک گئی مگر ایک مرتبہ پھر وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ اس کے نقوش اسفند ماموں جیسے تھے۔ اگر بہت سال پہلے دیکھا جاتا تو وہ اسفند ماموں کی تصویر میں بالکل فٹ ہو جاتا تھا۔

عجیب بات تو یہ تھی کہ شہرے حسنین کے دل کی چوکھٹ پر کوئی قدم جما کر پوری شان سے کھڑا ہوگیا تھا۔ ایک ایسا اجنبی، جسے وہ جانتی تک نہ تھی اور جس کے چہرے کے نقوش اور کھڑی ناک بالکل اسفند ماموں جیسی تھی۔ مگر وہ اسفند یار نہیں تھا۔ وہ باسمہ حسنین کا اسفند یار نہیں تھا۔ اور اسے صرف سات ماہ بیس دن بیالیس گھنٹوں پینتیس منٹوں اور صرف بارہ سیکنڈ کے بعد پتہ چلا تھا کہ لندن کی سرزمین پر اپنی ایک جھلک دکھانے والا وہ اجنبی، شہرے حسنین کا زارون اسفند یار تھا۔

وہ لندن سے اک نہ ختم ہونے والی سرور بخش اذیت اور میٹھا سا درد لے کر ملائیشیا کے چمکتے دمکتے شہر صباح میں پہنچی تھی۔

مگر یہاں پہنچتے ہی اسے ایک دل دہلا دینے والی خبر ملی تھی۔ پاپا کو دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا تھا، مگر کسی نے اسے بتایا تک نہیں۔

وہ بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچی تھی۔ روم نمبر تھرٹی ریسپشن سے معلوم کر کے وہ دوڑتی ہوئی سیکنڈ فلور تک گئی تھی اور پھر دوسرے ہی پل وہ پاپا کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''پاپا! آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ اتنے بیمار تھے اور مجھے بتایا بھی نہیں۔ پاپا! اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں مر جاتی۔'' وہ ان کے ہاتھ چوم رہی تھی۔ بے تحاشا رو رہی تھی۔ اور

نفیسہ اس کی اچانک آمد پر پہلو پر پہلو بدل رہی تھیں۔ رحمہ کو بھی اس کے آنے کی اطلاع مل چکی تھی اور دوسرے ہی پل وہ بھی ہسپتال پہنچ گئی۔

''کیسی ہو شہری؟..... اتنے سالوں بعد دیکھ رہی ہوں۔ پہلے سے بھی زیادہ چارمنگ ہوگئی ہو۔'' رحمہ خوامخواہ ہی گلے کا ہار بن گئی تھی۔

''مجھے کیسا ہونا چاہیے؟'' اس نے سرد اور کٹیلے لہجے میں ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کاٹتی نگاہ سے رحمہ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' رحمہ قدرے بوکھلا سی گئی۔

''میں سمجھا دیتی ہوں۔'' وہ زہر خند ہوئی۔ اس وقت وہ دونوں کوریڈور میں آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ رحمہ نے نگاہ چرالی۔

''جس کا باپ بستر مرگ پر بے حس و حرکت پڑا ہو، اس کے حال کو پوچھ رہی ہو یا پتھر مار رہی ہو رحمہ! میرا اپنے باپ کے علاوہ کوئی خون کا رشتہ اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اور تم لوگوں نے مجھے ایک فون تک کرنا گوارا نہیں کیا۔ اگر میرے پاپا کو کچھ ہو جاتا تو میں تم میں سے کسی کو بھی معاف نہیں کرتی۔''

''تم ہمیں یوں دیکھ رہی ہو، گویا ہم نے کوئی جرم کیا ہے۔'' نفیسہ بھی جلتی بھنتی آ گئی تھیں۔

''تو کیا نہیں کیا؟'' اس کا لہجہ زہر زہر تھا۔

''بولو، کیا کر دیا ہے ہم نے؟'' نفیسہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ آنکھیں نچاتے ہوئے بولی تھیں۔

''میرے باپ کو بسترِ مرگ تک پہنچا دیا ہے، میری فیکٹری پر قبضہ کر لیا ہے، میرے گھر کو بیچنے کی پلاننگ کی جا رہی ہے۔ مگر میں تمہاری بساط تم پر ہی اُلٹ دوں گی نفیسہ بیگم!'' شہرے کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

''ہاں، ہاں....... اب یہی الزام ہمارے سر آنا تھا۔ تمہارے پیچھے حسنین بھائی کا اتنا خیال رکھا، نیندیں قربان کیں، پیسہ پانی کی طرح بہایا۔'' وہ ایک دم چیخنے لگی تھیں۔

''بکواس بند کرو۔'' شہرے ان سے بھی زیادہ بلند آواز میں چلائی۔ ''میں تم لوگوں کے تمام تر ڈرامے کو جان گئی ہوں۔ تم ایک خون چوسنے والی ''لیچ'' ہو۔ تم نے دیمک کی طرح ہمیں چاٹ لیا ہے۔ مگر اب میں تم لوگوں کو مزید کوئی کھیل کھیلنے نہیں دوں گی۔ اور کس پیسے کی بات کر رہی ہو؟ میرے پاپا کی مہربانیوں سے آج تم لوگ کوالالمپور میں

تین اسٹور اسٹیبلش کر چکے ہو۔ دو اسٹور تم لوگوں کے یہاں ہیں اور اب فیکٹری بھی ہتھیانے کے چکر میں ہو۔ مگر میں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔''

نفیسہ کو لگا تھا، ان کا حلق ایک دم سوکھ گیا ہے۔ آواز گم ہوگئی تھی اور لفظ بھی کھوکھلے لگ رہے تھے۔ انہیں اپنا آپ بہت چھوٹا اور بونا سا لگنے لگا تھا۔ وہ انہیں بتا رہی تھی کہ وہ لوگ کیا تھے، اس کے باپ نے انہیں کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

''میں ابھی پولیس کو انفارم کرتی ہوں۔ بہت لوگوں کی زندگیاں جہنم بنا لی ہیں۔ لاک اپ کی دنیا بھی دیکھ لینی چاہئے۔'' وہ پھنکار رہی تھی۔

نفیسہ کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔

''تم ایسا نہیں کرسکتیں۔''

''میں بہت کچھ کروں گی۔ تم دیکھتی رہ جاؤ گی۔ فراڈ کا کیس ہے تم لوگوں پر۔ اپنی خیر مناؤ نفیسہ بیگم!'' اس نے تنفر سے سر جھٹکا اور تیز قدموں سے سیڑھیاں اُتر گئی۔

عاطف انکل تک اس کے خطرناک ارادوں کی بھنک پہنچ چکی تھی۔ فیکٹری سے دستبردار ہونا آسان تو نہیں تھا، مگر اب جان کے لالے پڑ چکے تھے۔ انہوں نے کوڑیوں کے بھاؤ اسٹور اور مکان بیچا اور دوسرے ہی دن کوالالمپور چلے گئے تھے۔

شہرے نے سنا تو ایک افسردہ سی سانس خارج کی۔ اس نے تو صرف انہیں دھمکایا تھا۔ ابھی کسی انتہائی اقدام کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ مگر اس کی دھمکی کام دکھا گئی تھی۔ اسے ایک بات تو سمجھ میں آچکی تھی کہ لوگوں نے اپنے بھیانک چہروں پر کیسے کیسے نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔

اندر سے کیسے کریہہ اور غلیظ تھے اور باطن اس قدر پالش شدہ۔ اسے آنٹی کی تمام باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس پر جی بھر کے پیار لٹانا، خیال رکھنا۔ کیسا شہد آگیں تھا ان کا لہجہ۔ اور وہ رحمہ، جسے بابا نے بیٹی بنا رکھا تھا، وہ جو اس کی ہر چیز پر قبضہ جمالیتی تھی۔ اور جس کے تمام شوق پاپا بخوشی پورے کرتے تھے۔ کیسے دھوکے باز لوگ تھے۔

پاپا کی بیماری اور عاطف انکل کے فراڈ نے اسے اندر سے توڑ دیا تھا مگر وہ پھر بھی خود کو مضبوط ظاہر کر رہی تھی۔

پاپا کو ایک ماہ بعد ڈسچارج کر دیا گیا تھا اور شہرے پورا دن ان کے اردگرد گھومتی رہتی۔ جب پاپا اونگھنے لگتے تو وہ کچھ دیر کے لئے فیکٹری چلی جاتی تھی۔

اسی طرح دن روکھے پھیکے سے گزر رہے تھے۔ ان پھیکے دنوں میں ہلچل انجلی کی

آمد سے ہوئی تھی اور دوسری خوشگوار خبر اس کے ایم بی اے میں ٹاپ کرنے کی تھی۔ وہ بے انتہا خوش تھی۔ پاپا بھی بہت مسرور تھے۔

انجلی اس کے پاس رہنے کے لئے آئی تھی۔ وہ پہلے سے بہت کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ شہرے نے پوچھا تو سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ اس میں ایک یہی عادت تو اچھی تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی تھی۔

''گولڈی نے تمہیں کیوں چھوڑا؟....... اور ابھی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ آخر وجہ کیا تھی؟''

''کیا کرو گی سن کر؟....... مختصر یہ کہ میرے اور اس کے ستارے نہیں ملتے تھے۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح ہماری شادی بھی ناکام ہوگئی ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح ہر بات چٹکیوں میں اُڑا رہی تھی۔

''اب تم کیا کرو گی؟'' شہرے نے گہرے دکھ سے کہا۔

''کرنا کیا ہے، یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔'' انجلی ہنس رہی تھی۔

''تم ہو ہی ایسی کہ پوز کرتی ہو؟'' شہرے نے اُلجھ کر پوچھا۔

''بہت انوسینٹ ہو تم شہری! جو تمہارا ''وہ'' ہوگا نا، دیکھنا دنیا کا سب سے خوش قسمت مرد ہوگا۔'' وہ اسے بڑے کھلے دل سے سراہ رہی تھی۔

''یہاں رہ کر کیا کرو گی انجلی؟'' اس نے بہت دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''جاب۔ اور اس کے بعد ایک اور شادی۔'' انجلی نے کھلکھلا کر بتایا تھا۔ شہرے کی آنکھوں میں حیرت سی بھر گئی۔

''ایک اور شادی....... کیا یہ آسان ہے؟''

''تو اس میں مشکل ہی کیا ہے؟ شادی تو مجھے کرنا ہی ہے، مگر اب میں اپنے ہم مذہب اور ہم وطن سے کروں گی۔ اب کوئی خسارہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔'' اب کے انجلی کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''اگر جاب کرنا ہے تو میری فیکٹری میں کرلو۔''

''آفر اچھی ہے۔ سوچوں گی۔'' انجلی سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔

''سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے اس وقت ایک دوست اور ہمدرد کی ضرورت ہے انجلی! تم اس کرائسز میں میرا ساتھ دو گی۔ میں اس بھری دنیا میں صرف تم پر بھروسہ کر رہی ہوں۔ تم کبھی نفیسہ آنٹی کی طرح مجھے دھوکا مت دینا۔ اب مجھ میں مزید ٹوٹنے کی سکت

نہیں ہے۔'' شہرے ایک دم اس کے شانے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

سچ تو یہ تھا، پاپا کی بیماری، اپنے اکیلے پن اور اس زہریلی تنہائی نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان لاکھوں انسانوں کی بھیڑ میں انجلی کا جانا پہچانا چہرہ دیکھ کر وہ کھل اٹھی تھی۔ اب دل کو قدرے ڈھارس ہوئی تھی۔

انجلی خود بھی اسے یوں بکھرتا دیکھ کر رونے لگی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا دل پگھل کر بہنے لگا ہے۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں شہرے! مجھے بھی ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ میں خود کو جھوٹے بہلاووں سے بہلا بہلا کر تھک چکی ہوں۔ میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں نے بھی زندگی بھر خوشی اور سکون کا ذائقہ نہیں چکھا۔ نہ میرا کوئی گھر ہے، نہ ماں نہ باپ۔ میں خود کو زمین پر بوجھ سمجھنے لگی تھی۔ ایک دم میرا ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا تھا، یہاں تک کہ میں نے خودکشی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ میں تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔ میں انجلی نہیں، ایما ہوں۔'' وہ شرمندگی سے سر جھکائے بول رہی تھی جبکہ شہرے حیران پریشان سی اسے دیکھنے لگی۔ اس انکشاف نے اسے دم بخود کر دیا تھا۔

''ہم دو بہنیں ہیں۔ مریم میری چھوٹی بہن ہے جو کہ پہلے امترا کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ ہماری ماں ہندو عورت تھی۔ اس نے پہلی شادی بھی ایک مسلمان سے کی تھی اور دوسری بھی۔

پاپا نے میرا نام ایما اور امترا کا مریم رکھا تھا۔ مجھے یاد ہے، انہوں نے ہمیں کلمے بھی یاد کروائے تھے اور نماز بھی۔ مگر ممی کو یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ خود کو پاپا سے شادی کے بعد بھی ہندو سمجھتی تھیں۔ پاپا کے مرنے کے بعد میں انجلی اور مریم، امترا ہو گئی۔ مگر ہم دونوں کو ہی مذہب سے دلچسپی نہیں تھی۔ مختصر یہ کہ میں نے یورپ جانے کے جنون میں گولڈی سے دوستی کر لی اور پھر ملائیشیا چھوڑ کر لندن چلی گئی۔ ایک بات بتاؤں شہرے! مجھے انجلی بننا راس نہیں آیا، اسی لئے اب پھر سے ایما بننے کی کوشش کر رہی ہوں...... اس کوشش میں تم میرا ساتھ دو گی نا؟'' اس نے آس بھری نگاہوں سے شہرے کو دیکھا تو وہ بے اختیار اثبات میں سر ہلانے لگی۔

''تم اپنی بہن مریم سے ملی ہو؟''

''ہوں، ملائیشیا آنے کے فوراً بعد میں نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں

بہت خوش ہے۔ اس کی ایک پیاری سی بیٹی بھی ہے۔'' ایما کچھ خوشی اور جوش کے عالم میں اپنے ہینڈ بیگ میں سے تصویریں نکالنے لگی۔

''یہ دیکھو، میری بہن مریم، اس کی بیٹی عائشہ اور یاسر۔ وہ بہت خوش ہے اپنے گھر میں۔ مریم نے بالآخر اپنا گھر بنا لیا ہے۔ انسان جس کی دل سے طلب کرتا ہے، اسے ضرور حاصل کر لیتا ہے۔ بس سچی لگن کا ہونا ضروری ہے۔''

''ارے...... یہ مریم ہے؟'' شہرے نے تصویر کو بغور دیکھا اور خوشی سے چہکی۔

''تم مریم کو جانتی ہو؟''

''ہاں، بس تھوڑا بہت۔'' اس نے جان بوجھ کر مریم کا حوالہ ''میڈ'' کے طور پر ایما کو نہیں بتایا تھا۔

''جب تک پاپا مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتے، تمہیں فیکٹری کی دیکھ بھال کرنا ہو گی۔ میں پاپا کو اک پل کے لئے بھی تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی۔'' شہرے اسے مختصر ترین فیکٹری کے متعلق معلومات دے رہی تھی۔

''ایک بات ہے شہرے! تمہیں میری سیلف ریسپکٹ کا خیال رکھنا ہو گا۔'' ایما نے مسکرا کر کہا تھا۔ شہرے بھی نرمی سے مسکرا دی۔

''تم مجھے اپنے حق میں مخلص پاؤ گی۔'' شہرے نے یقین دہانی کروائی تھی۔ ایما نے آنسو پونچھے اور بولی۔

''اور مجھے بھی...... میرے اخلاص کو وقت ثابت کرے گا۔ تم نے مجھے مان اور یقین دیا ہے، میں تمہارے بھروسے کو کبھی توڑنے کی کوشش نہیں کروں گی۔'' اس کی آنکھوں سے سچائی روشنی بن کر پھوٹ رہی تھی۔

"تم نے میرے پاپا پر قبضہ کر لیا ہے ایما!" شہرے مصنوعی خفگی سے کہہ رہی تھی۔

ڈرائی فروٹ کھاتی ایما مسکرانے لگی تھی اور پھر اسے چڑانے کی غرض سے بولی۔

"اتنے اچھے پاپا کی ڈھیر ساری محبت اکیلے اکیلے بٹور چکی ہو۔ اب ہمارا بھی کچھ حق بنتا ہے۔ کیوں پاپا! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" ایما نے لاڈ سے ان کے شانے پر دونوں ہاتھ رکھے تھے اور پھر اسے ٹھینگا دکھانے لگی۔

"پاپا! آپ یہ فائلیں چیک کر لیں۔" شہرے کے اٹھتے ہی ایما نے تمام فائلیں ان کے سامنے کھولیں تو وہ ناراضی سے کہنے لگے۔

"یہ اب تم دونوں کا کام ہے۔ میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔" انہوں نے صاف جھنڈی دکھا دی تھی۔ ایما فائلیں سمیٹ کر اسے ڈھونڈتی ہوئی کچن میں آ گئی۔ شہرے برتن صاف کر رہی تھی۔ ایما بھی دوسرے سنک کی ٹونٹی کھول کر اس کا ساتھ دینے لگی۔

آج مریم ڈنر پر آئی تھی۔ کچھ نئے حوالے اور پرانی یادوں کی وجہ سے وہ بہت جھجک رہی تھی۔ بے حد شرمسار تھی۔ شہرے نے اس کی تمام جھجک کو چٹکیوں میں اُڑا دیا۔ وہ مریم کو ایما کے حوالے سے خاص اہمیت دے رہی تھی۔ پاپا بھی یہ جان کر کہ ایما، مریم کی بہن ہے، بہت خوش ہوئے تھے۔ مریم کا ہزبینڈ یاسر نہیں آیا تھا۔ شہرے نے پوچھا تو نہ جانے کیوں مریم خاموش ہو گئی۔ وہ پاپا سے ڈھیروں دعائیں لے کر رخصت ہوئی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"بس ایسے ہی۔" اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"ہمیں بتانے کی ضرورت نہیں بنو! سب جانتے ہیں ہم۔ اپنے خوابوں کے شہزادے کو سوچ رہی ہو نا؟" ایما نے یقین بھرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ قدرے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں خوابوں میں رہنے والی لڑکی نہیں۔ اور پھر زندگی نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ کچھ خوابوں کو آنکھوں میں سجا لیا جائے۔" اس کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔ نہ نہ کرنے کے باوجود دل کے دریچے میں کوئی ہولے سے جھانک رہا تھا۔ کسی نے بہت چپکے سے دل کی نرم زمین پر پہلا قدم رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ قوسِ قزح کے رنگ پھیل گئے تھے۔ آنکھیں کچھ دھنک اور خوابوں کے بار سے بوجھل ہو گئی تھیں۔ ایما بہت چاہ کے عالم میں اس کے چہرے پر بکھری، کچھ کہتی، بولتی چاہت کو دیکھ رہی تھی۔

"مان جاؤ شہری! کہ تم نے خوابوں کے جزیرے میں پہلا قدم رکھ دیا ہے۔" ایما نے اسے ڈھیر ساری گدگدی کی۔

اور اس رات شہرے نے اپنے ہر راز میں ایما کو شریک کر لیا تھا۔ وہ اپنے دل کی بدلتی کیفیت اور لندن کی اس شام کا ذکر کر رہی تھی، جب پام کے درختوں سے جھانکتی بدلیوں نے بڑی شریری چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ بائیں پہلو میں کچھ نئے پن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے محبت کے میٹھے میٹھے درد کو پوری شدت سے محسوس کر لیا تھا۔ شہرے حسنین کو اس اجنبی سے محبت ہو گئی تھی۔

آج "چودھویں" کی رات تھی۔ تبھی تو ہر شے نور میں نہائی لگ رہی تھی۔ چنبیلی اور جوہی کے پھول مسکرا رہے تھے۔ فضا خوشبوؤں اور پھولوں کی مہک سے بوجھل تھی۔ گل انار پر بھی جوانی اُتر آئی تھی۔ خوابیدہ کلیاں بھی انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ ہوا نزاکت کی چال میں بڑی مغرور سی چل رہی تھی۔ کالی گھٹا نے شرما کر منہ چھپا لیا۔ خیابان اور پھلواری کی ترنگ ہی نرالی تھی۔ بادِ صبا اور بادِ نسیم خوشبو کے ہار لئے کلیوں کے رخسار چوم رہی تھیں۔ کلیاں چٹک رہی تھیں، خوشبو بکھر رہی تھی۔ ارغوانی ٹہنیاں بھی مست ہوا کا ساتھ دے رہی تھیں۔ یہ اطیب ہوا تھی۔ بڑی پاک، صاف، شفاف، خوشبو دار۔ اس اطبالہ کی ڈبیہ میں محبت کی مہک بند تھی اور سینے میں دھڑک رہی تھی۔ سات رنگوں کا ریشم اُلجھ رہا تھا، کچھ سلجھ رہا تھا۔

نوکِ مژگاں پر پہلی شبنم نے اُتر کر چاہت کے قدم چومے تھے۔ محبت کی آواز پر دل نے لبیک کہا تھا۔ سفید پھولوں کے باغ لہک لہک کر تائید کر رہے تھے۔ عصفر کے پھول بھی جھومنے لگے۔ صباح کے شہر میں کبھی ایسی رات آج سے پہلے نہیں اُتری تھی۔

"میں سوچا کرتی تھی کہ یہ بچہ میرے گناہوں کی سزا بن کر آ رہا ہے۔ مگر اب ممتا

کے سوتے نہ جانے کہاں سے پھوٹ پڑے ہیں۔"

ایما نے ننھے ایمان کو چوم کر اس کی گود میں دے دیا تھا۔

مریم بھی رات سے ادھر ہی تھی۔ وہ لوگ بہت خوشی خوشی ننھے ایمان کو لے کر ہسپتال سے گھر آئے تھے، جب حسن بابا نے گھبراتے ہوئے اطلاع دی۔

"شہری بی بی! صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"کہاں ہیں پاپا؟" وہ بھاگتے ہوئے ان کے بیڈ روم میں آئی تھی۔ وہ صوفے پر بالکل چت لیٹے تھے۔ شہری نے روتے ہوئے انہیں بری طرح جھنجوڑا۔

مگر نہ جانے کیوں آج انہوں نے شہری کے آنسوؤں سے گھبرا کر آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

"نہیں پاپا!...... آپ ایسا نہیں کر سکتے...... مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" وہ بے یقینی کے عالم میں مریم سے لپٹی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ایما نے گھبراتے ہوئے ڈاکٹر کو فون کیا تھا۔ ڈاکٹر چند منٹوں میں ہی آ گیا۔ وہ ان کا چیک اپ کر رہا تھا۔ نبض ٹٹولی، دل کی دھڑکن چیک کی اور پھر تاسف سے سر ہلاتا کھڑا ہو گیا۔

"آئم سوری۔" اس کے دو لفظ شہرے کی دنیا اُجاڑ گئے۔ وہ ایک دم لہرا کر مریم کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔

ہوش تو اسے چند گھنٹوں بعد آ گیا تھا، مگر اس کی حالت کے پیش نظر ڈاکٹر نے اسے سکون کا انجکشن لگا دیا۔ وہ دو دن سوئی جاگی کیفیت میں دیواروں کو تکتی رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ، دھیرے دھیرے اس کا شعور نیند سے جاگنے لگا۔ وہ اپنے نقصان کا اندازہ لگانے کے قابل ہو گئی تھی۔ اسی لئے ایک دفعہ پھر گھر کے در و دیوار اس کی آہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے رو پڑے۔

سیکنڈ منٹوں میں اور منٹ گھنٹوں میں بدلنے لگے۔ رات دن میں اور دن رات میں ادغام کر رہا تھا۔ وقت کی نبض کبھی رکی نہیں تھی۔ اسے تو صرف چلنا ہی تھا۔ مریم اور ایما کی محبتوں اور دلجوئی نے رِستے زخموں پر مرہم رکھا تھا۔ کبھی کبھی شہرے سوچتی تھی کہ اگر ایما اور مریم نہ ہوتیں تو وہ تنہا ان دیواروں سے ٹکریں مارتے مارتے خود ہی مر جاتی اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

مریم بھی اپنا گھر بار چھوڑ کر صرف اس کی تنہائی کی خاطر ادھر رہ گئی تھی اور جب وہ اپنے مخصوص ہندی لہجے میں "شہری جی" کہتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔ مریم اس سے بڑی

تھی مگر اس کا بہت احترام کرتی تھی۔

اس شام مریم اسے ہمیشہ کی طرح گم سم بیٹھا دیکھ کر لان میں چلی آئی تھی۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد مریم نے اسے مخاطب کیا۔

"ہر جان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔" مریم نے ایک قرآنی آیت کا ترجمہ کیا تو شہرے چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کا ایمان اس آیت کے بارے میں کیا کہتا ہے؟" مریم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی، بس سر جھکائے آنسو پیتی گھاس کو نوچتی رہی۔

"شہری جی! میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں؟" اب کے مریم نے کچھ سختی سے کہا۔ وہ خاموش رہی تھی اور سر کو گھٹنوں میں چھپانے لگی تھی۔

"قرآن پاک، پیغمبرؐ پر اُتری کتاب ہے۔ اس کا لفظ لفظ سچا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"تو پھر آنسو پونچھ ڈالیے، شہری جی! کہ یہی اللہ کا حکم ہے۔ اس نے ایک مقررہ وقت تک مہلت دے رکھی ہے انسان کو۔ اللہ جب چاہے اپنے بندوں میں سے جس کو مرضی اپنے پاس بلا لے۔ یہی ہمارا ایمان ہے، عقیدہ ہے۔ ہم صرف سچی بندگی کے لئے بھیجے گئے ہیں تاکہ اس کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کریں۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے۔ جب وہ عطا کرتا ہے تو خوش ہوتے ہیں اور جب وہ کسی آزمائش میں ڈالتا ہے تو شکوے کرنے لگتے ہیں۔ یہ محبت کے اصول نہیں ہیں۔" مریم کے لہجے میں مٹھاس تھی۔ وہ خواب کی کیفیت میں گویا سن رہی تھی، سمجھ رہی تھی۔ اس کا دل گویا کسی نے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور پھر کمرے میں بند ہو گئی۔

اس نے کتنے ہی شکوے کئے تھے اپنے اللہ سے۔ اسے اب معافی مانگنا تھی، سر جھکانا تھا، رونا گڑگڑانا تھا۔ وہ وضو کر رہی تھی اور اس کے آنسو بھی رواں تھے۔

اگلی صبح بہت مختلف تھی۔ شہرے نے ان کے ساتھ ناشتہ بھی کیا تھا اور پھر بہت دنوں بعد ایمان کو بھی گود میں اٹھایا۔ وہ اسے پیار کر رہی تھی، چوم رہی تھی۔ اس کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ ایما خوش تھی، مریم مسرور تھی کہ شہرے آہستہ آہستہ ہی سہی، زندگی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

اور اسی صبح اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے اس فیصلے سے ایما کو آگاہ کر چکی تھی اور ایئرپورٹ پر مریم نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"شہری جی! میں آپ کی کامیابی کے لئے دعا کروں گی۔"

"کیسی کامیابی؟" شہرے نے جان بوجھ کر انجان بن کر کہا تھا۔ مریم دھیمے سے مسکرا دی۔

"محبت میں کامیابی کی۔" ایما نے بھی مسکرا کر گفتگو میں حصہ لیا۔ کچھ دیر بعد جہاز آسمان کی وسعتوں میں گم ہونے لگا تھا۔ اور زمین پر کھڑی ان دو بکھری عورتوں نے اس کی سچی خوشیوں کے لئے دل سے دعا کی تھی۔ جوان کی محسن تھی، جس نے انہیں سہارا دیا تھا۔

"شہری جی! آپ یاسر کے پاکستان جا رہی ہو۔ اس ہرجائی کے ملک کی ہوا کو بتا دینا کہ مریم اسے ہمیشہ کے لئے دل سے نکال چکی ہے۔" مریم نے چپکے سے اپنے آنسو صاف کئے تھے اور عائشہ کو سینے سے لگا لیا۔

یاسر اپنے وطن واپس گیا تو پھر لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ اکثر دھیمی آواز میں ہندی گانا گنگناتی تھی۔ اور اس کی درد میں ڈوبی آواز ایما کا دل چھلنی کر دیتی تھی، جو ہر شے سے بے نیاز گنگنا رہی ہوتی تھی۔

ہمیں چھوڑ دیا کس دیس گئے
پیا لوٹ کے آنا بھول گئے

"شہری بیٹا! اُٹھ جاؤ۔ صبح کے گیارہ بج رہے ہیں۔" کسی نے اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا۔ اس نے مندی مندی آنکھیں کھول کر یہ سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس وقت ہے کہاں۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد ذہن میں کلک کے ساتھ ہی سب کچھ روشن ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم بستر سے اُٹھی تھی۔ اس کے قریب ہی ثوبیہ آنٹی بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ شہرے شرمندہ سی اُٹھی۔ "آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟ میں اتنی دیر تک کبھی نہیں سوئی۔"

"میں نے سوچا کہ تم بھرپور نیند لے لو۔ سفر کی تھکان بھی دور ہو جائے گی۔ اس لئے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ عانیہ کے تین فون تو آ چکے ہیں۔ تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔" آنٹی نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر ہولے سے دباتے ہوئے کہا تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ شہرے کو یہاں آ کر قطعاً اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ آنٹی اور انکل کے خلوص اور محبت سے وہ بہت متاثر ہوئی تھی مگر ابھی اس نے انہیں اپنے پاکستان میں قیام کا مقصد نہیں بتایا تھا۔ وہ عانیہ کو اس راز میں شریک کرنا چاہتی تھی۔ عانیہ سے فون پر

بات کرنا مناسب نہیں تھا، اسی لئے وہ جلد از جلد کراچی پہنچنا چاہتی تھی۔

"میں ذرا فریش ہو لوں، پھر عانیہ سے بات کروں گی۔" شہرے نے کچھ سوچتے ہوئے سلیپر پیروں میں ڈالے۔

"عانیہ اس وقت آفس میں ہو گی۔ تمہارے انکل اپنے دوست کی گاڑی لے آئے ہیں۔ ڈرائیور بھی آ جائے گا۔ اب تم فٹافٹ تیار ہو کر آ جاؤ۔" آنٹی نے مسکراتے ہوئے شفقت سے کہا۔ وہ بیمار تھیں مگر پھر بھی کس قدر ایکٹو تھیں۔ شہرے سر ہلا کر واش روم میں گھس گئی۔

اس نے جلدی جلدی ہاتھ منہ دھویا، برش کیا اور پھر باہر آ کر بال سلجھانے لگی۔ شہرے کا ذہن آنٹی کے چند الفاظ میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

"عانیہ آفس میں ہو گی۔ تو کیا عانیہ جاب کرتی ہے؟ اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ خوامخواہ ایک مرتبہ پھر یونیورسٹی کے لئے کانشس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹائم ہی پاس کرنا ہے نا۔ مصروف رہنے کے لئے پھر سے یونیورسٹی جوائن کرنے کے بجائے مجھے جاب کر لینی چاہیے۔ عانیہ ضرور میری اس معاملے میں مدد کرے گی۔ چاہے جیسی بھی جاب مل جائے۔ معمولی سی، کم سیلری بھی ہو، تب بھی چلے گی۔ مجھے کون سا پیسے کی ضرورت ہے۔ اسفند ماموں تک پہنچنے کے عرصے کے دوران اچھا ہے میں بھی مصروف رہوں گی اور عانیہ کے ساتھ رہنے کا بہانہ بھی مل جائے گا۔ عانیہ یقیناً ہاسٹل میں ہی رہتی ہے۔"

وہ سوچوں کے تانوں بانوں میں اُلجھی میز تک آئی تھی۔ اس نے ناشتے میں صرف دودھ لیا۔ آنٹی کے اصرار کے باوجود اس نے بریڈ کا پیس تک نہیں لیا تھا۔ اس نے جلدی جلدی دودھ پیا اور پھر کھڑی ہو گئی۔

"انکل کہاں ہیں؟ کیا وہ بھی جاب کرتے ہیں؟"

"نہیں بیٹا! وہ تو پانچ سالوں سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اس وقت بل جمع کروانے اور پنشن لینے گئے ہیں۔" آنٹی برتن اٹھاتے ہوئے بتا رہی تھیں۔ شہرے کچھ سوچ کر دوبارہ بیٹھ گئی۔

"آنٹی! عانیہ آپ کی اکلوتی بیٹی ہے؟"

"نہیں، ایک بیٹا بھی ہے۔" نہ جانے شہرے کو کیوں محسوس ہوا تھا کہ آنٹی کی آواز لڑکھڑا گئی تھی۔

"وہ کہاں ہوتا ہے؟ کیا پڑھتا ہے؟" شہرے نے ایسے ہی بات بڑھانے کی غرض

سے پوچھ لیا تھا۔

آنٹی پھیکے سے انداز میں مسکرا دیں۔

''اسی شہر میں ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ ماشاء اللہ سے انجینئر ہے۔ آئی ٹین ٹو میں ہمارا ذاتی دو منزلہ مکان ہے، اسی گھر میں رہتا ہے، میرا بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ۔''

''تو آپ وہاں ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟'' شہرے نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس کی بیوی کو پسند نہیں ہمارا وہاں رہنا۔'' اب وہ برتن دھونے لگی تھیں۔

شہرے نے دکھ کے عالم میں آنٹی کے کمزور وجود کی طرف دیکھا۔

'نہ جانے لوگ بیٹوں کی دعائیں کیوں کرتے ہیں۔' وہ رنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔

'کیا اس وجود کو بیٹے کے سہارے کی ضرورت نہیں یا پھر جھکے شانوں والے قائم انکل کو، جو اس عمر میں آرام کرنے کے بجائے بل جمع کروانے کے لئے یقیناً لائن میں کھڑے ہوں گے۔' شہرے آزردگی سے سوچتے ہوئے اٹھی تھی اور پھر برتنوں کو صاف کپڑے سے خشک کر کے شوکیس میں سجانے لگی۔

''گھر میں روز روز کی چخ چخ اور آئے دن کے جھگڑوں کی وجہ سے ہم دونوں نے یہ سوچا کہ بیٹا اور بہو کیوں گھر چھوڑیں، ہم ہی وہاں سے نکل آتے ہیں۔ میری بہو ناعمہ بہت جھگڑالو اور بدزبان عورت ہے۔ وہ ان بدنصیب عورتوں میں سے ہے، جنہیں ''دعا'' لینا زہر لگتا ہے۔ شادی کے شروع دنوں میں جب میں اس کی گود بھرنے کی دعا کرتی یا پھر اس کے سامنے اظہار کرتی تو اسے آگ ہی لگ جاتی تھی۔ وہ مجھے عیار اور مکار عورت سمجھتی ہے، وہ کہتی ہے میں جادوگرنی ہوں، وظیفے کرتی ہوں۔ میری عبادت بھی اسے پسند نہیں تھی۔ ہنسنا، بولنا، بات چیت کرنا، گھریلو معاملات میں دخل دینا، حتیٰ کہ کھانے پینے پر بھی اس نے پابندی لگا رکھی تھی۔ رات کو کچن کے دروازے پر تالا لگا دیتی تھی، سردیوں میں ہیٹر نہیں چلانے دیتی تھی اور گرمیوں میں اے سی پر پابندی۔ اگر کوئی مجھ سے ملنے آتا تو اس کی اتنی بے عزتی کرتی کہ پھر کسی کو ادھر آنے کی جرأت ہی نہ ہوتی۔ ایسے حالات میں تمہارے انکل نے الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر ہم اس کرائے کے فلیٹ میں شفٹ ہو گئے۔

عانیہ شروع سے ہی کراچی اپنی نانی کے پاس رہتی تھی۔ اماں کے مرنے کے بعد اس نے ہاسٹل میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ماسٹرز کے بعد وہ جاب کرنے لگی تھی۔ ہماری تکلیفوں کا بہت احساس رہتا ہے۔ اسی لئے تو بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں۔''

انہوں نے کہا تھا اور پھر کرسی پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگیں۔ یقیناً گزرے وقت کی اذیتیں یاد آنے لگی تھیں۔

''آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔''

''تو آپ کا بیٹا بھی نہیں آتا آپ سے ملنے۔'' شہرے نے بے حد تاسف سے پوچھا۔

''وہ ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ اب سنا ہے کہ ایک ماہ پہلے وہ واپس آ گیا ہے۔ مگر اس ذلیل عورت نے کبھی بھی اسے ہم سے ملنے نہیں دینا۔ نہ جانے کون سا بیر باندھ رکھا ہے اس نے مجھ سے، میرے بیٹے سے۔ ہم نے یہی سوچ کر الگ ہونے کا فیصلہ کیا تھا کہ بیٹا اور بہو تو خوش رہیں مگر ناعمہ نے میرے بچے کی زندگی بھی جہنم بنا رکھی تھی۔ وہ میرے ساتھ لڑتا جھگڑتا تھا کہ میں نے اسے دوزخ میں پھینک دیا ہے۔ وہ بیوی کے روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر باہر چلا گیا تھا۔ وہ ہم سے کبھی بھی نہیں ملے گا۔ وہ مجھ سے خفا ہے، ناراض ہے۔ کیونکہ میں نے ہی ناعمہ کو اس کے لئے پسند کر کے بیٹے کو اور اپنے آپ کو برباد کر لیا ہے۔'' آنٹی ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

''اس میں آپ کا کیا قصور ہے آنٹی؟''

''اس کی ماں جو ہوں۔ یہی میرا جرم ہے۔'' وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

شہرے گلاس میں پانی لے آئی تھی اور پھر گلاس ان کے لبوں سے لگا دیا۔

''ارے، میں بھی کون سی باتیں لے بیٹھی ہوں۔ نیچے ڈرائیور آ گیا ہو گا۔ تم جاؤ، تھوڑی سی تفریح کر لو۔ پھر تم نے کراچی چلے جانا ہے۔ کلاسز اسٹارٹ ہونے کے بعد تو مصروف ہو جاؤ گی۔'' آنٹی نے نرمی سے کہا تھا اور پھر کھڑکی میں سے نیچے جھانکا۔

''لو، ڈرائیور آ گیا ہے۔ بزرگ آدمی ہے۔ سارے شہر کے راستوں سے واقف ہے۔ تم اطمینان سے گھوم پھر لینا۔'' شہرے بالوں کو بینڈ میں جکڑ کر، پنک جاگرز کے تسمے کسنے لگی تھی۔ کھدر کا کرتا، بلیو ٹراؤزر اور گلے میں بڑا سا اسکارف، بالوں کی اونچی سی پونی کئے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ آنٹی نے دل ہی دل میں نظر اتاری۔

'حسنین کی بیٹی بہت خوب صورت ہے۔'

''اچھا آنٹی! اللہ حافظ۔'' وہ ان کے سامنے جھکی تو انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ شہرے نے اپنا ڈیجیٹل کیمرہ گلے میں لٹکایا، لیڈر بیگ ہاتھ میں پکڑا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں اُترنے لگی تھی۔

''لو اجنبی! ہم تمہارے پاکستان تو پہنچ چکے ہیں۔ اب اگر تمہارا نام ہماری پیشانی پر

ثبت ہوا تو تم کسی نہ کسی موڑ پر تو ٹکراؤ گے نا۔ یہی یقین مجھے دوسری دنیا سے کھینچ کر یہاں لے آیا ہے۔ مجھے خود پر اور اپنی اس یک طرفہ محبت پر بھروسہ ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ملیں گے۔ میں نے تمہیں اتنا سوچا ہے، اتنا یاد کیا ہے، اتنا چاہا ہے کہ خود کو بھی بھولنے لگی ہوں۔ ہے نا احمقانہ سی محبت۔'' وہ مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

چار پانچ گھنٹوں میں وہ دامن کوہ، لوک ورثہ، ہیری ٹیج میوزیم دیکھ چکی تھی۔ اب خان بابا اسے پھولوں کی نمائش کے متعلق بتا رہے تھے۔ گاڑی کا رخ یاسمین گارڈن کی طرف تھا۔

آدھے گھنٹے بعد راول ڈیم جا رہے تھے۔ تقریباً تین بجے تک واپسی ہوئی تھی۔

بھوک سے اس کا برا حال تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی بابا سے کہا۔

''کسی ریسٹورنٹ میں چلیں۔''

''اچھا بی بی صاحب!'' خان بابا نے سر ہلایا اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ پی سی کی پارکنگ میں گاڑی روک چکے تھے۔

''آپ بھی آئیں نا، خان بابا!'' وہ گاڑی میں سے باہر نکلتے ہوئے بولی تھی۔ خان بابا نے گھبرا کر نفی میں سر ہلایا۔

''ام کو بھوک ووک نہیں ہے۔ آپ جاؤ، ام ادھر بیٹھ کر پان کھاتا ہے۔''

''اوکے۔'' شہرے نے مزید اصرار نہیں کیا تھا۔ بالکل ندیدوں کی طرح کھانا کھاتے ہوئے وہ اردگرد سے قطعاً بے نیاز تھی۔ کھانا بہت مزے کا تھا یا پھر بھوک ہی بہت شدید تھی۔ اس نے ویٹر کو آواز دی تھی اور پھر مزید آرڈر نوٹ کروایا۔

''چائنیز الو کے ساتھ ٹماٹر اینڈ منٹ کی ساس لانا۔ اور مٹن ود ٹماٹو کے ساتھ چائنیز پلاؤ پیک بھی کروا لاؤ۔ بے چارے خان بابا بھوکے بیٹھے ہوں گے۔'' آخر میں خود کلامی کی گئی تھی۔

ویٹر دانت نکال کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ''کچھ اور میم؟''

''ہاں، بات سنو۔ یہاں سے گول گپے مل جائیں گے؟'' اس کے لہجے میں اشتیاق کے ساتھ ہلکی سی بے تابی تھی۔ ویٹر کے تاثرات سے اسے جواب مل گیا تھا۔ اسی لئے کچھ کھسیا کر پلیٹ پر جھک گئی تھی۔ اس بات سے بے نیاز کہ برابر موجود ٹیبل کے اردگرد بیٹھے کچھ نفوس بہت ہی دلچسپی کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے۔ ان سب کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

ان نگاہوں کی تپش نے ہی اسے سر اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ جوں ہی اس نے دائیں اور پھر بائیں جانب دیکھا تو زمین و آسمان گویا گول گول گھومنے لگے تھے۔ وہ ایک ٹک دم بخود سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اور پھر ایک دم ہوش میں آ کر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے تھے اور آنکھیں موند کر زور و شور سے دعا کرنے لگی۔

''ہائے اللہ جی! یہ تو وہی ہے۔ ہائے، میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟........ اللہ جی! میری دعا اتنی جلدی قبولیت کا درجہ پا گئی ہے۔ کیا ایسے بھی سرِ راہ کوئی مل سکتا ہے، کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟ کوئی دل کے اتنا قریب ہو سکتا ہے کہ ہر چہرے میں بس اسی کا چہرہ نظر آئے؟'' اب وہ کپکپاتے ہونٹوں پر ہاتھ پھیر کر پھر سے بائیں طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ وہ تین لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل گروپ تھا۔ اور وہ ابھی تک اس کی عجیب و غریب حرکات دیکھ کر مسکرانے کے ساتھ ساتھ محظوظ ہو رہے تھے۔

''یہ لوگ مجھے دیکھ کر کیوں ہنس رہے ہیں؟ اور وہ بھی تو مسکرا رہا ہے اور مجھے ہی مسلسل دیکھ بھی رہا ہے۔ نہ جانے کیا نام ہے اس کا۔ کاش کہ میں اس کا نام جان سکتی۔ ابھی اسی پل اسے لندن کی اس شام کے متعلق بتا سکتی جس نے مجھے اسیرِ محبت کیا تھا۔'' وہ سوچوں کے تانوں بانوں میں اُلجھی چور نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ اور کتنے لوگ تھے اور وہ کون تھے؟ شہرے نے جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تو بس نگاہوں کے راستے اسے دل میں اتار لینا چاہتی تھی۔ تب ہی ایک سرگوشی نما آواز اس کے کان میں پڑی۔

''زارون! تجھے دیکھ کر یہ لڑکی تو گئی کام سے۔ ہم لوگ بس لعنت بھیج کر جا رہے ہیں۔ آئندہ کہیں بھی تمہیں ساتھ لے کر نہیں جانا۔ ہماری اتنی اچھی پرسنالٹی تمہارے سامنے ڈاؤن ہو کر رہ جاتی ہے۔'' مونس جل بھن کر کہہ رہا تھا۔

(......❀......)

اسی شام وہ لوگ واپس کراچی آ گئے تھے۔ ان سب کے مشترکہ دوست انس کی ویڈنگ اینی ورسری تھی، اسی لئے وہ سب اپنے تمام ضروری کام چھوڑ کر اسلام آباد آ گئے تھے کیونکہ انس کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر روٹھنے کی بیماری تھی۔ اس دفعہ عدن کے مشورے پر ان سب نے انس کو مختلف پیکنگ میں لپٹے ایسے گفٹ دیئے تھے جنہیں کھولنے کے بعد وہ دانت کچکچاتا ضرور گالیوں سے نواز رہا ہو گا۔ اس بات کا تو ان سب کو پورا پورا یقین تھا، اسی لئے مونس نے اسے بڑے دلار سے کہا تھا۔

"یار انس! جب ہم لوگ جہاز میں بیٹھ جائیں گے تب تم اور بھابی دونوں ہمارے گفٹس کھول کر دیکھنا اور ہمیں دعائیں بھی دینا۔ کیونکہ تمہارے فیوچر کے کچھ اخراجات ہم سب نے مل بانٹ کر کم کر دیئے ہیں۔"

"دوست ہوں تو ہمارے جیسے۔ پہلے سے ہی اپنے یار کے کچھ برڈن کو ہم نے کم کرنے کی کوشش کی ہے۔" زین نے بھی زارون کو آنکھ مار کر کہا۔

"بس ہسپتال کا بل تم کلیئر کرنا۔" یہ سویٹی تھی، جو عدن کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس رہی تھی۔

"ہے کیا ان ڈبوں میں؟ بہت ہلکے لگ رہے ہیں۔" انس ان کی لن ترانیوں سے چڑ گیا۔

"میری جان! گھر جا کر دیکھ لینا۔ ابھی تو ہمیں اجازت دو۔" زارون اس کا کندھا تھپک کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہ سب اس کے پیچھے ہنستے ہوئے آ گئے تھے۔ اور اب زارون کے گھر میں اس کے بیڈ روم میں صوفے پر لیٹا مونس ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا۔ جبکہ زارون، سیل فون کان سے لگائے اپنی صفائیاں پیش کر رہا تھا۔ دوسری طرف سے ہنوز گولہ باری جاری تھی۔

"بے شرمو! بچ کر نکل گئے ہو میرے ہاتھ سے۔ چھوڑوں گا نہیں میں تم لوگوں کو۔ حد ہوتی ہے کنجوسی کی۔ میں جو مہنگی مہنگی شرٹس، کچھ نئی نکور جینز اور سات آٹھ ہزار والے جوتوں اور امپورٹڈ پرفیوم کی چاہ میں اتنا خرچہ کر چکا ہوں، میری جیب کا کباڑا ہو گیا ہے۔ ذلیلو! زندہ نہیں چھوڑوں گا میں تم سب کو۔ بے شرم! ذرا بھی حیا نہیں آئی۔ دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے، جو چھوٹے چھوٹے ڈبے میرے منہ پر مار کر چلے گئے ہو۔ اور ان میں سے برآمد کیا ہوا ہے۔ فیڈر، چوسنیاں، پپی ہاؤس، بے بی ڈریسز، کینڈیز اور چاکلیٹس۔ میرا ہارٹ فیل ہونے لگا تھا۔" انس کی دہائیاں زور وشور سے جاری تھیں۔ اس کی آواز فون سے باہر تک آ رہی تھی۔ اب کے زارون کو بھی غصہ آ گیا۔

"کمینگی کی حد ہوتی ہے۔ ہمارا کھایا پیا گن رہے ہو۔ نہ جانے کس نیت سے ڈنر کروایا تھا تم نے۔ ہم سب تو بیمار بستروں میں پڑے تمہاری ویڈنگ اینی ورسری کو رو رہے ہیں۔" زارون نے مونس کو اشارہ کر کے حساب برابر کیا تھا۔ دوسری طرف وہ ابھی تک جل بھن رہا تھا۔

"ندیدے انسان! نہ مر جانا۔ آج شام کو ہماری طرف سے تمہیں کئی پارسل ملیں

گے۔" زارون نے اسے مزید ستانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ دوسری طرف گویا سکھ کا سانس لیا گیا۔ سوکھے دہانوں پر چھینٹے پڑے تھے۔ اب وہ مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

"تم لوگوں کے گفٹس تو بہت اچھے تھے۔ ردا کو بہت پسند آئے تھے۔ اس نے انہیں سنبھال کر رکھ لیا ہے، مگر ابھی تک تم لوگوں کے چاچو بننے کے آثار نظر نہیں آ رہے۔"

"اب آئے ہو لائن پر۔" زارون نے مسکرا کر سیل آف کیا تھا اور پھر لوٹ پوٹ ہوتے مونس کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں نے تمہاری اور عدن کی جان بخشی کروا دی ہے۔ ابھی اس نے تم دونوں کی کلاس بھی لینی تھی۔"

"ویسے یار زارون! ہمارا اسلام آباد جانا مبارک ثابت ہوا ہے۔" مونس نے کشن بازوؤں میں دبوچ کر شریر انداز میں کہا تھا۔ وہ ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب؟"

"بھئی مجھے تو پی سی میں گول گپوں کی شوقین حسینہ کی وہ نظریں نہیں بھول رہیں جو تمہیں فدا ہونے والی نگاہوں سے تک رہی تھی۔ یار! کیسے دھنک کے رنگ پھیلے تھے اس کے چہرے پر۔ کوئی نئے نئے بھید کھل رہے تھے، راز افشا ہو رہے تھے۔ ان آنکھوں کا مفہوم کچھ اور تھا۔ تم نے غور نہیں کیا، جب وہ ایک دم ہماری طرف متوجہ ہوئی تو صرف ایک تمہارے چہرے پر اس کی نگاہ ٹھہری تھی۔ ان اٹھتی پلکوں والی آنکھوں کے رنگ دیکھے تھے۔ پہلے حیرت، پھر خوشی اور پھر بے تحاشا خوشی تھی۔" مونس بہت تول تول کر اور سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ وہ خاموش ہوا تو زارون نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا سوچ رہے ہو مونس! آگے بھی بولو۔"

"تم نے دیکھا تھا زارون! اس نے دعائیہ انداز میں ہاتھ پھیلائے تھے۔ اس کی آنکھوں میں تشکر اور خوشی کے ساتھ اک محبت بھری چمک بھی تھی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" زارون نے حیرت سے کہا۔

"ویسے تو بڑے زیرک بنتے ہو، اتنی چھوٹی سی بات تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔ وہ لڑکی تمہیں پہلے سے جانتی ہے۔ اس نے یقیناً پہلے بھی تمہیں کہیں دیکھ رکھا ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ادھر معاملہ دل کا ہے۔" مونس وثوق سے بولا۔

"مگر کہاں؟ میں نے تو اسے فرسٹ ٹائم دیکھا ہے۔" زارون نے حیرانی سے کہا۔

وہ تو خود اس لڑکی کے تاثرات دیکھ کر ششدر تھا۔ کم وبیش ایسی ہی باتیں اس نے کئی

مرتبہ سوچی تھیں اور اس پہلو پر بھی غور کرتا رہا تھا۔ مونس ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس لڑکی کے تاثرات نظرانداز کئے جانے والے نہیں تھے۔

''یار! ایک غلطی ہوئی ہے۔'' مونس نے تاسف سے کہا۔

''کون سی غلطی؟'' وہ مونس کی طرف چونک کر دیکھنے لگا تھا جو کہ پُرسوچ نظروں سے سامنے لگی پینٹنگ کو بغور تک رہا تھا۔

''اس لڑکی کا اتا پتہ معلوم کرنا چاہئے تھا۔''

''کیوں؟'' زارون نے ناگواری سے پوچھا۔

''بس ایسے ہی، اس کی آسانی کے لئے کہہ رہا ہوں۔ وہ بھی شاید کچھ ایسا ہی اس وقت سوچ رہی تھی۔ اگر ہم تھوڑی دیر اور نہ اٹھتے تو اس نے تم سے ایڈریس یا فون نمبر تو ضرور مانگ لینا تھا۔'' مونس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''کسی کے بارے میں بغیر جانے فضول کمنٹس نہیں دیتے۔'' زارون نے سنجیدگی سے کہا۔

''مگر میں تو چند لمحوں میں ہی اس کے اندر تک کے ''بھید'' کو جان چکا ہوں اور منہ پر نہ سہی خودتم بھی میری ہر بات سے اتفاق کرتے ہو۔'' مونس مسکرایا۔

''کون سی بات؟'' اس نے جزبز ہو کر پوچھا۔

''یہی کہ وہ لڑکی تم سے یعنی زارون اسفند یار سے محبت کرتی ہے۔''

''بکو نہیں۔'' اس نے غصے سے کہا تھا۔ مونس مسلسل مسکراتا رہا۔

''میں سچ بول رہا ہوں۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مونس فریدوں کا مشاہدہ کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے چہرے پر بڑی واضح تحریر لکھی تھی کہ مجھے تم سے محبت ہے دیوانگی کی حد تک۔'' مونس باقاعدہ ٹیبل بجا بجا کر گا رہا تھا۔ اور پھر ایک دم ہی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ مونس نے اس سے کچھ کہنا چاہا، پھر لب بھینچ کر خاموش ہو گیا۔

وہ اس وقت عدن کے بارے میں سوچ رہا تھا جو کہ زارون سے شدید محبت کا دعویٰ کرتی تھی۔ مگر زارون اس بارے میں خاموش تھا۔ اس نے کبھی تردید یا تائید نہیں کی تھی۔

''کیا میں اسے ایک مرتبہ پھر دیکھ چکی ہوں؟''

شہرے کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔ وہ بار بار خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خوشی اور سرشاری اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کے دوست مونس نے اس کا نام زارون لیا تھا۔ اور شہرے نے کتنی ہی مرتبہ اپنے لبوں سے اس نام کو ادا کیا تھا۔ آنٹی بھی اسے معمول سے زیادہ خوش دیکھ کر حیران تھیں۔ ان کے خیال میں سفر کی تھکان اُتر جانے کی وجہ سے وہ فریش نظر آ رہی تھی۔ اور خود شہرے بھی بڑے وثوق سے انہیں باور کرا رہی تھی کہ ''آنٹی! یوں لگ رہا ہے، مسافتوں کی تھکن نے کبھی وجود کو چھوا تک نہیں۔'' رات کو انکل اس کی فیوچر پلاننگ کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

''شہری بیٹا! کیا تم ماسٹرز کرنا چاہتی ہو؟''

''نہیں انکل! اب میں نے ارادہ بدل لیا ہے۔ کیونکہ میں ایم بی اے کر چکی ہوں۔ اب اور پڑھ کر کیا کروں گی؟ میرا خیال ہے، مجھے جاب کر لینی چاہئے۔'' وہ انکل سے جھوٹ نہیں بول سکی تھی۔

''اب تم یہیں رہو گی نا؟'' آنٹی نے پوچھا۔

''ہوں۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔

''حسنین کی خواہش تھی، تم پاکستان میں ہی رہو۔'' آنٹی کپڑوں کے ڈھیر کو دری پر رکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''انکل! سیٹ کنفرم ہو گئی ہے؟''

''کل آٹھ بجے کا ٹائم ہے۔'' انہوں نے اخبار پر سے نگاہ ہٹا کر جواب دیا۔

''کچھ دن اور رہ لیتیں۔'' آنٹی نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا بھی اچھا وقت گزرنے لگا تھا۔''

"آنٹی! اصل میں مجھے کراچی ضرور جانا ہے۔ کیونکہ وہاں میرا ایک کام ہے۔ اسی کام کے سلسلے میں ہی میں آئی تھی۔" اس نے مسکرا کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔ اسی پل عانیہ کا فون آ گیا۔

"کب آ رہی ہو؟" انکل سے بات کرنے کے بعد عانیہ نے اس سے بات کرنا چاہی تھی۔

"کل شام تک پہنچ جاؤں گی۔" وہ عانیہ کو بتانے لگی تھی۔ ساتھ میں اس نے جاب کی بھی بات کر لی۔

"تمہیں جاب کی کیا ضرورت ہے؟" عانیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"بس مصروف رہنے کے لئے جاب کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم آ ؤ گی تو پھر اس بارے میں بھی سوچیں گے۔" عانیہ نے حامی بھر لی۔ اس کی آدھی ٹینشن دور ہو چکی تھی۔

اسی شام وہ کچھ شاپنگ کی غرض سے ایف ٹین مارکیٹ چلی آئی تھی۔ کچھ ضروری اشیاء خریدنے کے بعد ایک مرتبہ پھر فیصل مسجد کو دیکھنے کے لئے چلی گئی۔

جدید دنیا کے سات عجائبات میں ایک فیصل مسجد کا نام بھی تھا۔ اس کی خوبصورتی اور طرزِ تعمیر سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ کافی دیر اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بعد وہ واپس آ گئی۔ رات کو دیر تک وہ آنٹی کے ساتھ باتیں کرتی رہی تھی۔

دوسرے دن آنٹی نے عانیہ کے لئے کچھ کپڑے اور دو تین قسم کے حلوے تیار کر کے اسے دیئے تھے۔ اسی شام وہ کراچی آ گئی تھیں۔ عانیہ ایئرپورٹ پر اسے لینے کے لئے آئی تھی۔ ٹیکسی کے ذریعے وہ ہاسٹل پہنچی تھیں۔ عانیہ نے اس کے لئے چائے پر کافی اہتمام کر رکھا تھا۔

"بڑی مشکل سے ایک گھنٹے کی چھٹی ملی تھی۔ بڑی مغرور باس ہے ہماری۔ رعب جھاڑنے اور اگلے بندے کی بے عزتی کرنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔" چائے پی کر عانیہ اسے اپنی بد دماغ باس کے متعلق بتانے لگی۔

"میری جاب کا کچھ بندوبست ہوا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"تم تو ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو شہری! کہ تم سے زیادہ مجبور اور ضرورت مند کوئی نہیں۔" عانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ شہرے سنجیدگی سے بولی۔

"تم مجھے بھی ضرورت مند ہی سمجھ لو۔"

"بابا! کر لیں گے کچھ۔ تم سانس تو لو........ ابھی تمہیں کراچی دکھاؤں گی۔ کچھ دن آرام کرو، پھر جاب کی تلاش شروع کریں گے۔" عانیہ نے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر کہا۔

"تلاش........ یعنی کہ ابھی تم نے میرے لئے نوکری تلاش کرنی ہے۔ پھر کر چکی میں اپنا ایڈونچر پورا۔" شہرے نے آنکھیں پھیلائیں اور دھپ سے بیڈ پر لیٹ گئی۔

"لو بھئی..... کمال کرتی ہو۔ اتنی آسانی سے تمہارے شایانِ شان جاب کا بندوبست کرنا کوئی معمولی بات ہے؟" عانیہ نے خفگی سے کہا۔

"میں نے ایک دو کولیگز سے کہہ رکھا ہے۔ اِن شاء اللہ جلد کام ہو جائے گا۔" عانیہ نے اسے تسلی دی۔

"اُف، عانیہ!........ میری ڈیمانڈ کوئی اتنی اعلیٰ نہیں ہے۔ بس نارمل سی کم سیلری پر جو بہت ہی آسانی سے فٹافٹ جاب مل جائے۔ بس اس کا انتظام کر دو۔" شہرے نے لجاجت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"کیا مطلب؟ کسی اسکول کی ماسی کی جاب کرنا چاہتی ہو؟" عانیہ نے صدمے سے نڈھال آواز میں کہا تھا۔ شہرے اپنی جلد بازی پر اظہارِ افسوس کرنے لگی۔

یونہی بہت سارے دن گزر گئے تھے، مگر شہرے کا مسئلہ ہنوز برقرار تھا۔ وہ سارا دن عانیہ کا انتظار کرتے کرتے بور ہونے لگی تھی۔ ناشتے کے بعد کمرے کی صفائی ستھرائی اور پھر اخبار چاٹنے بیٹھ جاتی۔ ایک دو جگہ انٹرویو دینے کا سوچا بھی تھا، مگر پھر ہمت ہی نہ ہوئی۔ وہ یہاں اس نئے شہر میں کسی کو جانتی تک نہیں تھی۔ راستوں کا اسے پتہ نہیں تھا اور پھر ایسے ہی تو بغیر گارنٹی کے منہ اٹھا کر وہ کہیں بھی انٹرویو دینے نہیں جا سکتی تھی۔ آج عانیہ کے آنے سے پہلے اس نے تقریباً دو گھنٹے ایما اور مریم سے فون پر بات کی تھی۔

"تمہیں کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی جاب کے لئے دھکے کھانے نکل پڑنا۔ آرام سے ہوم لینڈ میں عیش کرو۔ جو تمہارا نہیں، اس کے لئے اپنے قیمتی آنسو کیوں ضائع کر رہی ہو؟ تمہاری ایک پیاری سی بیٹی ہے، اس کی بہت اچھی تربیت کرو۔ تمہارے پاس جینے کا ایک بہترین جواز موجود ہے۔" وہ اسے پیار سے، نرمی سے سمجھا رہی تھی۔

"ہاں، میں اسے شہری کی طرح بناؤں گی۔ وہ بالکل پر تو لگے گی۔" مریم، عائشہ کو سینے سے لگا کر بولی۔

"ایما سے بات کروا دو۔"

"شکر ہے، میرا بھی خیال آیا ہے آپ کو۔" ایما نے مریم سے ریسیور جھپٹ کر طنزیہ انداز میں کہا۔

"ایما! میں نے اسے پھر سے دیکھ لیا ہے۔"

"سچ؟ صرف دیکھا ہے؟ بات نہیں کی؟........ کم از کم نام تو پوچھ لیتیں۔" ایما نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔

"چھری تلے دم لو، بتاتی ہوں۔" وہ سرگوشیانہ بولی تھی اور پھر دھیرے سے مزید کہنے لگی۔

"اس کا نام زارون ہے۔ اور میں نے اسے اسلام آباد میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ تھا۔ اگر اکیلا ہوتا تو ضرور بات کر لیتی۔"

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں عانیہ کے پاس کراچی میں ہوں۔"

"تم کراچی میں کیا کر رہی ہو؟ تمہیں اسلام آباد میں ہونا چاہیے تھا۔ اور پھر تم زارون تک کیسے پہنچ سکو گی؟" ایما کے لہجے میں پریشانی جھلک رہی تھی۔

"پہلے ممی کے ممی، پاپا کو تو ڈھونڈ لوں........ پتہ نہیں، میں ان سے مل پاؤں گی بھی کہ نہیں۔" اس کی آواز میں نمی سی چھلکنے لگی۔

"تم کیسے انہیں ڈھونڈو گی؟........ لاکھوں انسانوں کی اس بھیڑ میں اپنوں کو کھوجنا آسان تو نہیں۔" ایما اس کی رنجیدگی کو محسوس کر چکی تھی۔ کچھ دیر مزید بات کرنے کے بعد اور فیکٹری کے متعلق مسٹر پال کے لئے چند ایک ہدایات دے کر اس نے فون رکھ دیا تھا۔ اب وہ بالکل چت لیٹی، نم آنکھوں سے سوچ رہی تھی۔ اس کا ذہن کئی حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ وہ اس وقت خود کو بالکل تنہا سمجھ رہی تھی۔ اس بھری دنیا میں کوئی بھی خون کا رشتہ موجود نہیں تھا۔ اس کے ددھیال میں بھی کوئی دور نزدیک کا رشتہ دار نہیں تھا۔ پہلے وہ کچھ پُر امید تھی کہ شاید وہ اپنے نانا، نانی تک پہنچ جائے گی۔ مگر کراچی آ کر تو آس کا دامن چھوٹ گیا تھا۔ اتنا بڑا شہر اور وہ خود ہر راستے سے انجان۔ بھلا کیسے اپنے نانا، ماموؤں سے مل پائے گی؟

"تو کیا میرا سفر لاحاصل رہے گا؟" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی اور پھر اضطراب کے عالم میں اٹھ کر کھڑکی کھولے، باہر کے دوڑتے بھاگتے، سانس لیتے مناظر کو دیکھنے لگی۔

"کہاں گم ہیں شہرے حسنین صاحبہ!" عانیہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی اس کے

پیچھے آن کھڑی ہوئی تھی۔ شہری نے چونک کر رخ بدلا۔

"تم کب آئی ہو؟"

"ابھی، دو منٹ پہلے۔" وہ اپنا پرس میز پر پھینک کر صوفے پر ڈھے گئی تھی۔

"چائے لاؤں تمہارے لئے؟" شہرے نے نرمی سے پوچھا تھا۔ کس قدر تھکی سی لگ رہی تھی عانیہ۔

"نیکی اور وہ بھی پوچھ پوچھ۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔ شہرے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر اس نے کچن میں قدم رکھا اور پھر کسی کو موجود نہ پا کر جلدی جلدی چائے بنانے لگی تھی۔

یہ ایک پرائیویٹ ہاسٹل تھا۔ تین منزلہ کوٹھی پر مشتمل۔ ہاسٹل کا لان بھی کافی وسیع و عریض تھا۔

ہاسٹل کی مالک خاتون بیوہ تھیں۔ ایک بیٹی کو بیاہ کر اب ٹائم پاس کرنے اور تنہائی دور کرنے کے لئے انہوں نے اپنی وسیع و عریض کوٹھی کو ہاسٹل بنا دیا تھا۔

کھانا پکانے کے لئے ایک مائی آیا کرتی تھی، البتہ چائے وغیرہ سب کو خود بنانا پڑتی تھی۔ اس وقت شہرے سمیت بیس خواتین یہاں رہ رہی تھیں۔ چونکہ سب ہی ورکنگ لیڈیز تھیں، لہٰذا شہرے بھی اپنے لئے نوکری کی درخواست فرداً فرداً سب کے سامنے رکھ چکی تھی مگر نتیجہ ہنوز وہی تھا۔ اب تو شہرے کو یقین ہو چکا تھا کہ اس کے لئے کسی آفس کے چپڑاسی کی جاب بھی نہیں ہے۔ وہ فارغ رہ رہ کر اکتا چکی تھی۔ وہ تو بہت ایکٹیو لڑکی تھی، ہر وقت متحرک رہتی۔ اس نے کئی ملکوں کی سیر کی تھی۔ اس میں بلا کا کانفیڈنس تھا۔ وہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی بہترین اسٹوڈنٹ رہی تھی۔ اور اس وقت کسی معمولی جاب کے حصول کے لئے یوں ہر ایک کی منتیں کر رہی تھی۔

چائے کو دم دے کر اس نے ایک ٹرے میں دو مگ رکھے اور پھر کچھ دیر بعد ٹرے سمیت اوپر آ گئی۔

(......❀......)

"آج سنڈے ہے اور تم فارغ ہو۔ لہٰذا میرے ساتھ چلو، مجھے گاڑی خریدنا ہے۔" وہ کپڑے چینج کر کے اپنا مخصوص ہیئر اسٹائل یعنی اونچی سی پونی بنا رہی تھی۔

"گاڑی، مگر کیوں؟" عانیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"گاڑی کیوں خریدتے ہیں؟ سہولت کے لئے نا۔" مصروف انداز میں جواب دیا

گیا تھا۔ مگر عانیہ کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

"تمہیں کیا ضرورت ہے کار کی؟ خوامخواہ پیسے ضائع کرو گی۔"

"بابا! نو ایڈوائز...... اب کوئی سوال نہیں ہونا چاہیے۔ اور ویسے بھی اپنی گاڑی ہو گی تو کہیں بھی آنے جانے میں آسانی رہے گی۔ بلکہ میں تمہیں روزانہ آفس چھوڑنے جایا کروں گی۔ یعنی کہ میں بخوشی تمہاری ڈرائیور کی جاب قبول کر رہی ہوں۔ اس سے اچھی نوکری مجھے کہیں بھی نہیں ملے گی۔" اس نے شولڈر بیگ اٹھایا، زپ کھول کر کرنسی چیک کی تھی اور پھر مطمئن ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"ماشاء اللہ سے مجھے آفس ڈراپ کیا کریں گی اور واپسی پر "بنتِ حوا" تک آتے آتے راستہ بھول جانا...... تم تو ابھی تک سامنے والی مارکیٹ تک اکیلے نہیں جا سکتیں۔" عانیہ نے لطیف سا طنز کیا تھا۔

شہرے ڈھٹائی سے ہنس پڑی۔ کچھ کچھ شرمندگی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ مارکیٹ تک میں جا سکتی ہوں اور واپس آنے کے لئے کچھ مشکل نہیں۔ دو گلی چھوڑ کر رتن جوت کا درخت ہے، اس کی سائیڈوں پر گول دائرے کی شکل میں سفید گرل لگی ہے اور اس سے آگے "بنتِ حوا" کا سائن بورڈ...... لو، اب میں ہاسٹل پہنچ چکی ہوں۔" شہرے نے مزے سے کہا۔

"امی نے مجھے ایک سو بیس مرتبہ تاکید کی تھی کہ شہری کو تنہا کہیں بھی مت نکلنے دینا۔" اس کے اصرار پر عانیہ سینڈل نکال کر پہنتے ہوئے بول رہی تھی۔

"ابھی تو تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔" شہرے مسکرائی۔

پورا شوروم اوپر نیچے گھومنے کے بعد شہرے کو ایک بلیک کرولا پسند آ گئی۔

"تم مہران یا آلٹو لے لو۔ اتنی مہنگی گاڑی کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہائے نہیں۔ بالکل صابن دانی لگتی ہیں۔ اس ڈبیہ میں تو میرا سانس ہی گھٹ جائے گا۔" شہرے نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ عانیہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

ایک بینک سے اس نے کرنسی چینج کروائی تھی، پھر پے منٹ کے بعد وہ دونوں پزاہٹ آ گئیں۔

شہرے اپنے ہی دھیان میں عانیہ سے باتیں کرتے انٹرنس کے ان ڈور کو کھول رہی تھی جب "آؤٹ سائیڈ" کا گلاس ڈور کھلا اور زارون ایک ماڈرن اور بے حد حسین لڑکی کے ہمراہ باہر نکلا۔ وہ اپنی دھن میں مگن سیڑھیاں اتر کر پارکنگ کی طرف جا رہے

تھے جبکہ شہرے گم سم سی ساکت کھڑی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"شہری! کیا ہوا ہے؟ کیا تم انہیں جانتی ہو؟" عانیہ نے شہرے کی نظروں کے تعاقب میں دیکھ کر کچھ عجیب سے انداز میں پوچھا۔

آں..... ہاں....." وہ چونکی تھی اور پھر سرگوشی نما آواز میں بولی۔ "یہ زارون تھا۔

مگر اس کے ساتھ کون لڑکی ہے؟" وہ مسلسل ذہن پر زور دے رہی تھی۔ اس کی یادداشت چہرے محفوظ رکھنے کے بارے میں بہت اچھی تھی اور اسے یاد آ گیا تھا کہ اسی لڑکی کو اس نے اسلام آباد میں زارون کے ساتھ دیکھا تھا۔

'کہیں یہ لڑکی اس کی بیوی تو نہیں؟' اس سوچ نے شہرے کو پل بھر میں بالکل سرد کر دیا تھا۔

'اُف، اس پہلو پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا۔ اگر یہ زارون کی بیوی ہوئی تو پھر؟... میری یک طرفہ محبت لگتا ہے اپنے انجام کو پہنچنے والی ہے۔' ایک دم ہی کچھ دھند سی آنکھوں کے پار اُترنے لگی۔

'میں بھی کس قدر احمق ہوں۔' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

'مگر اس کی شکل اسفند ماموں سے بہت ملتی ہے۔ کیا پتہ یہ ان کا......' وہ مزید کچھ اندازے لگانے سے پہلے سر جھٹکنے لگی تھی۔ انہی خوش فہمیوں نے تو اسے نڈھال کر دیا تھا۔

'بہت سے انسانوں کے نقوش ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ سب ایک دوسرے کے کچھ نہ کچھ لگتے ہی ہوں۔ اور پھر ایک پچیس سال پرانی تصویر کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگانا ایک احمقانہ فعل ہے۔ مگر پھر بھی میرا دل کچھ اور ہی کہتا ہے اور چھٹی حس کے ہنٹس بھی کچھ غلط نہیں ہو سکتے۔'

شہرے سوچوں کے تانوں بانوں میں اُلجھی نہ جانے کہاں پہنچ گئی تھی جب عانیہ نے اسے کندھا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

"شہرے! کہاں کھو گئی ہو؟ ہم لوگ اس وقت پبلک پلیس میں کھڑے ہیں۔"

"تم نے زارون کو دیکھا ہے، عانیہ! یوں سمجھ لو، نانا، نانی سے ملنے کے علاوہ میری زندگی کی دوسری بڑی خواہش اس شخص کا حصول ہے جو کہ بالکل ناممکن لگتا ہے۔" وہ اب بھی سرگوشی میں بول رہی تھی۔

"لندن سے ملائیشیا اور صباح سے پاکستان، یہاں سے لے کر وہاں تک مجھے،

شہرے حسنین کو ایک اس چہرے کے علاوہ کوئی اور چہرہ دکھتا ہی نہیں۔ تمہیں میری باتیں دیوانوں کی سی لگیں گی مگر یہی سب سے بڑا ''سچ'' ہے کہ میرا دل زارون کی طرف خود بخود کھنچتا ہے۔ ایک مقناطیسی کشش ہے۔ یہ دل کے تقاضے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ مجھے خود پر کبھی کبھی بہت حیرانی ہوتی ہے کہ میں شہرے حسنین کس قسم کی احمقانہ محبت میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ اس محبت کی داستان کی دوسرے فریق کو خبر تک نہیں کہ کوئی لندن کی اس سلونی شام کے ''بار'' کو اٹھائے کئی چمکتی دمکتی دنیاؤں کو چھوڑ کر یہاں پہنچ چکا ہے۔ تم نے کبھی ایسی محبت کے بارے میں سنا ہے عانیہ!''

''شہری! تم زارون کو جانتی ہو؟........ تمہیں پتہ ہے یہ کون ہے؟ اور اس کے ہمراہ جو لڑکی ہے، اس کے بارے میں کیا کچھ معلوم ہے تمہیں؟'' عانیہ خود بھی اس کی باتیں سن کر حیران پریشان ہو چکی تھی۔

''مجھے صرف اس کے نام کا پتہ ہے اور میں نے زارون کو انسٹی ٹیوٹ آف لندن کے گرین گراؤنڈ میں صرف چند منٹوں کے لئے دیکھا تھا اور اس کے بعد........'' وہ عانیہ کو اپنے دل پر گزرنے والی ہر واردات بتاتی چلی گئی تھی۔ عانیہ نے اس کے خاموش ہونے کے بعد گہری سانس کھینچی اور بولی۔

''چلو شہرے! واپس چلتے ہیں۔''

شہرے اس کے پیچھے بہت خاموشی سے چل پڑی تھی۔ ہاسٹل آ کر بھی وہ اسی طرح گم سم بیٹھی رہی۔

''وہ لڑکی عدن فرجند تھی۔ میری باس۔ اس کے ساتھ زارون تھا۔ فرم کے مالک کا بیٹا۔ عدن، زارون کی چچا زاد ہے۔ وہ دونوں کزنز ہیں۔ کلاس فیلوز بھی تھے۔ اب فرم میں بھی ساتھ ساتھ ہیں۔'' عانیہ بہت دیر سوچنے کے بعد اسے زارون کے بارے میں بتا رہی تھی۔

❁

تین ماہ بعد وہ کچھ کچھ راستوں کے بارے میں بھی جان چکی تھی۔

اسی کالونی کے ایک چھوٹے سے اسکول میں وہ ایک ماہ کی جاب کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر ہاسٹل کے کمرے میں بیٹھی بوریت کا راگ الاپ رہی تھی۔

''میں ان دیواروں سے اور پلاسٹر آف پیرس کی چھت سے باتیں کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔ تمہیں میرا ذرہ بھر احساس نہیں۔''

''اسی بے مروّتی کا میڈل تم نے میرے گلے میں سجانا تھا۔'' عانیہ نے بہت ہی غمزدہ شکل بنا کر کہا تھا۔ شہرے کی ہنسی چھوٹ گئی۔ مگر عانیہ کافی سنجیدہ تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد عانیہ بولی۔

''شہری! حسنین انکل نے تمہیں کوئی ایڈریس نہیں دیا تھا؟''

''ہاں، میرے پاس نانا کے گھر کا ایڈریس ہے۔ مگر وہ تو پچیس سال پرانا ہے۔ کیا پتہ وہ لوگ اب اس جگہ کو چھوڑ چکے ہوں۔ پاپا کچھ ایسی ہی بات کر رہے تھے۔ یعنی وہ بھی کچھ پُرامید نہیں تھے۔'' شہرے نے اُداسی سے بتایا تو عانیہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''کمال ہے شہری! تم بہت ہی عقل مند ہو۔'' عانیہ نے طنزیہ کہا اور مزید بولی۔

''مجھے ذرا ایڈریس دکھاؤ۔ پھر چلتے ہیں تمہارے نانا کے گھر کو تلاش کرنے۔''

''ناممکن سی بات لگتی ہے۔'' اس نے بیگ کھول کر ایک ڈائری نکالی اور عانیہ کو تھما کر صوفے پر پاؤں لٹکائے بیٹھ گئی۔

''مایوسی کی باتیں تمہارے منہ پر سجتی نہیں۔'' عانیہ نے ایڈریس کے صفحے پر نگاہیں جمائیں اور پھر قدرے خوشی کے عالم میں بولی۔

''یہ ڈیفنس کا ایریا ہے۔ اور میں ایک مرتبہ پہلے بھی وہاں جا چکی ہوں۔ چلو اٹھو، ابھی چلتے ہیں۔'' عانیہ نے فٹافٹ برش بالوں میں کیا اور پھر شہرے کو پیچھے آنے کا کہہ کر چل پڑی۔

وہ دونوں رکشے سے ہی ڈیفنس تک آئی تھیں۔ پورا گھنٹہ پُرشکوہ اور شاندار کوٹھیوں کی طرزِ تعمیر کو سراہتے اور گیٹ کے باہر بیٹھے واچ مین اور بڑی مونچھوں والے ''خانوں'' کی گھوریوں سے بچ بچا کر وہ دونوں اب تھکے تھکے قدم اٹھاتی فٹ پاتھ پر چل رہی تھیں۔

ایک سو بیس مرتبہ وہ دونوں اسی لائن میں بنی بہت ہی بڑی پانچ جدید طرز کے بشر پر مشتمل محل نما کوٹھی کے سامنے سے گزری تھیں مگر نیم پلیٹ پر چمکتے نام کو دیکھ کر بی سے آگے بڑھ گئی تھیں۔ بختیار سکندر کا نام اس نیم پلیٹ پر نہیں تھا بلکہ ان کے سے چھوٹے پوتے ''زین'' کا نام لکھا تھا۔

اسی پل وائٹ شیراڈ ان کے قریب سے زن سے گزری تھی۔ انہوں نے اپنے میان میں توجہ نہیں دی تھی ورنہ ضرور ٹھٹکتیں کہ وائٹ شیراڈ ریورس ہو کر ایک مرتبہ پھر ت آہستہ روی سے ان کے پاس سے گزری تھی اور پھر دائیں طرف مڑ کر سیدھے رخ

پر چلی گئی تھی۔

"مجھے لگتا ہے، نانا لوگ کہیں اور شفٹ ہو گئے ہیں۔" شہرے نے تھکی تھکی آواز میں کہا تھا اور پھر مین روڈ سے رکشہ پکڑ کر ہاسٹل چلی آئیں۔

"تم بیٹھو، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" عانیہ پرس میز پر اچھال کر سلیپر اُڑستے ہوئے باہر نکل گئی۔

'کیا اس جستجو کا کچھ حاصل بھی ہوگا؟' اس نے آنکھیں دباتے ہوئے تھک کر سوچا اور پھر وقت گزاری کے لئے بک ریک میں سے ایک دو کتابیں نکال کر دیکھنے لگی۔

"چاند کا مسافر۔" اس نے ٹائٹل پر نگاہ جمائی اور پھر بغیر پڑھے ہی اسی طرح بک ریک میں سجادی۔

"چاند کا مسافر۔" اس نے زیرِ لب بڑبڑا کر کہا اور پھر آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ وہ بھی تو چاند کی تمنائی تھی۔ دُور دیس سے "چاند" کے حصول کی جستجو لئے ان جانے راستوں پر چل نکلی تھی۔ اس بات سے بے نیاز کہ ہر کوئی بلند بخت نہیں ہوتا کہ ہاتھ سے چاند کو چھو لے۔

اس نے ہتھیلی پر لاتعداد ستاروں کے اکلوتے چاند کو رکھنے کی خواہش میں کتنے ہی پل عبور کر لئے تھے۔ وہ بہاروں کی تلاش میں خزاں کے پھولوں کے خیابان میں آ پہنچی تھی۔ دسمبر کے چاند کو دیکھنے کی خواہش میں جون کے سورج کو ہتھیلی پر رکھ لیا تھا۔ اس نے ماتھے پر شبنمی صبح کے جھومر کو سجانا چاہا تھا اور کالی رات پھن پھیلائے، چنگھاڑتی ہوئی آ گئی۔ اس نے چندا کے رخسار کو ہاتھ سے چھونے کی کوشش میں سورج پر دستک دے ڈالی تھی۔ جلنا تو تھا ہی، پگھلنا تو تھا ہی۔ پھر یہ "آنسو" کیسے۔

❁

"ضروری تو نہیں، ہر موڑ پر وہ اتفاقاً ٹکرا جائے۔ مان لو، یار زارون! کہ کوئی "بھید" چھپا ہے، کوئی راز پوشیدہ ہے۔ مجھے تو یہ اُلفت اور محبت کی کہانی سے کچھ آگے کی بات لگ رہی ہے۔" مونس نے حیرانی سے آنکھیں پھیلا کر انہیں رکشہ میں بیٹھتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"میں خود بھی کچھ مشکوک سا ہو رہا ہوں۔ آخر "معاملہ" کیا ہے۔" زارون نے رکشہ کو آگے بڑھتے دیکھ کر گاڑی اسٹارٹ کر لی تھی۔

"وہ گھر تک آ پہنچی ہے۔" مونس پُرسوچ انداز میں بولا۔

"کیا ہمیں ان کا پیچھا نہیں کرنا چاہئے؟"

"رہنے دو یار!" زارون نے بے نیازی سے کہا۔

"ہوسکتا ہے وہ اتفاقاً یہاں ہمیں نظر آ گئی ہو۔ شاید کسی سے ملنے آئی ہو گی۔"

"میں ان "اتفاقات" کو تسلیم نہیں کرتا۔ میرے ساتھ تو ایسے حسین اتفاق نہیں ہوتے۔ بات کچھ اور ہے۔ تم ذرا اس کے پیچھے گاڑی لگاؤ۔"

مونس کے اصرار پر اس نے اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ ان دونوں کی نظریں مسلسل رکشہ کی بیک سائیڈ پر تھیں۔ تھوڑی دیر بعد رکشہ ایک کالونی کی صاف ستھری گلی میں مڑ گیا۔ ایک ہاسٹل کے گیٹ کے اندر وہ دونوں جا چکی تھیں۔

"اب کیا کرنا ہے؟" زارون نے پوچھا۔

"واپس چلو۔ میں اس ہاسٹل کے متعلق معلومات اکٹھی کرتا ہوں۔" مونس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو یار! خوامخواہ مشکوک ہو رہے ہو۔ ورکنگ لیڈیز لگتی ہیں۔ ہمیں اس پھڈے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔" زارون نے لاپروائی سے کہا تھا۔

مونس کو گھر ڈراپ کرنے کے بعد وہ آفس چلا گیا تھا۔

"السید انٹرپرائزز" اس کے ڈیڈی اسفند یار کی فرم تھی۔ یہ فرم بہت بڑی اور کئی حصوں پر مشتمل تھی۔ اس کے پاپا صرف بزنس کی فیلڈ میں تھے۔ باقی چاروں چچا عدن کے پاپا سمیت سب حکومتی اعلیٰ عہدوں پر فائز تھا۔ عدن کے پاپا فرجمند، جسٹس کے عہدے پر تھے۔ فریدون انکل سرجن تھے اور آرمی میں جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے دو بیٹے انس اور مونس تھے۔ فرید بیوروکریٹ تھے۔ ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں اور دونوں ہی اس کے بڑے بھائیوں ہارون اور فرزان کی بیویاں تھیں۔ پھر فرہاد چاچو تھے، جن کا اکلوتا بیٹا زین، اس کا یعنی زارون اسفند یار کا دیوانہ تھا۔

فرم کے چار بڑے حصوں کے سربراہ ہارون، فرزان، عدن اور ایک وہ خود تھا۔ عدن اسی کے آفس میں ہوتی تھی۔ البتہ دوسرے دونوں بھائی اس کے معاملات میں نہیں بولتے تھے۔

پاپا کی وراثت میں اسے دو فیکٹریاں حصے میں ملی تھیں۔ ان فیکٹریوں کی اچھی مصنوعات اس وقت برطانیہ، امریکہ، آسٹریا، منا کو اور ڈنمارک جیسے سب سے زیادہ قوتِ خرید رکھنے والے ممالک کو ایکسپورٹ کی جا رہی تھیں۔

اس کا بزنس اپنے بھائیوں سے الگ نہیں تھا مگر وہ اس کے کام سے بہت مطمئن تھے۔ یا پھر یوں کہنا مناسب ہوگا کہ وہ دونوں اسے ''چھیڑنے'' کی غلطی نہیں کرتے تھے کیونکہ اس کا غصہ پورے خاندان میں مشہور تھا اور اسے اپنے پرسنلز میں کسی کی انٹرفیئرنس پسند نہیں تھی، چاہے وہ ذاتی زندگی کا معاملہ ہو یا پھر بزنس کی ڈسکشن۔ وہ اپنے معاملات، مسائل خود سولو کرتا تھا۔ کسی کی ہیلپ قبول کرنا اس جیسے بندے کے بس کی بات نہیں تھی، نہ ہی وہ کسی کی رائے کو اہمیت دیتا تھا۔

اس نے اپنی تمام تر تعلیم امریکہ اور لندن سے حاصل کی تھی۔ مونس، انس اور عدن امریکہ میں بھی اس کے ساتھ تھے۔ ان کزنز پلس فرینڈز کی اس کی زندگی میں ایک خاص حیثیت اور مقام تھا۔

اس کے تمام تر اکھڑ پن کے باوجود اس کے دوست ابھی تک اس کے ساتھ تھے۔ بلکہ ان کی دوستی کو پورے سرکل اور خاندان بھر میں مثالی دوستی سمجھا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے کزنز بہت کھلے دل کے اعلیٰ ظرف قسم کے لوگ تھے۔ چھوٹی موٹی ''بے عزتیوں'' کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

ہارون اور فرزان دونوں شادی شدہ تھے اور اپنی لائف میں سیٹ بہت اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ مگر زارون کا ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے دونوں بھائیوں کی خواہش تھی کہ وہ بھی اب شادی کر لے اور اس ضمن میں عدن کی صورت ایک اچھی چوائس سامنے تھی۔ دونوں بھابیاں ماہا اور فائزہ بھی عدن کو دل سے دیورانی بنانے کی خواہش مند تھیں مگر زارون اس معاملے میں مکمل خاموش تھا۔

اس کے دادا بختیار سکندر نے ان کے بچپن میں ہی سب کے رشتے طے کر دیئے تھے۔ زارون اور عدن کا نام بھی ایک ساتھ سنا جا رہا تھا مگر اس کے متعلق زارون کی کیا مرضی یا خواہش تھی؟ تقریباً سب ہی جاننے کو بے قرار تھے۔ عدن کی ماما روشی آنٹی بھی کئی مرتبہ بہانے بہانے سے ان کی منگنی کا ذکر چھیڑ چکی تھیں مگر ہارون بھی اس معاملے میں اپنی بے بسی کا اظہار کر چکا تھا۔

''فرجمند انکل خود بات کر لیں زارون سے۔ اگر ہم دونوں میں سے کسی نے کچھ کہا تو اسے برا لگے گا۔ آپ خود بھی اس کے مزاج سے واقف ہیں۔'' ہارون نے صاف جواب دے دیا تھا۔

آج سے پہلے زارون کی زندگی بہت پُرسکون گزر رہی تھی مگر پچھلے چند روز سے کچھ

عجیب وغریب واقعات نے اسے ''چونکا'' دیا تھا۔ ایک اجنبی لڑکی کا پی سی کے ہال میں اسے یوں دیوانوں کی طرح تکنا اس جیسے بندے کو بھی ڈسٹرب کر چکا تھا۔ اس کے دل کی کیفیات کچھ مختلف سی تھیں۔ آج سے پہلے زارون نے ایسا کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ خود بھی اپنی فیلنگز سمجھنے سے قاصر تھا۔ کبھی کسی لڑکی کی وجہ سے اس کی نیند آج تک ڈسٹرب نہیں ہوئی تھی۔ مگر اب چند دنوں سے وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں پایا تھا۔ ایک دن مونس نے اس کی چوری پکڑ لی تھی اور وہ خود بھی اپنی بدلی بدلی دل کی کیفیت کا حال سنانے لگا۔

عجیب کتابی سا چہرہ تھا اور کسی ہوش مند انسان کو پاگل کر دینے والی آنکھیں تھیں۔ کتنی محبت، کس قدر دیوانگی سی چھلک رہی تھی ان آنکھوں میں۔ کیا وہ سحر طراز آنکھیں نظر انداز کی جانے والی تھیں؟ یا ان میں جھانکتی انوکھی سی محبت کی چمک کو بھلایا جا سکتا ہے؟

❁

آج اس کی زندگی کا یہ پہلا انٹرویو تھا اور اسے جاب مل جانے کی کافی امید تھی۔ تین دن پہلے اخبار میں ''السید انٹرپرائزز'' کی طرف سے ایک اشتہار دیا گیا تھا۔ یہ اشتہار چونکہ عانیہ کی فرم کی طرف سے تھا، اسی لئے وہ بے حد ایکسائیٹڈ ہو چکی تھی۔ مگر عانیہ نے خوب مخالفت کی۔

''کوئی ضرورت نہیں سیکرٹری کی جاب کرنے کی۔ تمہاری کوالیفکیشن کے حساب سے بہترین جاب بھی مل سکتی ہے۔ تھوڑا اور انتظار کر لو، جوں ہی کوئی اچھی، پُرکشش جاب کے لئے اشتہار دیا گیا تو پہلے تمہارا ہی نام دوں گی۔ آخر چار سالوں سے ایڈورٹائزمنٹ کے شعبے سے منسلک ہوں۔ کمپنی کے کسی بھی حصے کے لئے ملازمین، سیکرٹریز چاہئے ہوں تو ایڈ اور تمام تر کوائف میں ہی کمپوز کرتی ہوں۔ ابھی دو ماہ تک نئے منیجر کی ضرورت ہے کمپنی کو۔ نیوز پیپرز میں پھر سے ایڈ دیا جائے گا۔ میں تمہارے لئے بات کروں گی۔ تم اس سیکرٹری کی جاب کا خیال دل سے نکال دو۔ بڑی ''بدنام'' سی سیٹ ہے۔''

''اگر مجھے زارون کی فرم میں ریسیپشن کی جاب کی آفر بھی ہوتی تو میں بخوشی قبول کر لیتی۔ اور پھر دیکھو نا، فرم بھی اچھی، بہترین ساکھ رکھتی ہے اور مراعات بھی تو کافی ساری دی جا رہی ہیں۔'' وہ عانیہ کو کول ڈاؤن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

عانیہ نے جل کر کہا۔

''مراعات دینا ان کی مجبوری ہے۔ کیونکہ یہ جاب اور اس کا شیڈول بہت ٹف ہے۔ اکثر ورکنگ آورز کے بعد بھی آفس میں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کوئی ڈیلی گیشن باہر سے آیا ہو یا پھر کسی غیر پارٹی کے ساتھ ڈیلنگ چل رہی ہو۔ اکثر لیٹ نائٹ بزنس میٹنگ کے بعد ڈنر وغیرہ کے چکر میں آدھی رات ہو جاتی ہے۔ دوسری کمپنیوں کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی غرض سے عشائیے دیئے جاتے ہیں، جن میں سیکرٹریز کا جانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ایسے ہی تو وہ لوگ اتنی مراعات نہیں دیتے۔''

''یار! میں کرلوں گی۔ تم بس تھوڑی سی سفارش کر دینا۔'' شہرے نے لجاجت سے کہا تو عانیہ نے منہ بنالیا۔

''ہرگز نہیں۔ بالکل بھی سفارش نہیں کروں گی۔'' اب وہ جان بوجھ کر اسے تپا رہی تھی۔

''پتہ چلے گا اس وقت، جب زارون صاحب نے شاندار سی ''بے عزتی'' کا میڈل پہنایا۔ بڑا ناک چڑھا آدمی ہے۔ حد درجہ اکھڑ اور غصیلا۔ کام کے معاملے میں ذرا لحاظ نہیں کرتا۔ مجال ہے جو دس منٹ بھی لیٹ ہونے کی غلطی سرزد ہو جائے۔ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلتا ہے۔ ویسے اس کا حسیناؤں کے معاملے میں ''ریکارڈ'' صاف ہے۔ ابھی تک کوئی اسکینڈل منظر عام پر نہیں آیا۔ اس کی پہلی سیکرٹری نے خاصی کوششیں کی تھیں لبھانے کی، زلفوں کے جال میں پھنسانے کی مگر بے چاری کی ساری ''محنت'' بے کار گئی۔ جناب کا مزاج ساتویں آسمان پر رہتا ہے۔ بڑی اونچی ''ناک'' والا بندہ ہے۔ معیار سے ایک انچ نیچے نہیں آتا۔''

''ان ''خوبیوں'' نے تو مجھے اور بھی گھائل کر دیا ہے یار!'' شہرے نے ہنسی دبائی اور مزید بولی۔ ''ویسے ایک کوشش میں ضرور کروں گی۔ کیا پتہ، میرا اسلیکشن ہو جائے۔''

عانیہ نے اثبات میں سر ہلا کر گویا اجازت دے دی تھی جس کے نتیجے میں آج وہ اس شاندار سے وزیٹرز روم میں بیٹھی تمام امیدوار لڑکیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک فیشن ایبل، طرح دار لڑکی تھی۔ یقیناً کافی کوالیفائیڈ بھی تھیں۔ ایڈ میں دی جانے والی مراعات کافی پُرکشش تھیں، جس کی وجہ سے وزیٹرز روم میں رنگ و بو کا سیلاب اتر آیا تھا۔ کونے میں موجود ایک گرے صوفے پر بیٹھی وہ ایک ایک چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

آخر کار اس کی باری بھی آ ہی گئی تھی۔ وہ فائل سنبھالتی، دھڑکتے دل کے ساتھ ایک شاندار وسیع وعریض آفس کا ڈور کھول کر اندر داخل ہوئی۔

جوں ہی اس کی نظر زارون پر پڑی، اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ وہ جو سوچ رہی تھی کہ پتہ نہیں، انٹرویو پینل میں زارون ہوگا بھی یا نہیں۔ مگر اب بڑی سی گلاس ٹیبل کے پیچھے چیئرز پر بیٹھے چار آدمیوں میں سے ایک پر زارون کو بیٹھا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔ وہ صرف کمرے میں موجود تھا۔ انٹرویو لینے والے افراد یا امیدواروں کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ دائیں طرف ترتیب سے رکھے کمپیوٹرز میں سے ایک پر وہ کام کرنے میں مصروف تھا۔

''تشریف رکھیے۔'' ادھیڑ عمر فاروقی صاحب نے بغور اس کا جائزہ لے کر کرسی کی طرف اشاہ کیا تھا۔

شہرے جو ایک ٹک زارون کو دیکھ رہی تھی، گڑبڑا کر جلدی سے بیٹھ گئی۔

''پلیز، فائل دکھائیں۔''

شہرے نے قدرے اعتماد کے ساتھ فائل سامنے موجود ذرا کم عمر آدمی کی طرف بڑھا دی۔

''آپ کا نام؟'' انٹرویو کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور پہلے سوال کے جواب پر ہی اس نے سامنے موجود افراد کو ''چونکا'' دیا تھا۔ اپنے خیال میں شہرے نے کوئی انوکھی بات نہیں کی تھی مگر انہیں حد درجہ حیران ہوتے دیکھ کر وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی۔ دوسری مرتبہ جب انہی صاحب نے اس کا نام دوبارہ پوچھا تو اس نے بڑے سادہ سے انداز میں کہا۔

''فائل میں لکھا ہے۔ دیکھ لیں پلیز۔''

زارون بھی ایک دم چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ بھی شاید کسی ایسے جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ مگر اس کے ''چونکنے'' کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر فاروقی صاحب کے سامنے رکھی فائل اٹھا کر اپنی طرف کھسکالی۔

'تو تم اب یہاں بھی پہنچ گئی ہو۔' زارون نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور پھر بہت سنجیدگی سے بولا۔

''اپنا نام بتائیے۔'' اس کے انداز اور لہجے میں موجود سختی محسوس کر کے شہرے آہستگی سے بولی۔

''شہرے حسنین احمد ...... لوگ مجھے ''شہری'' کے نام سے زیادہ جانتے ہیں۔'' اس

کے سادہ لہجے میں بہت معصومیت تھی۔ بہت ہی شستہ اور رواں انگلش میں جواب دیا گیا۔سوائے زارون کے تینوں افراد کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''کون سی شہری؟'' فاروق صاحب کی بجائے ایک دوسرے ذرا کم عمر کے آدمی نے دلچسپی سے پوچھا۔

''صباح کی شہری......اپنے پاپا کی......'' اس نے ایک دم ہی زبان ہونٹوں تلے دبا لی اور خود کو دل ہی دل میں ڈپٹا۔

'میں کیا اول فول بکنے لگی ہوں۔'

اس کی گھبراہٹ سامنے موجود زارون کو باآسانی نظر آ رہی تھی۔

''آپ یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہیں؟'' کافی دیر سوچنے کے بعد زارون نے بہت چبھتے لہجے میں پوچھا تھا۔یعنی وہ اسے مشکوک سمجھ رہا تھا، جو کہ اسلام آباد سے اس کا پیچھا کرتی یہاں آ گئی تھی۔

''میں بہت ضرورت مند ہوں۔'' شہرے نے عانیہ کا خوب رٹایا ہوا جملہ بول دیا تھا۔مقابل طنزیہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔

''آپ کی اسکولنگ نیشنل گرامر اسکول سے ہوئی ہے...... یہ اسکول ملائیشیا کے بہترین اسکولز میں شمار ہوتا ہے۔آپ نے اے لیول لندن سے کیا ہے۔اس کے بعد بی بی اے اور ایم بی اے بھی انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن لندن سے کیا ہے۔ بہت خوب، اکیڈمک ریکارڈ شاندار ہے آپ کا......ان سرٹیفکیٹس میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ہی آپ کو بتا رہا ہوں۔آپ اتنا حیران کیوں ہو رہی ہیں؟ کیا یہ آپ کے سرٹیفکیٹس نہیں ہیں؟''

''یس سر! یہ میری اسناد ہیں۔'' اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''پھر آپ ضرورت مند کہاں سے ہوئیں؟ کیا ایک عام انسان اتنی مہنگی تعلیم افورڈ کر سکتا ہے؟'' زارون نے کچھ سخت انداز میں کہا تھا۔

وہ کافی دیر مناسب الفاظ سوچتی رہی۔اب اسے پورا یقین ہو چکا تھا کہ یہ جاب کم از کم اسے نہیں مل سکتی۔مقابل بیٹھا شخص بال کی کھال اتارنے کے فن سے آشنا تھا۔وہ اپنی زیرک نگاہوں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔شہرے کچھ مضبوط اور بااعتماد انداز میں بولی۔

''آپ کیسے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ میں ضرورت مند نہیں ہوں۔انسان کے

حالات بدلتے ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔دو پل میں بہت کچھ بدل سکتا ہے۔کیا پتہ، آج جس سیٹ پر آپ بیٹھے ہیں، کل میں یہاں بیٹھی ہوں۔'' اس کے لہجے کے اعتماد اور ذہانت نے سامنے بیٹھے افراد کو کافی متاثر کیا تھا۔وہ یقیناً اس جواب کی بھی توقع نہیں کر رہے تھے۔زارون اس کی بے ساختگی اور حاضر جوابی کا قائل ہو گیا تھا۔

''یہاں جاب قابلیت کی بنا پر دی جاتی ہے، ضرورت کے تحت نہیں۔''

''آپ کو میری قابلیت پر کوئی شبہ ہے، جبکہ میرے تمام سرٹیفکیٹس آپ کے سامنے ہیں؟'' اب وہ بہت سنجیدگی اور فل کانفیڈنس کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''آپ فارن کوالیفائیڈ ہیں۔اس سے بہتر جاب بھی آپ کو مل سکتی ہے۔'' یہ سوال دائیں طرف بیٹھے تیسرے خاموش آدمی نے کیا تھا۔

''بغیر سفارش کے تو نہیں مل سکتی۔اور بدقسمتی سے میرے پاس کوئی سفارش نہیں ہے۔'' شہرے نے بے حد روکھے انداز میں کہا۔

''آپ کو پتہ ہے، سیکرٹری کی جاب بہت ٹف ہے؟''

''میں جانتی ہوں۔'' یہ آخری جواب تھا۔اس کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔وہ زارون کے ناقابلِ فہم تاثرات کو دیکھتے ہوئے باہر آ گئی۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ شہرے حسنین اس کا پیچھا کرتی آفس تک آ جائے گی۔ وہ پہلی نظر میں ہی اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ اگرچہ سیکرٹری کا انتخاب اسی کے آفس کے لئے ہو رہا تھا، مگر وہ انٹرویو پینل کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ لیپ ٹاپ پر وینوآٹو کے دارالحکومت ویلا کے ایک بڑے سرمایہ دار سے چیٹ میں مصروف تھا۔ اس نے بہت کم عرصے میں دوسری دنیا میں ایک اچھی مارکیٹ بنا لی تھی۔ اسی کے تعلقات کی بدولت اس کے دونوں بھائی بہت پرافٹ ایبل بزنس کر رہے تھے۔

شہرے کو اپائنٹ کر لیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ فیصلہ فاروقی صاحب کا تھا، مگر زارون نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ خود چاہتا تھا کہ شہرے اس کے آفس میں کام کرے تا کہ اسے قریب سے جاننے کا موقع مل سکے۔ ابھی تک تو کوئی قابلِ اعتراض بات اس کی گرفت میں نہیں آ سکی تھی اور زارون یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ شہرے قطعاً بے ضرر ہے۔ وہ ایک محنتی اور ذہین لڑکی تھی۔ ٹائم پر آفس پہنچتی تھی۔ اس نے بہت جلد آفس میں پرومینینٹ مقام بنا لیا تھا۔ دراصل وہ زارون کو اعتراض کرنے کا موقع فراہم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس دن وہ معمول سے صرف تین منٹ لیٹ ہو گئی تھی۔ وجہ عانیہ کے آفس میں ہمیشہ کی طرح تانک جھانک تھی جس کی وجہ سے اس کی فوراً ہی طلبی ہو گئی۔ وہ کچھ ڈرتے ڈرتے زارون کے آفس میں داخل ہوئی۔

'صرف دو تین منٹ دیر ہو جانے پر خوامخواہ بے عزتی ہو گی۔ اتنا ٹائم تو لفٹ سے آنے جانے میں بھی لگ جاتا ہے۔' اس نے جل بھن کر سوچا تھا اور آہستگی سے بولی۔

"لیس سر!........ آپ نے یاد فرمایا ہے؟"

زارون نے سامنے رکھی فائل بند کی تھی اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شہرے کو

لمحے کے ہزارویں حصے میں محسوس ہو گیا تھا کہ وہ ایک مرتبہ پھر اردو بولنے کے شوق میں کچھ غلط بول گئی ہے۔"

"تشریف رکھئے۔" اس نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا تو شہرے جھٹ سے بیٹھ گئی۔ دراصل اسے "بے عزتی" کا خوف دہلا رہا تھا۔ عانیہ نے کچھ اس کے غصے کا ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ وہ اچھا خاصا گھبرانے لگی تھی۔

"مس شہرے حسنین! آپ آفس میں اچھی طرح سیٹ ہو گئی ہیں؟ کوئی پرابلم تو نہیں؟" مقابل کے لہجے میں شائستگی نمایاں تھی۔ غصے کا نام ونشان نہیں تھا۔ اسی لئے شہرے ایک دم ریلیکس سی ہو گئی۔

"نو سر!"

"آپ پہلے کچھ پریشان تھیں، اب ریلیکس نظر آ رہی ہیں، وجہ؟" سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ شہرے گڑبڑا سی گئی۔

"نو سر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے بوکھلا کر وضاحت دی تھی پھر دل ہی دل میں بولی۔

'کتنے چالاک ہیں سر! آپ۔'

"آل رائٹ۔ مان لیتا ہوں آپ کی بات۔ حالانکہ چہرے پڑھنا مشکل نہیں۔ اور آپ کا چہرہ تو کھلی کتاب کے مانند ہے۔" باقی کے الفاظ منہ ہی منہ میں بدبدائے گئے تھے۔ آواز اتنی کم تھی کہ شہرے چاہنے کے باوجود کچھ سن نہیں پائی تھ مگر اتنا ضرور جان گئی تھی کہ اس کے بارے میں کمنٹس دیئے گئے ہیں۔

"کچھ قوانین، اصول اور قواعد کی بات ہو جائے۔ آفس کا ماحول تو آپ دیکھ چکی ہیں۔ بددیانتی، کام چوری اور بے ایمانی مجھے سخت ناپسند ہے۔ کچھ باتیں آپ کو مس عانیہ نے بھی بتا دی ہوں گی۔ آپ کی اچھی پرفارمنس (کارکردگی) دیکھ کر کسی اچھی پوسٹ پر پروموٹ کر دیا جائے گا۔ آپ سی وی لائیزڈ اور آنرڈ فیملی کا حصہ لگتی ہیں۔ یقیناً کوئی مجبوری ہی آپ کو اس سیٹ تک کھینچ لائی ہے۔ بہرحال، اس وقت میں نے آپ کو اس لئے زحمت دی ہے تا کہ آپ کی کنوینس کے بارے میں بات کر لی جائے۔ جیسا کہ آفس میں اکثر دیر سویر ہو جاتی ہے، اس لئے آفس وین آپ کو پک اینڈ ڈراپ کرے گی۔ کسی بھی پرابلم کی صورت میں آپ کو ہاسٹل پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ اسی سلسلے میں فاروقی صاحب سے میں نے بات کی تھی، مگر ان کے جواب نے مجھے ڈبل مائنڈڈ

کر دیا ہے۔ آپ کی ذاتی کنوینس ہے۔ اٹھارہ لاکھ کی کرولا کو افورڈ کر سکتی ہیں آپ، پھر اس معمولی جاب کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'' اس کا لہجہ گہرا کاٹ دار اور بے حد طنزیہ تھا۔ شہرے کو دانتوں پسینہ آ گیا۔ ایسی کسی سچویشن کے بارے میں اس نے سوچا ہی کہاں تھا ورنہ کوئی مناسب جواب ڈھونڈ رکھتی۔

''جھوٹ سے مجھے نفرت ہے۔ کسی بھی شعبے میں آپ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک آپ کے اندر سچائی کے جراثیم موجود نہیں ہوں گے۔ آپ ذمہ دار اور ذہین ہیں، میں تسلیم کرتا ہوں۔ آپ محنتی ہیں، یہ چیز بھی نظر آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نہایت جھوٹی بھی ہیں۔ آپ نے خود کو ضرورت مند کہا تھ۔ یہ غلط بیانی مجھے سخت ناگوار گزری ہے۔ آپ پر آئندہ کام کے حوالے سے کتنا ٹرسٹ کیا جا سکتا ہے؟''

زارون کے زہر میں بجھے سخت الفاظ ایک دم ہی اسے غصہ دلا گئے تھے۔ حالانکہ اسے بہت کم غصہ آیا کرتا تھا۔

''سر! یہ جاب مجھے ضرورت کے تحت نہیں، میری کوالیفیکیشن دیکھ کر دی گئی ہے۔ ایڈ میں صرف گریجویٹ کی ڈیمانڈ تھی، جبکہ میں نے فریش ایم بی اے اعزازی نمبروں کے ساتھ کیا ہے۔ میں فارن کوالیفائیڈ ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی اور امیدوار ایسی ڈگریز کے ساتھ انٹرویو دے رہی ہوتی تو یقیناً اس کا سلیکشن بھی ہو جاتا۔ جہاں تک بات گاڑی کی ہے تو یہ میرا پرسنل میٹر ہے۔ میں نے کیوں لی؟ کہاں سے لی؟ اور کس طرح لی؟ میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔ ہاں اگر آپ میرے کام کے حوالے سے ذرہ بھر غلطی دیکھیں تو سرزنش کرنے کا پورا پورا اختیار رکھتے ہیں۔''

''آل رائٹ۔ میں آپ کے دلائل تسلیم کر لیتا ہوں۔ مگر کچھ اور باتیں بھی مجھے مشکوک کر چکی ہی۔ کسی اور وقت ان پر تفصیلاً بات ہو گی۔ ابھی مجھے ایک میٹنگ اٹینڈ کرنے جانا ہے۔ آپ پلیز چل کے گاڑی میں بیٹھیئے۔'' وہ اسے ہدایات دے کر انٹر کام پر مصروف ہو چکا تھا۔

شہرے جلتی بھنتی باہر آ گئی۔ عانیہ کے آفس میں چند منٹ رک کر بڑی بے زاری کے عالم میں اسے بتایا۔

''خواجہ انڈسٹریز والوں کے بزنس سیمینار میں شرکت کرنے جا رہی ہوں۔ پتہ نہیں یہ لوگ آئے دن اجلاس اور تقریروں سے بور کیوں نہیں ہوتے۔''

''کہا تھا نا، یہ جاب تمہارے بس کی بات نہیں۔ باز آ جاؤ، ایسے گھٹیا ایڈونچرز سے۔

مگر تم پر تو سیکرٹری بننے کا بھوت سوار تھا۔ اب بھگتو۔'' عانیہ کو تو اس کی ''خبر'' لینے کا موقع ملنا چاہئے تھا۔

'آج پھر میں عانیہ کو لے کر نانا کے گھر کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی۔ کچھ اور ملے یا نہ ملے، مگر اپنی ''ماں'' کی تربت کو تو دیکھ لوں گی۔ پاپا وہیں دفن ہیں اور ماما یہاں۔ میرا وجود کئی حصوں میں بٹا ہے۔ میں اپنی ''ماں'' کی قبر کو دیکھنے جاؤں گی۔ اپنی ماں سے ملوں گی، انہیں یہ بتاؤں گی کہ میرا وجود آپ کی محبت کے بغیر ادھورا اور نامکمل تھا ممی! اگر پاپا نہ ہوتے تو آپ کی شہری ''صباح'' کی سڑکوں پر رُل جاتی، دھول مٹی ہو جاتی، کھو جاتی۔ رشتے سہارا ہوتے ہیں، ڈھارس ہوتے ہیں۔ سائبان کی طرح ہوتے ہیں۔ کڑی دھوپ میں چھایا ہوتے ہیں۔ عاطف انکل نے پاپا کو تنہا اور بیمار جان کر ہر زک پہنچانا چاہی تھی۔ اگر میرے بھی چچا یا ماموں، نانا یا دادا ہوتے تو میری بیک بھی بہت مضبوط ہوتی۔ مجھے کوئی خوف رات بھر جگائے نہ رکھتا۔

پاپا اسی لئے چاہتے تھے ممی! کہ میں آپ کے خاندان والوں کے پاس پہنچ جاؤں۔ پاپا کو بھی یہی خوف تھا کہ کوئی اور عاطف اور نفیسہ مجھے تنہا دیکھ کر تکلیف نہ دیں۔ وہ مجھے ہر اذیت اور غم سے بچانا چاہتے تھے۔ وہ مجھے رشتوں کا تحفظ دینا چاہتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے مجھے آپ کے پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ میری ماں کا دلیس ہے۔ یہ آپ کا وطن ہے ممی! مجھے اس کی فضاؤں سے، ہواؤں سے، آتے جاتے موسموں سے، بہاروں اور خزاؤں سے، دھوپ اور چھاؤں سے بھی محبت ہے۔ ممی! آپ کو کیا پتہ کہ کالی، بھیانک راتوں میں پاپا کی موجودگی کے باوجود مجھے آپ کی ''یاد'' اور لمس کی خوشبو بہت رُلاتی تھی۔'

وہ بہت درد کے عالم میں تھکے تھکے قدم اٹھاتی پارکنگ تک آ گئی۔ قطار میں کھڑی گاڑیوں میں وائٹ شیراڈ کو ڈھونڈنا مشکل نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بلیک کرولا کھڑی تھی۔ وہ بیس منٹ سے وہاں کھڑی اب تھکنے لگی تھی، اسی لئے گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر زارون کا انتظار کرنے لگی۔

پندرہ منٹ بعد وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا تھا۔ اس کے ساتھ عدن بھی تھی۔ نہ جانے کیوں شہرے کی پیشانی پر ایک ناگوار سی سلوٹ جھلک دکھانے لگی۔

''اوہو، تو یہ نئی سیکرٹری ہے تمہاری۔'' عدن کا انداز بہت دل جلانے والا تھا۔ ہونٹ سکیڑ کر اس نے اس کا سر تا پا جائزہ لیا تھا۔ شہرے کو وہ سخت بری لگ رہی تھی۔ اس

پورے آفس میں عدن کے ترش مزاج کی دھوم تھی، جس پر یقیناً اسے بہت فخر تھا۔ عدن فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ رہی تھی۔ زارون ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے سے پہلے اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے بولا۔

''آیئے مس! پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔''

''بیٹھ بھی چکو۔'' اسے اپنی جگہ پر جما دیکھ کر عدن نے استہزائیہ کہا تھا۔ دوسرے معنوں میں کہہ رہی تھی گویا کہ اپنی ''اوقات'' کے حساب سے پیچھے بیٹھو۔ بہت ہی مغرور اور خود پسند، زارون کی یہ کزن شہرے کو پہلے دن ہی پسند نہیں آئی تھی۔ یہ ان کی تقریباً پانچویں سرسری ملاقات تھی، جس میں ہمیشہ کی طرح عدن چوٹ کرنے سے باز نہیں آئی تھی۔ اسے طنزیہ مسکراتا دیکھ کر شہرے نے تحمل سے کہا۔

''میں اپنی گاڑی میں آپ کو فالو کرتی آ جاؤں گی سر!'' بڑی شاہانہ تمکنت کے ساتھ جواب دے کر وہ اپنی بلیک کرولا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ عدن کے چہرے کے یک لخت بدلنے والے تاثرات اسے مزا دے گئے تھے۔

❁

''یہ زارون کی نئی سیکرٹری ہے۔'' مونس کے پوچھنے پر عدن نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں دور کھڑی شہرے کو دیکھ کر بتایا۔

'مجھے تو پہلے ہی معاملہ گڑبڑ لگتا تھا، اب تو پکا یقین ہو گیا ہے۔ کون سی چیز تمہیں مقناطیس کی طرح کھینچ کر یہاں لائی ہے، اس کا جواب تو میں شروع میں ہی جان چکا تھا، یہ برقی مقناطیسی ''شعاع'' لگتی ہے۔ عشق بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر اسے کسی سیسے یا کنکریٹ کی موٹی دیوار سے روکا نہیں جا سکتا۔ اسے محبت کہتے ہیں...... بے تحاشا، بے حساب محبت۔'

''کہاں گم ہو چکے ہو؟'' عدن نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر حیرانی سے کہا۔

''اس میں کتنی تمکنت اور وقار نظر آتا ہے۔'' مونس اسے سراہ رہا تھا۔ عدن نے ناگواری سے مونس کی طرف دیکھا۔

''ان مڈل کلاس لڑکیوں کے پاس یہی تو ہتھیار ہوتے ہیں، مردوں کو رجھانے کے لئے۔ وہ یوں ہی بے نیازی پوز کرتی ہیں۔''

''نہیں، یہ شہرے حسنین وہ نہیں، جو نظر آتی ہے۔'' مونس اب زارون کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو گیا تھا۔

ڈنر کے فوراً بعد شہرے نے زارون سے اجازت لینی چاہی تھی۔ اس نے مونس سے کہا تھا کہ وہ شہرے کو ہاسٹل چھوڑ آئے۔ مونس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ شہرے اپنی گاڑی میں اسے فالو کرتی ''بنتِ حوا'' پہنچ چکی تھی۔ مونس گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اسی پل ''بنتِ حوا'' کا گیٹ کھلا اور عانیہ تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھی۔

''منع کیا تھا میں نے اس منحوس سیکرٹری کی جاب سے۔ رات کے نو بج رہے ہیں۔ میری روح تک کانپ رہی تھی۔ شہری! تم کراچی میں ہی نہیں، اس ملک میں بھی نئی ہو۔ راستوں کا تمہیں پتہ نہیں۔ حالات اتنے خراب ہیں مگر تمہیں ایڈونچر کی پڑی ہے۔ بس کل سے تم ریزائن کر دو۔ تمہیں بھلا جاب کی ضرورت ہی کیا ہے؟ زارون اگر تمہارا......'' تیز تیز بولتے ہوئے وہ مونس کو دیکھ کر ایک دم لب بھینچ کر خاموش ہو گئی تھی اور شہرے بھی قدرے خجل سی ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''میں نے آپ کو بحفاظت پہنچا دیا ہے۔ اب اجازت دیں۔'' مونس بہت گہری نظروں سے اس دیکھتا واپس پلٹ گیا تھا۔ وہ اپنے پورشن کی طرف جانے کے بجائے سیدھا زارون کی طرف آ گیا۔ لاؤنج میں فائزہ بھابی بیٹھی تھیں۔ مونس انہیں دیکھ کر مروتاً کچھ دیر کے لئے کھڑا ہو کر حال احوال پوچھنے لگا۔

''مونس! ذرا میرے پاس بیٹھو، میں نے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''کون سی بات؟'' مونس ٹھٹک گیا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ بات زارون کے متعلق ہے۔

''ایکچولی، آج فرجمند انکل آئے ہوئے تھے۔ وہ عدن اور زارون کے رشتے کی بات کر رہے تھے۔ نہ جانے زارون کیوں مزید ڈِلے کر رہا ہے۔ اب تو فارن کے آفس کو بھی اسٹیبلش کر چکا ہے وہ۔ مزید اس معاملے کو لٹکانا بہتر نہیں۔ نہ جانے زارون کے دل میں کیا ہے۔'' فائزہ پریشانی کے عالم میں زارون کے بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھ کر کہہ رہی تھیں۔

'اس کے دل میں کم از کم عدن نہیں ہے۔' مونس نے سوچا تھا اور پھر فائزہ کو تسلی دے کر زارون کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ زارون کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا، اسے دیکھ کر بے ساختہ بولا۔

''شہرے کو ڈراپ کر آئے ہو؟''

''یس سر!'' وہ کشن پر سر رکھ کر کارپٹ پر نیم دراز ہو گیا اور پھر سہولت سے اس کے

چہرے کا تفصیلی معائنہ کر کے بولا۔

''فائزہ بھابی تمہاری اور عدن کے رشتے کی بات کر رہی تھیں۔ انکل بھی شاید آج اسی سلسلے میں آئے تھے۔''

''انہیں کس نے تھارٹی دی ہے کہ وہ میرے ذاتی معاملات میں بولیں؟'' اس نے کمپیوٹر آف کر کے مونس کی طرف رخ کرلیا۔

''بڑی بھابی ہیں........تمہاری بھلائی کا ہی تو سوچ رہی ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ تم اور عدن بنے ہی ایک دسرے کے لئے ہو۔ اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہے تم دونوں کے درمیان۔ پھر عدن کو ریجیکٹ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو ہو۔ وہ ہر لحاظ سے بہتر ہے تمہارے لئے۔ آخر بچپن کا ساتھ ہے۔'' مونس نہ جانے کیا اُگلوانا چاہ رہا تھا۔

''میری اور عدن کی دوستی کچھ انوکھی نہیں۔ ہم سب بچپن سے ساتھ ہیں۔ انس، زین، تم اور ردا........ میں نے کبھی دوستی کے علاوہ کسی اور رشتے کے متعلق نہیں سوچا۔'' زارون نے رکھائی سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ ہم سب ہمیشہ اچھے دوست ہی رہیں۔'' وہ صوفے پر لیٹ کر بالوں میں انگلیاں چلانے لگا تھا۔ مونس بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

''تم ابھی تک اس بات کو بھولے نہیں ہو؟ روشی آنٹی نے تم سے معذرت بھی کر لی تھی۔''

''ان کی معذرت سے کیا ہوا تھا؟ کیا ماما اور فائزہ بھابی طنز کرنا چھوڑ چکی تھیں یا پھر پاپا کو واپس لایا جا سکتا ہے؟ عدن کا اس قصے میں کوئی قصور نہیں تھا۔ سو میں اسے معاف کر چکا ہوں۔ مگر روشی آنٹی کے بہتان، الزام تراشیوں اور زہر میں بجھے الفاظ میں آخری سانس تک یاد رکھوں گا۔ پاپا کی وہ نظریں جن میں نہ جانے کتنے ہی شکوے تھے۔ میں کچھ نہیں بھلا سکتا۔ پھر ان نئے رشتوں کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ روشی آنٹی، عدن کی ماں ہیں۔ اس حوالے سے مجھے ان سے ملنا بھی پڑے گا، بولنا بھی پڑے گا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ عزت اور احترام کہاں سے لاؤں جو وہ خود اپنے ہاتھوں سے کھو چکی ہیں؟'' وہ زہر خند ہو رہا تھا۔

مونس کو بھی پانچ سال پہلے کے کچھ واقعات یاد آنے لگے۔ یہی گھر تھا۔ اسی گھر میں آنٹی نے ایسا تماشا لگایا تھا کہ وہ سب ہی کئی دن تک ایک دوسرے سے نگاہ چراتے رہے تھے۔ جبکہ زاورن تو پاپا کی ڈیتھ کے بعد لندن چلا گیا تھا۔ ابھی دو سال پہلے اس

کی واپسی ہوئی تھی۔

آج سے پانچ سال پہلے جب وہ امریکہ سے کراچی آئے تو ان کی کامیاب واپسی پر اسفندیار نے بہت بڑی پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ ان کے دو بھتیجے اور دو بھتیجیاں اور سب سے لائق فائق چھوٹا بیٹا زارون، فارن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔

یہ اس سے اگلے دن کی بات تھی۔ ان دنوں عدن کا ایک کزن ڈنمارک سے آیا ہوا تھا اور آنٹی اس پر بہت فدا ہو رہی تھیں۔ اسی ضمن میں انہوں نے زارون اور عدن کی بچپن کی منگنی توڑنے کا فیصلہ بھی کرلیا تھا۔ مگر اس سے پہلے انہوں نے بڑی پلاننگ کے ساتھ اپنے شوہر اور جیٹھ کو زارون سے متنفر کیا۔

انہوں نے ایک گھریلو ملازمہ کو کافی رقم دے کر اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے تیار کرلیا تھا۔ سو ان کی خواہش کے عین مطابق وہ رانی نامی لڑکی روتی دھوتی، چیختی چلاّتی اسٹڈی روم سے برآمد ہوئی اور اس نے چیخ چیخ کر زارون پر بہتان لگانے شروع کر دیئے تھے۔ آنٹی کی آواز بھی اس آواز میں شامل ہو گئی۔ انہوں نے ایسے ایسے گھٹیا اور شرمناک الزام لگائے تھے کہ زارون حق دق رہ گیا۔ باقی کسر اس کی بھابیوں اور بھائیوں نے پوری کر دی تھی۔ وہ جو ہر موڑ پر چاہا گیا تھا، سراہا گیا تھا، اتنی محبتوں اور چاہتوں کے بعد سب کی بدلی بدلی نگاہوں سے ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس شدید صدمے سے اسفندیار کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا جو کہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اپنے بیٹے کی اس قدر توہین اور بے عزتی وہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔

پاپا کی اچانک ڈیتھ کے بعد روشی آنٹی کو شدید قسم کے احساس جرم نے گھیر لیا تھا۔ سو ان کی نیندیں ایسی حرام ہوئیں کہ ایک دن دورے کی حالت میں انہوں نے اعتراف جرم کرلیا۔ اور پھر نہ صرف وہ شوہر اور بیٹی کی نظروں سے گری تھیں بلکہ خاندان بھر کی لعنت ملامت کا بھی انہیں سامنا کرنا پڑا تھا۔ بھانجے کی طرف سے مایوس ہو کر ایک مرتبہ پھر وہ زارون کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ مگر اب زارون نے ایک فیصلہ کرلیا تھا۔ بس وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھا کہ کب پورا خاندان ایک جگہ اکٹھا ہو اور وہ روشی کے سر پر بم پھوڑ دے۔

''مونس! کہاں کھو گئے؟ آج کل تم سوچوں میں گم رہنے لگے ہو؟''

''میں بھی تمہارے بارے میں کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔'' مونس نے چونک کر فٹ سے جواب دیا۔ زارون مسکرانے لگا۔

"مثلاً کیا؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہی کہ شہرے حسنین تمہارے حواسوں پر سوار ہو رہی ہے۔"

"کبھی کبھی تم ٹھیک اندازے لگا لیتے ہو۔" زارون اب بھی مسکرا رہا تھا۔ مونس ایک دم اچھل کر بیٹھ گیا۔

"میں ہمیشہ تمہارے بارے میں سو فیصد ٹھیک اندازے لگاتا ہوں۔ مجھے تو پہلے دن ہی پوری دال کالی نظر آنے لگی تھی۔ بس تیرے منہ سے اُگلوانا تھا۔" اس نے فخریہ کہا تھا اور پھر زارون کو "بنتِ حوا" کے گیٹ پر ہونے والی عانیہ اور شہرے کی گفتگو کی تفصیل بتانے لگا۔

"وہ پاکستان کی رہنے والی نہیں ہے۔" مونس نے کہا۔

"ہاں، میں نے اس کے آئی ڈی کارڈ سے معلوم کر لیا تھا کہ وہ ملائیشیا کی ریاست صباح سے تعلق رکھتی ہے۔ کافی عرصے سے وہ لوگ ملائیشیا میں مقیم ہیں۔ اس کا گھر بہت شاندار ہے۔ فادر کی فوڈ فیکٹری اسے وراثت میں ملی ہے۔ یہ سب جاننے کے باوجود صرف ایک سوالیہ نشان کھٹک رہا ہے کہ وہ پاکستان کس سلسلے میں آئی ہے؟" زارون تفصیلاً بتا رہا تھا جبکہ مونس نے حیرانی سے سر ہلایا اور بولا۔

"مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ یہ معمولی سی جاب صرف تم سے ملنے کی ایک کڑی ہے۔"

❁

"عانیہ! آج یاسر آیا تھا۔" پنڈی سے ثوبیہ آنٹی نے فون کر کے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔

عانیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"آپ سچ کہہ رہی ہیں امی! بھائی آپ سے ملنے آئے تھے۔"

"ہاں، اور وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔" آنٹی نے آنسو پونچھ کر بڑی محبت سے کہا تو عانیہ بے ساختہ بولی۔

"کہاں......؟"

"ملائیشیا۔"

"مگر کیوں؟...... کیا بھابی نے اجازت دے دی ہے؟ آخر ایسی کیا نئی بات ہوئی ہے کہ بھابی سرتا پا بدل گئیں۔" عانیہ حیران تھی، ششدر تھی...... اس کایا پلٹ نے

اسے گم سم کر دیا تھا۔

"وہ بدلنے والی چیز کہاں ہے؟...... یاسر نے اسے طلاق دے دی ہے۔" اب ان کی آواز پھر سے بھرا گئی تھی۔ انہوں نے ایسا تو کبھی نہیں چاہا تھا۔

"کب......؟" عانیہ تو پے در پے انکشافات سے دنگ رہ گئی۔

"چند دن پہلے۔ اور اب وہ ہمیں ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔ مگر تمہارے ابو نہیں مان رہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ پہلے تمہاری شادی کر دی جائے، پھر ہم لوگ یاسر کے ساتھ جائیں گے۔" وہ دل سے بیٹے کو معاف کر چکی تھیں۔ عانیہ فون بند کر کے بھی کتنی ہی دیر ساکت بیٹھی رہی۔

"کیا بات ہے عانیہ!" شہرے ابھی ابھی ایما سے بات کر کے اندر داخل ہوئی تھی، اسے گم سم دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"میرا بھائی یاسر لوٹ آیا ہے۔"

"ارے...... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ تم کیوں رنجیدہ ہو؟" شہرے خوشی سے بھرپور آواز میں بولی تھی۔

"بھابی جیسی عورتوں کے انجام پر افسردہ ہوں۔ انہوں نے بھلا کیا پایا ہے سب کے دل دکھا کر؟"

"دفع کرو ایسی بھابی کو۔ چلو اس خوشی میں تمہیں آئس کریم کھلاتی ہوں۔" شہرے مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیا فائدہ، تم تو کھاؤ گی نہیں۔"

"تمہیں کھاتا دیکھ کر خوش ہوتی رہوں گی۔" اس نے مزے سے کہا۔

"شہری! کل ہم پنڈی چلیں گے۔" عانیہ کافی دیر سوچنے کے بعد بولی تھی اور پھر انہوں نے جھٹ پٹ پنڈی جانے کا پروگرام بنا لیا۔ آفس سے تین دن کی چھٹی لے کر دوسرے دن بائی ایئر وہ دونوں پنڈی پہنچ گئی تھیں۔

اسی شام یاسر ایک مرتبہ پھر بہن سے ملنے ان کے فلیٹ میں آیا تھا اور وہیں شہرے نے یاسر کو بغور دیکھ کر ایک دم ذہن کو دوڑانا شروع کر دیا تھا کہ اس نے اس چہرے والے بندے کو کہاں دیکھا ہے۔ اس کی یادداشت چہرے پہچاننے کے معاملے میں بہت اچھی تھی۔ یہ اس کا دعویٰ تھا۔ اس معاملے میں وہ دھوکا کھا ہی نہیں سکتی تھی۔

یہ واقعی یاسر تھا۔ مریم کا یاسر...... شہرے نے اسے تصویروں کے علاوہ بھی دیکھ

رکھا تھا۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

''آپ یہاں........؟''

❀

''تم یاسر بھائی کو جانتی ہو؟'' رات کو عانیہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

شہرے کے دل میں غم و غصے کے طوفان اٹھ رہے تھے مگر بظاہر وہ پُرسکون تھی۔

''بہت اچھی طرح۔'' اس نے طنزیہ کہا۔

''مگر کیسے؟'' عانیہ اس کا طنز سمجھے بغیر خوش دلی سے بولی تھی۔

''دو دن انتظار کرلو۔ سارا کچا چٹھا کھول دوں گی۔'' شہرے نے سنجیدگی سے کہا تھا اور پھر اس نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔

اسی صبح اس نے چپکے سے مریم کو کال ملائی۔ اسے فوراً پاکستان آنے پر بمشکل راضی کیا تھا۔ اور پھر تین دن بعد وہ ان کے ساتھ فلیٹ میں موجود اپنی داستان سنا رہی تھی۔ اور آنٹی روتے ہوئے مسلسل عائشہ کو چوم رہی تھیں، یاسر کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ خود مریم بھی حیران تھی۔ اسے شہرے سے ایسے سرپرائز کی توقع نہیں تھی۔

انکل نے فوراً یاسر کو طلب کرلیا تھا اور وہ مریم اور عائشہ کو دیکھ کر گم سُم رہ گیا تھا۔ اور پھر اس نے اپنی بیٹی کو بے ساختہ گود میں اٹھایا اور چومنے لگا۔

''میں تم دونوں کو یہاں بلانے والا تھا۔'' یاسر نے شرمندگی سے چُور آواز میں کہا اور پھر ساری رات صفائیاں پیش کرتا رہا۔

''مگر انہیں کبھی بھی معاف نہ کرنا مریم! ایسے لوگ معافی کے قابل نہیں ہوتے۔'' شہرے نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں خود اسے کبھی معاف نہیں کروں گی، جس نے مجھے میری پوتی تک کی خبر نہیں دی۔ تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے یاسر!'' آنٹی بھی مریم کی بھرپور حمایت کر رہی تھیں۔ انہیں گویا ہفت اقلیم کی دولت مل چکی تھی۔ وہ اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کرتی، کم تھا۔ جس نے ان کی کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹا دی تھیں۔ اور ادھر یاسر، مریم کے کان میں نہ جانے کیا کیا سرگوشیاں کررہا تھا۔

اگلی صبح شہرے نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ مریم اور آنٹی کچن میں مصروف حلوہ پوری کا اسپیشل ناشتہ بنا رہی تھیں جبکہ عائشہ، انکل کی گود میں چڑھی اپنی توتلی باتوں سے انہیں مسلسل ہنسا رہی تھی۔ شہرے اور عانیہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بے ساختہ مسکرا

دی تھیں۔ کیسا فلمی سا سین تھا۔ شہرے، مریم سے ناراض تھی، جس نے یاسر کو دو لمحوں میں معافی کا پروانہ تھما دیا تھا۔

''مجھے ایک دفعہ پھر یاسر مل گیا ہے۔ ایک خاندان مل گیا ہے۔ میری بیٹی کو اپنی پہچان مل گئی ہے........ میں اسی خوشی میں سب کچھ بھلا چکی ہوں، شہری جی! مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ میں یاسر کی فیملی کا حصہ بن چکی ہوں۔ آپ کا بہت شکریہ، یہ سب آپ کی کوششوں کا رزلٹ ہے۔ میں کبھی بھی اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتی۔''

مریم نے فرطِ محبت سے اس کے ہاتھ چوم لئے تھے اور پھر نم آنکھوں سے یہ بتانے لگی تھی کہ یاسر کیوں بغیر کچھ بتائے، اپنا اتا پتہ دیئے غائب ہوا تھا۔

''وہ پہلے یہاں آ کر اپنے امی ابو کو منانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ عائشہ کے بعد وہ سنجیدگی سے مجھے اپنے ساتھ واپس لانے کا سوچ چکے تھے مگر پہلے یہاں حالات ٹھیک کرنا چاہتے تھے۔ ان کی پہلی بیوی کی وجہ سے امی، ابو ناراض تھے۔ ان کی بہن بھی خفا تھی۔ وہ سب کو منانے کے بعد مجھے اور عائشہ کو بلوانا چاہتے تھے۔ مگر اس سے پہلے ہی میں یہاں پہنچ گئی اور یہ سب آپ کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔''

''مگر یاسر بھائی تمہیں اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا کر آتے تو بہتر تھا۔ انہوں نے غلطی تو کی ہے۔ میرے نزدیک تو یہ بہت بڑا جرم ہے۔ انہوں نے تمہیں رُلایا ہے، ستایا ہے اور تم احمق انہیں معاف کرچکی ہو۔''

انہوں نے مجھ سے اس انداز میں معافی مانگی تھی کہ میں انہیں معاف کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ اور پھر امی اور ابو کی سفارش بھی نظر انداز نہیں کی جانے والی تھی۔ وہ اپنے صبح کے بھولے بیٹے کو پھر سے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر شہری جی! میرے لئے اس سے بڑی خوشی کوئی نہیں کہ امی، ابو مجھے قبول کرچکے ہیں۔ مجھے ایک گھر مل گیا ہے۔ میری بیٹی کو اپنوں کا پیار مل گیا ہے۔'' حالات کی تلخیوں نے اسے بہت سمجھ دار کر دیا تھا۔

شہرے دل ہی دل میں قائل ہوچکی تھی۔ واقعی یہ تو بہت خوشی کا مقام تھا کہ آنٹی اور انکل نے مریم کو قبول کرلیا تھا۔ یاسر نے پھر اسے محبتوں کا مان اور سائبان مہیا کر کے پھر سے اس کا دل جیت لیا تھا۔

''عورت کا دل تو ہوتا ہی موم کی طرح ہے۔ ذرا سے پیار کے دو بول پیا کے منہ سے نکلنے کی دیر ہوتی ہے اور عورت بے چاری اپنی جان تک وارنے پر تیار ہوجاتی ہے۔ حوا کی بیٹی جو ہوئی۔ ایک گھر کی چاہ، ایک مرد کا تحفظ، سارے دکھ بھلا دیئے تھے صرف

اسی ایک چاہت نے۔ آبلہ پائی کا سفر بھی بھول چکا تھا۔ رتجگوں کے عذاب اور راتوں
کی تاریکیوں میں بہنے والے آنسو بھی یاد نہیں رہے تھے۔ صرف ایک پیا کی مسکراہٹ
نے یہاں سے لے کر وہاں تک پھول ہی پھول کھلا دیئے تھے۔ بہاروں نے اپنی آمد کی
خبر دے ڈالی تھی۔ بارش کے پہلے قطرے نے دھرتی کے رخسار چوم لئے تھے۔ مریم نے
آگے بڑھ کر تمام دریچے کھول دیئے۔

''میں پوچھ سکتا ہوں مادام! آپ سے کہ ہماری والی کو کہاں لے اُڑی تھیں آپ؟
اور ابھی بھی وہ عانیہ بی بی آپ کے ساتھ دکھائی نہیں دے رہیں؟'' اپنے پیچھے ایک
مردانہ آواز سن کر شہرے اچھل کر پلٹی۔

''آپ........ یہاں؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے ایک مرتبہ
پھر اسی لائن میں بنے گھر کی ''نیم پلیٹ'' پر اپنے نانا کا نام تلاش کر رہی تھی، جب مونس
کی آواز سن کر ٹھٹک گئی۔

''میں بھی یہی سوال آپ سے کرنے والا تھا کہ آپ ادھر کیا کر رہی ہیں؟ کچھ
عرصہ پہلے بھی میں نے آپ کو اسی ایریا میں دیکھا اور ابھی میں ٹیرس پر کھڑا کب سے
آپ کو اِدھر سے اُدھر آتا جاتا دیکھ رہا ہوں........ اپنی پرابلم مس شہرے حسنین!'' مونس
نے بے حد شائستگی سے پوچھا تھا۔ شہرے نے چند پل میں فیصلہ کر لیا تھا، کیوں نہ مونس
کی مدد لی جائے۔

''آپ اس ایریا میں رہائش پذیر کسی ''بختیار سکندر'' کو جانتے ہیں؟'' وہ بہت
پریشانی کے عالم میں تھکی تھکی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ اب کے مونس سچ مچ ٹھٹک گیا۔

''بختیار سکندر سے آپ کیوں ملنا چاہتی ہیں؟''

''یہ بات تو میں انہیں ہی بتاؤں گی۔ کیا آپ مجھے ان کے گھر کا پتہ بتا سکتے ہیں؟''
شہرے نے بے حد لجاجت سے کہا تھا۔

مونس کچھ پل سوچتا رہا تھا اور پھر آہستگی سے بولا۔

''آپ اس وقت ان کے گھر کے سامنے ہی کھڑی ہیں۔''

''یہ بختیار سکندر صاحب کا گھر ہے؟'' شہرے کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔
وہ ایک مرتبہ پھر نہایت خوشی اور جوش کے ملے جلے انداز میں بولی تھی۔

''آپ ان کے کیا لگتے ہیں، یعنی رشتے میں؟'' اتنا تو وہ دیکھ چکی تھی کہ مونس اسی

گھر کے گیٹ سے برآمد ہوا ہے۔

''میں ان کا پوتا ہوں۔''

''کیا........ آپ اسفند ماموں کے بیٹے ہیں؟'' شہرے خوشی سے بھرپور آواز میں
سرگوشیانہ بولی۔

''نہیں، میرے پاپا کا نام فریدون ہے۔ بڑے پاپا اسفند کا بیٹا زارون ہے۔ آپ
زارون کے آفس میں جاب کرتی ہیں نا؟'' مونس بھی اس کے چہرے پر بکھری خوشی کو
دیکھ کر بے حد حیران رہ گیا تھا۔ یہ لڑکی ایک ''معمہ'' لگتی تھی۔ اب وہ اپنی نم آنکھوں کو
پونچھ رہی تھی۔

''آپ مجھے میرے نانا سے ملوا دیں گے؟'' شہرے نے ایک تواتر سے بہنے والے
آنسوؤں کو ہتھیلیوں سے رگڑتے ہوئے پھر سے بہت التجائیہ انداز میں کہا۔

''نانا........'' مونس اچھل ہی تو پڑا تھا۔

''آپ کون ہیں شہرے!'' اب کے مونس کے لب و لہجے میں حد درجہ سنجیدگی نمایاں
تھی۔

''میں آپ کی پھپھو باسمہ بختیار کی بیٹی ہوں۔'' شہرے نے بھرائی آواز میں کہا۔
مونس کے سر پر گویا بم بلاسٹ ہوا تھا۔ وہ حق دق سا کھڑا اسے دیکھتا رہا جو کہ اپنی ہی
دھن میں مگن کہہ رہی تھی۔

''میں نے جب پہلی مرتبہ زارون کو لندن میں دیکھا تھا، اسی وقت مجھے گویا یقین
ہو گیا تھا کہ یہ اسفند ماموں کا بیٹا ہوگا۔ زارون اُن سے بہت مشابہہ ہے۔ سیم ان کی
کاربن کاپی لگتا ہے۔ بس تھوڑا سا فرق ہے۔ ماموں کے چہرے کے نقوش میں نرمی پائی
جاتی ہے، مگر زارون کے نقوش میں سختی نمایاں ہے۔ یہ دیکھئے، اسفند ماموں کی تصویر۔''
اس نے بیگ میں سے ایک تصویر نکال کر مونس کے سامنے کر دی تھی۔ اس کی اکلوتی
پھپھو باسمہ کے ساتھ ایک خوش شکل نوجوان بیٹھا تھا جبکہ بائیں طرف بڑے پاپا
اسفند یار، پھپھو کو بانہوں کے حلقے میں لئے بیٹھے تھے۔

مونس کی تمام تر اُلجھنیں دور ہو گئی تھیں۔ شہرے پی سی کے ہال میں زارون کو دیکھ
کر کیوں ٹھٹکی تھی، سب روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکا تھا۔ ایک فطری سی محبت مونس
نے اس روتی ہوئی لڑکی کے لئے دل میں محسوس کی تھی۔

''آپ کو تصویر دیکھ کر یقین آ گیا ہے نا کہ میں باسمہ بختیار کی بیٹی ہوں۔'' اس نے

بڑے آس بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

مونس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اثبات میں سر ہلایا۔

''میں اپنے نانا سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اس نے بے قراری سے کہا۔

''مگر شہرے! وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دادو کی بھی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ پھپھو کی وفات کے صرف ایک ہفتے بعد دادو اور پھر دادا بھی انتقال کر گئے تھے۔ اپنی اکلوتی بیٹی کی موت کا صدمہ وہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔'' مونس اس کے فق چہرے اور کپکپاتے ہونٹوں کو دیکھ کر سر جھکائے بولا۔

''اور اسفند ماموں؟'' اس کی آواز گویا کنوئیں سے برآمد ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چکراتے سر کو تھاما۔

''وہ بھی اس دنیا میں نہیں ہیں۔''

''تو پھر شہرے یہاں اس سرزمین پر کیا لینے آئی ہے؟ میرا اعتبار کرنے والے، میری ماں کو چاہنے والے تو اس دنیا سے چلے گئے ہیں۔ پھر شہرے حسنین کو کون محبت سے تھامے گا؟ میرے ماتھے پر کون شفقت سے بوسہ دے گا؟ میرا کوئی بھی نہیں رہا۔ میں بالکل تنہا ہو گئی ہوں۔ آس کا دامن بھی چھوٹ گیا۔ میرے پاپا، میری ماما........ میرے سب رشتے ختم ہو گئے ہیں۔ میں شہرے حسنین، رشتوں کے معاملے میں کس قدر غریب ہوں، قلاش ہوں، مفلس ہوں۔'' وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''ہم ہیں نا........ تمہارے اپنے۔ تم آؤ میرے ساتھ۔'' مونس نے آگے بڑھ کر اس کا سر نرمی سے تھپتھپا کر کہا تھا۔ شہرے کے دل کو تھوڑی سی ڈھارس بندھی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس شیشے کے محل میں اسے سوائے ''آنسوؤں'' کے کچھ نہیں ملے گا۔

''خود کو سنبھالو شہرے!........ زندگی میں بڑے بڑے طوفانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ بہت پھونک پھونک کر پاؤں رکھنے پڑتے ہیں۔'' عانیہ اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے بھرائی آواز میں کہہ رہی تھی۔

مونس اسے اپنے پورشن میں لے جانے کے بجائے عدن کے پورشن میں لے آیا تھا۔ اس کے ممی پاپا، پنڈی کینٹ میں عارضی طور پر مقیم تھے۔ وہ آنٹی کو شہرے کے متعلق بتا کر انہیں حیران پریشان چھوڑ کر زارون کو بتانے کے لئے باہر کی طرف بھاگا تھا۔ کچھ خوشی اور شہرے کے متعلق انوکھے سے انکشاف نے ذہن کو باؤنڈ کر دیا تھا۔ ورنہ وہ زارون کو فون پر بھی انفارم کر سکتا تھا۔

''اچھا تو تم باسمہ کی بیٹی ہو۔'' روشانہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ اسی لڑکی کی وجہ سے رات کو ان کے اور زارون کے درمیان زبردست سی جھڑپ ہوئی تھی۔ وہ ان کی اکلوتی لائق فائق حسین بیٹی پر کسی دو ٹکے کی سیکرٹری کو فوقیت دے رہا تھا۔ کل اس نے ہارون کے بیٹے کی سالگرہ کے فنکشن میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ کسی شہرے حسنین سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہے۔ عدن کے مقابلے میں وہ کسی سیکرٹری کو سامنے لے آیا تھا۔ روشانہ کو آگ بگولا ہونے میں صرف چند پل لگے تھے۔ غصے اور توہین کے احساس سے اس کا رواں رواں سلگنے لگا تھا۔

''تم جانتے ہو، عدن تمہاری منگیتر ہے؟''

''کبھی تھی۔ اب نہیں، اس نام نہاد منگنی کو آپ خود توڑ چکی ہیں۔ اتنا پرانا واقعہ تو نہیں۔ نہ ہی آپ کی یادداشت اتنی کمزور ہے۔'' زارون نے تمسخرانہ کہا۔

''اب میرے ساتھ کون سے لعل، جواہرات جڑ گئے ہیں۔ میں وہ ہی زارون اسفند ہوں جسے پانچ سال پہلے آپ نے انہی سب لوگوں کے درمیان تماشا بنا دیا تھا۔''

"میری بیٹی کو تم ٹھکرا کر اس دو ٹکے کی سیکرٹری کو اس گھر میں لاؤ گے۔" روشانہ نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو بھی بے نقط سنا رہی تھی، جو خاموش تماشائی بنے کھڑے تھے۔ عدن الگ توہین کے احساس سے بھری شیرنی بنی غصے کے عالم میں بل کھا رہی تھی۔ زارون کے اس فیصلے کو سن کر اس کی دونوں بھابیوں نے بھی اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ اس کے دونوں بھائی بھی کچھ خاص خوش نظر نہیں آ رہے تھے۔ سب نے فرداً فرداً اسے سمجھانا چاہا۔

"اس لڑکی کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ معمولی سی سیکرٹری کے لئے خاندان میں ایک جنگ کے سلسلے کو مت شروع کرو۔ کم از کم اپنے اسٹینڈرڈ کی لڑکی کو عدن کے مقابلے میں لانا تھا۔ ان مڈل کلاس کی لڑکیوں کو اچھے گھرانوں کے امیر لڑکوں کو پھانسنے کے علاوہ آتا ہی کیا ہے۔" فرزان کا انداز جلا کٹا تھا۔ زارون کا چہرہ غصے کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔

"آپ کون ہوتے ہیں، اس کی کلاس کا تعین کرنے والے۔ وہ میرے لئے کیا ہے، یہ آپ لوگ نہیں جان سکتے۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی بزنس ڈیلنگ نہیں۔ اور برائے مہربانی آپ کو میرے معاملات میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے "پرسنلز" میں اپنے بھائیوں کا بولنا بھی پسند نہیں کرتا۔"

گھر میں اک سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ روشانہ، بیٹی کے دل کی کیفیت سے واقف تھیں۔ سو انہوں نے ایک دفعہ پھر عدن کی خاطر شوہر سے لڑنا جھگڑا شروع کر دیا تھا۔ زارون پر کوئی اثر ہوتا نہ دیکھ کر۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اس پر الزام تراشیاں اور بہتان باندھنے شروع کر دیے تھے۔ اور اب شہرے کی آمد تابوت میں آخر کیل ٹھونکنے کا باعث بنی تھی۔ مونس کے انکشاف نے انہیں متوحش کر دیا تھا کہ یہی زارون کی سیکرٹری اور باسمہ کی بیٹی ہے، جس سے وہ شادی کا فیصلہ کر چکا ہے۔ وہ شہرے کو دیکھ کر پاگلوں کی طرح چلانے لگی تھیں۔ اسی اثنا میں عدن بھی آ گئی۔

"تیری ماں بھی بے غیرت تھی۔ تُو بھی بے غیرت ہے۔ وہ بھی کسی غیر ملکی پر عاشق ہو کر گھر سے بھاگ گئی تھی۔ اسے بھی مردوں کو لبھانا آتا تھا۔ تُو نے بھی یہی گُن وراثت میں لئے ہیں۔ بدکردار ماں کی بدکردار بیٹی........ ادھر کیا لینے آئی ہے؟ دفع ہو جا، یہاں سے۔ تیرے ہوتے سوتے مرکھپ گئے ہیں۔ پانچ سال پہلے آتیں تو اسفندیار نے تجھے ضرور چوم چاٹ کر سینے سے لگا لینا تھا۔ اسے گندگیاں اور غلاظتیں

سمیٹنے کی عادت تھی۔ تیری ماں کے "معاشقوں" کی داستان سن کر وہ چلا گیا تھا اسے لے کر نکاح کرنے۔ خود ہاتھ سے پکڑ کر تیرے باپ کے گھر چھوڑ آیا تھا اس بے غیرت کو۔ مری جا رہی تھی، اس حسنین احمد کے عشق میں۔ نہ باپ کی عزت کا خیال کیا، نہ بھائیوں کی غیرت کا۔" روشانہ کے ساتھ ساتھ اب عدن بھی چلاّ رہی تھی، اس پر کیچڑ اچھال رہی تھی، اس کے کردار کی دھجیاں بکھیر رہی تھی۔

"سوائے زارون کے تجھے اس پوری دنیا میں کوئی نہیں ملا؟ آ گئی ہو مجھے برباد کرنے۔ آوارہ ماں کی اولاد........ تجھ جیسی بے شرم، بے حیا عورت کو راہ چلتے بہت مل جائیں گے۔ جان چھوڑ دو، زارون کی۔"

شہرے کو لگ رہا تھا، گویا کسی نے اس کے حلق پر چھری رکھ کر چلا دی ہے۔ اپنی ماں کے بارے میں ایسے توہین آمیز الفاظ سن کر اس کے اندر بھانبھڑ جلنے لگے تھے۔ کچھ دیر بعد گھر کے اور بھی افراد اکٹھے ہونے لگے تھے۔ ماہا، فائزہ، زین........ نوکر، مالی، ڈرائیور........ شہرے کو یوں محسوس ہو رہا تھا، وہ اک پل میں ہی چکرا کر زمین بوس ہو جائے گی۔ اس نے عدن کے منہ کو نوچ لینا چاہا تھا، اس کے چہرے کو مسخ کر دینا چاہا تھا۔ اس کے پتھر وجود میں حرکت ہوئی تھی اور پھر وہ یک دم پھٹ پڑی۔

"اعلیٰ حسب نسب والی بدزبان عورتو! تم کیا جانو "محبت" کس شے کا نام ہے۔ میری ماں کی عظمت کا تم لوگوں کو کیا پتہ؟ کیا خبر میری ماں کو چاہنے والے منوں مٹی تلے جا سوئے ہیں۔ پہلے اپنے گریبان میں جھانک لو، پھر کسی دوسرے پر تہمت لگانا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے پاپا کا فیصلہ غلط تھا۔ انہوں نے مجھے غلط جگہ پر بھیجنے کا فیصلہ کر کے مجھے میری ہی نظر سے گرا دیا ہے۔ وہ جانتے نہیں تھے، تم لوگ انسان نہیں ہو، نہ تم میں انسانیت پائی جاتی ہے۔ تم لوگ ناسور ہو........ عذاب ہو۔ آج میں اپنی ممی کے بھائیوں کے گھر سے ذلتوں کے "تحفے" لے کر جا رہی ہوں۔ حقارت اور نفرت کی سوغات ملی ہے مجھے۔ یہ میری ماں کا پاکستان ہے۔ اس وطن سے مجھے اتنی محبت ہے، اتنی اُلفت ہے صرف اس لئے کہ میری ماں کا پاکیزہ وجود اس پاک زمین کی گود میں محفوظ ہے۔ یہاں میرا سب سے بڑا اثاثہ میری ماں کی "قبر" ہے۔ میں کسی کلرک کی بیٹی نہیں ہوں، جو آپ کے اعلیٰ خاندان اور اپر کلاس کا حصہ بننے کے لئے کسی غیر مرد کو لبھاؤں گی۔

میرا "ہوم لینڈ" تمہارے ان پانچ پورشنز پر مشتمل گھر سے بھی بڑا ہے۔ میرے پاپا کی فوڈ فیکٹری آپ کی تمام فیکٹریوں سے زیادہ پرافٹ دیتی ہے۔ میرے پاپا نے مجھے

سب کچھ بتایا تھا کہ پاکستان میں میری ممی کے پانچ بھائی رہتے ہیں۔ ان کے ممی پاپا ہیں۔ ان کا بہت اعلیٰ حسب نسب ہے۔ انہوں نے مجھے سب کچھ بتایا تھا۔ صرف یہ بتانا بھول گئے تھے کہ ممی کے بھائیوں نے رشتوں کو دولت کے ترازو میں رکھا ہوا ہے۔ جنہیں انسانیت اور محبت کے کسی سبق کا پتہ نہیں۔ جو ان کی "شہری" کو کسی مردار کی طرح دھتکار دیں گے۔ جو مجھ پر اتنا کیچڑ اچھالیں گے کہ میرا پورا وجود اس گندگی سے لت پت ہو جائے گا۔" اس نے آخری حقارت بھری نگاہ ان کے ساکت، مہر بہ لب چہروں پر ڈالی تھی اور آنکھوں میں ڈھیروں آنسو لئے نکلتی چلی گئی۔ اس نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی تھی۔ یہ فرجمند سکندر کی آواز تھی۔

"شہرے بیٹا! رک جاؤ۔"

اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ مڑ کر دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کی ماں کے خاندان والے تھے۔ ان اپنوں کی چاہ میں وہ اپنی ہستی کا غرور تک کھو بیٹھی تھی۔ وہ ان سے ملنے کی ہمک لئے اتنی دور سے یہاں تک آئی تھی۔ وہ رشتوں کا مان اور تحفظ لینے کے لئے آئی تھی، یہ نہیں جانتی تھی کہ اپنی انا اور تمام تر تفاخر گنوا بیٹھے گی۔ اس کے آنسو، عانیہ کے دل پر گر رہے تھے۔ وہ اسے سمیٹتے سمیٹتے خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ ہتھیلی پر جلتا چراغ رکھ لیا تھا اس نے، جلن تو ہونا ہی تھی۔

❁

وہ زارون اسفندیار تھا...... اپنے پاپا کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا۔ اس کی پیدائش کے چار سال بعد ماما کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ ماما کے بعد پاپا نے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ شروع سے ہی اپنے پاپا کے ساتھ بہت اٹیچ تھا۔ وہ بھی اپنے بڑے دونوں بیٹوں کی نسبت اس سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ اس لئے بھی کہ وہ سب سے چھوٹا تھا اور شاید اس لئے بھی کہ وہ ہو بہو شکل و صورت میں ان جیسا تھا۔ البتہ اس کا مزاج اپنے پاپا جیسا تھا، نہ ماما جیسا۔ وہ بے حد غصیلا اور اکھڑ مزاج تھا، بالکل اپنے دادا جیسا۔

بختیار سکندر کو اپنی ساری اولاد میں سب سے زیادہ اپنی چھوٹی بیٹی باسمہ سے محبت تھی۔ وہ اپنے بھائیوں اور ممی کی بھی بہت لاڈلی تھی۔ مگر سب سے بڑے بھیا اسفندیار سے اس کی دوستی اور محبت مثالی تھی۔ وہ اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات، ہر مسئلہ اپنے بھیا اسفندیار سے شیئر کرتی تھی۔ اور پھر باسمہ نے اپنی زندگی کے بہت اہم معاملے کو اپنے بھیا سے نہ چھپا کر انہیں اور بھی خود سے قریب کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی لاڈلی بہن

کی خاطر اپنے والد سے الجھ پڑے تھے۔ پاپا کو قائل کرنا انتہائی مشکل امر تھا۔ وہ ایک دفعہ فیصلہ کرتے تھے اور پھر ہمیشہ کے لئے اس پر ڈٹ جاتے۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کے معاملے میں بھی اپنے اصولوں کو نہیں توڑا تھا۔ سو ایسے حالات دیکھ کر اسفندیار نے ملائیشیا جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ حسنین احمد سے ملنا چاہتے تھے، اسے پرکھنا چاہتے تھے۔ اور پھر انہیں حسنین احمد کو دیکھ کر مایوسی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ اپنی بہن کے انتخاب کو سراہے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

ایک طویل جنگ کے بعد جب پاپا کسی طور نہ مانے تو وہ خود باسمہ کو لے کر ملائیشیا چلے گئے تھے۔ ان کی موجودگی میں نکاح کی رسم ادا ہوئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اس انتہائی اقدام کی وجہ سے انہیں پاپا سمیت سب کی ناراضی برداشت کرنا پڑے گی۔ مگر پاکستان آنے کے فوراً بعد انہیں پاپا کی طرف سے جلاوطنی کا حکم مل گیا تھا۔ وہ ان کی کسی دلیل کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ سو وہ اپنی بیوی حاجرہ اور بچوں سمیت لندن چلے گئے تھے۔ حاجرہ کی ڈیتھ اور باسمہ کی اچانک موت کی خبر نے انہیں کئی سالوں تک اک نہ ختم ہونے والی اذیت میں جکڑے رکھا تھا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے بچوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ مگر باسمہ کو بھلانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بھی اس صورت میں جب امی، پاپا انہیں ہی الزام دیتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی بھی انہیں مجرم تصور کرتے تھے جنہوں نے ان کی پیاری بہن کو ان سے دور کر دیا تھا۔ پاپا کے خیال میں ان کا فیصلہ غلط تھا اور حسنین احمد کو وہ باسمہ کے ایکسیڈنٹ کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔

زارون نے ہوش سنبھالنے کے ساتھ اپنے باپ کو کمرے میں بند چپکے چپکے روتا دیکھا تھا۔ وہ اکثر ہی نہ جانے کس کی تصویر کو دیکھ کر پہروں روتے رہتے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ خاموش رہنے لگے تھے۔ بہت عرصہ تک زارون نے بھی اس تصویر والی ہستی کے متعلق پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی مگر پھر ایک دن اس نے پاپا سے پوچھ ہی لیا۔

"یہ باسمہ ہے، میری چھوٹی بہن، تمہاری پھپھو۔"

پاپا کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ ان کی آواز بھرا رہی تھی۔

"پاپا! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ کیا ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے؟" زارون کے پوچھنے پر انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

زارون بہت دیر تک اپنی پھپھو کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ بہت خوب صورت کتابی چہرہ

تھا۔ زارون نے اس تصویر کو پاپا کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اتنی مرتبہ دیکھا تھا کہ باسمہ کے چہرے کا ایک ایک نقش اسے ازبر ہو چکا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو چھم سے ایک ہنستی مسکراتی تصویر سامنے آ جاتی تھی۔ پھر یہ کیسے ناممکن تھا کہ وہ شہرے حسنین احمد کو پہچاننے میں غلطی کرتا۔ اسے پاپا نے پھپھو کے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔

"تو آپ کو کم از کم پھپھو کی بیٹی سے رابطہ رکھنا چاہئے تھا پاپا!"

"حسنین گھر بیچ کر کہیں اور شفٹ ہو چکا ہے۔" پاپا نے رنجیدگی سے بتایا تھا۔ اور پھر جب وہ پڑھنے کے لئے امریکہ جا رہا تھا تو پاپا نے اس سے انوکھی سی بات کی تھی۔

"تم شہرے کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنا، زارون! چھٹیوں میں ملائیشیا کا ایک چکر ضرور لگا لینا۔ کیا پتہ، شہرے کا کہیں سے سراغ مل جائے۔"

اس نے پاپا کا دل رکھنے کے لئے ہامی بھر لی تھی مگر پھر امریکہ جا کر سب کچھ بھول بھال گیا تھا۔ ملائیشیا کوئی چھوٹا سا ملک ہے؟ وہ کہاں شہرے کو ڈھونڈتا پھرتا۔ اسے پاپا کی فرمائش پر ہنسی آ رہی تھی۔

پھر وقت گزرتا رہا۔ وہ، مونس، انس، ردا اور عدن اپنی تعلیم مکمل کر کے پاکستان لوٹ آئے تھے۔

"عدن فرجند اس کی دوست تھی۔ کزن تھی اور منگیتر بھی۔ پاپا کا ارادہ اس کی شادی کر دینے کا تھا مگر نہ جانے کیوں روشی آنٹی ٹال مٹول سے کام لے رہی تھیں۔ ان کی گھٹیا سازش کا عقدہ بھی جلد ہی کھل گیا۔ وہ عدن کی شادی اپنے بھانجے سے کرنا چاہتی تھیں اور اس رشتے کو توڑنے کے لئے انہوں نے بڑی جاندار پلاننگ کر رکھی تھی۔ ان کا ڈرامہ کامیاب رہا تھا مگر پھر روشی آنٹی کے خواب توڑ کر ان کا اکلوتا مل اونر بھانجا واپس ڈنمارک چلا گیا تھا۔ آنٹی کی گھٹیا سازش کی لپیٹ میں صرف وہ نہیں آیا تھا بلکہ انہوں نے اس کی پھپھو باسمہ کی ناکردہ غلطیوں کو بھی دہرانا شروع کر دیا تھا۔ پاپا یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔

ان کی وفات کے بعد زارون نے اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں محسوس کی تھیں۔ اس کے بھائیوں جیسے کزنز کا ساتھ نہ ہوتا تو یقیناً اس کے دماغ کی شریان ضرور پھٹ جاتی تھی۔ اسے آنٹی سے شدید قسم کی نفرت ہو چکی تھی۔ مگر عدن سے وہ بے رخی نہیں برت سکا تھا۔ اسی لئے وہ ابھی تک ساتھ ساتھ تھے۔ پھر انہی دنوں اسے لندن جانا پڑا تھا۔ اسے کاروباری حوالے سے کچھ لوگوں سے ملنا ملانا تھا۔ آفس ورک کے علاوہ واپس آنے

سے پہلے وہ اپنے ایک عزیز ٹیچر سے ملنے یونیورسٹی چلا گیا تھا۔ دو گھنٹوں کی طویل ملاقات اور گپ شپ کے بعد جب زارون واپس جانے کے لئے گراؤنڈ سے گزرتا ہوا بیرونی گیٹ تک جا رہا تھا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی بہت پُرشوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کی نظروں کی تپش نے اسے مڑنے پر مجبور کیا تھا مگر ارد گرد اسے کوئی ایسا شناسا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ اسی لئے وہ دوبارہ سے اپنی دھن میں مگن گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

دوسری مرتبہ اسی قسم کے احساسات سے دوچار وہ ایک شاپنگ مال سے گزرتے ہوئے ہوا تھا۔ اس دفعہ بھی کوئی چہرہ اس کی نگاہ کی زد میں نہیں آیا تھا جسے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک جاتا۔ مگر پارکنگ تک جاتے جاتے اس نے مڑ کر ایک دفعہ پھر دیکھا تھا۔ ایک لڑکی تقریباً بھاگتے ہوئے سامنے سے آ رہی تھی۔ زارون نے کوئی توجہ نہیں دی تھی اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر وہ واپس اپنے فلیٹ کی طرف آ گیا۔

تیسری مرتبہ وہ جان چکا تھا کہ لندن میں قیام کے دنوں میں وہ کیوں ایسے احساسات کا شکار رہا ہے۔ پی سی کے ہال میں موجود وہ لڑکی جس شوق کے عالم میں محبتوں کا جہان آنکھوں میں سموئے اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اب کے زارون کے ٹھٹکنے کی وجہ وہی کتابی چہرہ تھا جس کی تصویر اس نے کئی ہزار مرتبہ پاپا کے کمرے میں دیکھ رکھی تھی۔

وہ شہرے حسنین احمد تھی۔ اس کے پاپا کی عزیز از جان بہن کی بیٹی۔ وہ اسے پہچان چکا تھا۔ پھر وہ کئی مرتبہ مختلف جگہوں پر اسے دکھائی دینے لگی۔ مگر حقیقت میں وہ اس وقت "چونکا" تھا جب وہ ایک معمولی سی سیکرٹری کی جاب کے لئے انٹرویو دینے کے لئے آ گئی۔ اب تو کوئی راز چھپا نہیں رہا تھا۔ اسے مونس کی تمام تر باتوں میں سچائی نظر آنے لگی تھی۔ زارون اس کی کوالیفیکیشن دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا کیونکہ اسے یاد آ چکا تھا کہ اس نے لندن یونیورسٹی میں شہرے حسنین کو ہی دیکھا تھا۔ اس کے آئی ڈی کارڈ پر موجودہ ایڈریس "صباح" کا تھا۔ اس نے اپنے ذرائع استعمال کر کے شہرے کے بارے میں تمام تر معلومات اکٹھی کر لی تھیں۔ وہ حسنین احمد کی بیٹی تھی۔ اس کے باپ کی بہت بڑی فوڈ فیکٹری تھی۔ بہت سے ممالک کو بند ڈبوں میں موجود خشک خوراک اسی فیکٹری سے ایکسپورٹ کی جاتی تھی۔ شہرے کے بارے میں سب کچھ جاننے سے پہلے ہی زارون اسفند کو اس سے پہلی نظر کی محبت ہو گئی تھی۔ پی سی ہال میں وہ ان اُٹھتی گرتی پلکوں والی آنکھوں کا دیوانہ ہو گیا۔ اس نے خود سے محبت کا اعتراف کرنے میں دیر نہیں

کی تھی مگر اس دیوانی لڑکی کو بتانے میں یقیناً دیر کر رہا تھا۔

مونس اسے شہرے کی گھر تک رسائی کے متعلق بتا چکا تھا۔ ان دونوں کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی شہرے چلی گئی تھی اور وہ فرجند انکل کو آنٹی پر اور عدن پر گرجتا، برستا سن کر ٹھٹک گئے۔

"جاؤ، زارون! مونس! اسے ڈھونڈ کر لاؤ۔ میری باسمہ کی بیٹی کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ آج اسفند بھیا زندہ ہوتے تو کسی کی جرأت تھی کوئی شہرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھتا۔"

زارون نے فرجند انکل کی بھرّائی آواز سنی تھی اور پھر انہی قدموں پر پلٹ گیا۔

"شہری! یہ دسمبر کی بارش ہے۔ مت بھیگو، بیمار پڑ جاؤ گی۔ اور میرے پہلے سے سڑ ہوئے ہنی مون کا بالکل بیڑہ غرق ہو جائے گا۔"

زارون کی دہائیاں جاری و ساری تھیں جبھی تین کمروں والے خوب صورت کاٹیج کا اندرونی دروازہ کھول کر مونس جلتا کلستا باہر نکلا۔

"خبیث انسان! اپنے ہنی مون کی اتنی فکر ہے، دوسروں کی نیند اور رومانس بھرے ماحول کا چلا چلا کر بیڑہ غرق کر دیتے ہو۔"

"چل، شکل گم کر اپنی۔ خوامخواہ موڈ خراب مت کرو۔ میں پہلے ہی "بھرا" ہوا بیٹھا ہوں۔ کہیں غصے سے پھٹ نہ جاؤں۔"

مونس اس کے جلے کٹے انداز کو ملاحظہ کر کے جی بھر کر ہنس رہا تھا۔ کیونکہ وہ ہنی مون منانے کی غرض سے مری آنا ہی نہیں چاہتا تھا مگر شہری کی ضد کی وجہ سے اسے ہار ماننا پڑی تھی۔ اور یہ کیسے ممکن تھا کہ مونس اسے اکیلے ہنی مون منانے دیتا۔ اس نے بھی ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنی ماما کو پنڈی فون کر کے عانیہ کے گھر بھیجنے کے بعد وہ چین کی بانسری بجا رہا تھا۔ جب زارون دندناتا ہوا اندر آیا۔

"میری شادی کی خوشی برداشت نہیں ہو سکی۔ جھٹ سے سہرا سجانے کے لئے تیار ہو گئے ہو۔ پہلے کیا گہری نیند سو رہے تھے۔"

"زندگی بھر تمام کام اکٹھے ہی کئے ہیں۔ سوچا ہے یہ شادی والا کام بھی ساتھ ہی نمٹا لیں۔ آخر تجھے دولہا بنا دیکھ کر میرا سیروں کے حساب سے خون جلنا تھا۔ اسی لئے میں نے اپنا بھی "بندوبست" ساتھ ہی کر لیا ہے۔ اب ممی کے فون کا انتظار ہے۔ نہ جانے وہ کون سا صور پھونکتی ہیں کانوں میں۔" وہ آنکھ دبا کر شرارت سے بولا۔

"وہ میری چاچی ہیں۔ سب کی خوشیوں کا احساس ہے انہیں۔ تمہاری عانیہ میڈم کو "اوکے" کر آئی ہیں۔"

"کیا سچ؟" مونس نے بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی شادیاں ایک دن کے وقفے سے ہوئی تھیں مگر ولیمے کا فنکشن کمبائنڈ تھا۔ فریدون انکل اور فرجند انکل نے شہرے کی طرف سے تمام تر انتظامات خود کئے تھے۔ آج سے چند دن پہلے ایسا کچھ ممکن ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ اور مونس دونوں ہی اس کے پیچھے ہاسٹل میں آئے تھے۔ ان کی منتوں، وضاحتوں اور تمام تر دلائل کا اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

"مجھے احساسات سے عاری لوگوں کے ساتھ نہیں رہنا۔ ان کی خاطر میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر چلی آئی تھی۔" وہ سخت طیش کے عالم میں اپنی چیزیں سوٹ کیس میں ٹھونستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"نہیں، تم تو صرف میرے لئے یہاں آئی ہو۔ میرے پاکستان میں رہنے کے لئے۔" زارون نے اس کے سامنے سے سوٹ کیس اٹھا کر بند کیا اور مونس سے بولا۔

"اسے گاڑی میں رکھ کر آؤ۔"

"میرا سوٹ کیس واپس کریں۔ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، میں ڈائن ہوں؟ میں عدن کے دل کو اجاڑوں گی۔ قطعاً نہیں۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں، مجھے یہاں نہیں رہنا۔" وہ مسلسل روتے ہوئے بے ربط بول رہی تھی۔ زارون اسے وضاحتیں، اپنی محبت کا یقین دلاتے دلاتے تھک چکا تھا۔ مگر اس کی نہ، ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

"ایک مرتبہ میری آنکھوں میں دیکھ کر کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

زارون نے اسے شانوں سے تھام کر جھٹکا دیا تھا۔ وہ سسکتے ہوئے دیوار سے جا لگی تھی اور آنکھیں موندے دل پر بھاری پتھر کی سل رکھ کر چلائی۔

"نہیں ہے مجھے کسی سے بھی محبت وحبت۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تمہیں زارون سے محبت ہے۔ اسی لئے تو چمکتی دمکتی دنیا کو چھوڑ کر یہاں چلی آئی ہو۔" یہ آواز عدن کی تھی۔ ان سب نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا تھا۔ عدن اب ان کے قریب آ چکی تھی۔ پھر اس نے شہرے کے آنسو پونچھ ڈالے تھے اور آہستگی سے کہنے لگی۔

"مجھے معاف کر دو شہری! اور پلیز جانے کا فیصلہ بدل دو۔ زارون صرف تمہارا ہے۔ کسی کے دل پر زبردستی حکومت نہیں کی جاسکتی۔"

اسی پل دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا۔ اور پھر فرجند انکل اور آنٹی بھی چلی آئی تھیں۔ ان کے پیچھے فریدون اور فرہاد چاچو بھی تھے۔ فائزہ اور ماہا بھی اپنے بچوں سمیت اسے لینے کے لئے آئی تھیں۔

"اب تو مان جاؤ شہری! پوری بارات تو آ چکی ہے۔" عدن نے بے ساختہ کہا تو وہ فرجند ماموں کے سینے میں منہ چھپا کر طمانیت سے مسکرا دی تھی۔ آنٹی نے بھی اس سے اوپری دل سے شاید شوہر کے خوف سے معافی مانگ لی تھی۔ اور شہرے تو انہیں ہاسٹل کے اس روم میں دیکھ کر ہی تمام بدگمانی بھلا کر انہیں معاف کر چکی تھی۔ اس نے یہ خوشخبری سب سے پہلے مریم اور پھر ایما کو سنائی تھی۔ ایما نے دل سے اس کی خوشیوں کے صدا سلامت رہنے کی دعا کی۔ ایما اپنے بیٹے ایمان کے ہمراہ "ہوم لینڈ" میں ہی قیام پذیر تھی۔ اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب وہ ہوم لینڈ کے نچلے پورشن میں معذور بچوں کی نرسری بنانے کے بعد ان کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہو چکی تھی۔ ایما نے ہی اسے عاجف انکل کے بارے میں بتایا تھا کہ ان کا اکلوتا داماد سب کچھ ہتھیانے کے بعد رحمہ کو لے کر یورپ چلا گیا ہے۔ انکل اور آنٹی اب تنہا ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے جھگڑنے میں دن بتاتے ہیں۔

"میں نے تو اسے سات پہاڑیوں کے شہر "روم" کو دکھانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ مگر اسے نتھیا گلی، گھوڑا گلی اور ایوبیہ کو دیکھنے کا کریز تھا۔ چیئر لفٹ پر بیٹھنے کے شوق میں اس نے ورلڈ ٹور کا چانس مس کر دیا ہے۔" زارون نے بھنا کر کہا تھا۔ اس کا ارادہ کسی یورپین ملک میں ہنی مون منانے کا تھا مگر شہری اسے مری کھینچ لائی تھی۔ جبکہ مری تو وہ ایک ہزار ایک مرتبہ گھوم چکے تھے۔ مگر شہرے کو پاکستان کی سیر کا جنون تھا، سو زارون کی تو مجبوری تھی مگر مونس نے بھی اپنا ارادہ بدل کر ان کے ساتھ مری آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی پل شال لپیٹے، ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی عانیہ بھی برآمدے میں آ کھڑی ہوئی۔ شہرے کو بارش میں بھیگتے دیکھ کر وہ چلا اٹھی۔

"شہری کی بچی! بیمار پڑ جاؤ گی........ بس کرو، بہت کر لیا شوق پورا۔ میں تمہارے لئے چائے بغیر چینی کے اور دو انڈے بوائل کر کے لاتی ہوں۔ دیکھو تو، ٹھنڈ ہڈیوں میں گھس رہی ہے۔"

"رہنے دو عانیہ بی بی! اسے بارش میں بھیگ کر سردی سے اکڑنے کا شوق ہے۔ دیکھنا، ابھی کچھ دیر بعد فالج کا اٹیک ہو جائے گا اس پر۔" زارون کی دھمکی نے اچھا خاصا اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ اسی لئے وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اندر بھاگی تھی اور پھر کچھ دیر بعد وہ صرف کھڑکی کھولے دسمبر کی بارش کا نظارہ کر رہی تھی۔ خوشیاں دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔ سو اس نے بہت سرشاری کے عالم میں دریچہ کھول دیا تھا۔ باہر سے مونس اور زارون کی ہنسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مونس، زارون کو انس کا ایس ایم ایس پڑھ کر سنا رہا تھا۔

"پیارے بھائیو! تم دونوں کپلو کو ہنی مون مبارک ہو۔ واپسی پر میرے گھر ضرور آنا اور میرے لئے ایک سویٹر، ایک جیکٹ اور ردا کے لئے کچھ گرم کپڑے اور دو تین شالیں ضرور لے کر آنا۔ میں تم لوگوں کا شدت سے انتظار کر رہا ہوں۔"

"بہت ہی کمینی چیز ہے یہ انس۔" زارون کا قہقہہ سنائی دے رہا تھا۔ شہرے بھی مسکراتے ہوئے سکون سے آنکھیں موند گئی تھی۔

(تمت بالخیر)